خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جنوری 2020
www.pklibrary.com

کہنی سُنی — مدیر — 10
کرن کرن روشنی — ادارہ — 11
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 243

یادِ انشاء جی

کیسا روپا چاند — نسیمہ بنت سراج — 16

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 250

انٹرویو

یہ سال بھی اُداس رہا — ادارہ — 18
عنیزہ سید سے ملاقات — شاہین رشید — 27

ناول

تتلی جیسا پیار — راحت جبیں — 34
رنگ ریز میرے — عفت سحر — 138
حالم — نمرہ احمد — 212

مکمل ناول

شہ رگ — ثمینہ فرحان — 94
چلی پیا کی حویلی — سحرش خان بھٹو — 158

ناولٹ

بندھن — سمیرا گل — 64

افسانے

زرخیز مٹی — قرۃ العین خرم ہاشمی — 55
اُمِ ہانی — صبا شوکت — 89
سالِ نو کا تحفہ — حمیرا شفیع — 60
بھولی ہوئی — عندلیب شاہانہ — 135

نظمیں غزلیں

غزل — سعود عثمانی — 238
نظم — فاطمہ نجیب — 238

راحت جبیں

تتلی جیسا پیار

اس گھر میں دو بھائی زبیر اور سرمد اپنی بیویوں ثمینہ اور ساجدہ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ زبیر اور ساجدہ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا دانیال تھا۔ بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی جبکہ سرمد اور ثمینہ کی دو بیٹیاں تھیں روشانے اور زوباریہ۔ روشانے کی منگنی دانیال سے ہو چکی تھی۔

زوباریہ پورے گھر کی لاڈلی میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ پڑوس میں رہنے والا صائم، فائقہ اور ابراہیم کی اکلوتی اولاد تھا۔ زیبی اور صائم میں بچپن سے بہت دوستی تھی، دونوں لڑتے جھگڑتے بھی تھے۔ فائقہ کو زیبی کا یوں چھت پھلانگ کر اپنے گھر آنا اور صائم سے بے تکلف ہونا برا لگتا تھا، ان کے خیال میں وہ اب بڑے ہو گئے تھے، اس لیے زیبی کو خاص طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔

صائم کالج کے دوستوں کی پارٹی میں زیبی کو لے جاتا ہے۔ جہاں ایک دوست زیبی سے فری ہوتا ہے پھر اس کا نمبر لے کر زیبی سے بات کرتا ہے۔ زیبی صائم کی غلط فہمی میں شہیر سے بات کرتی ہے اور تحفے وصول کرتی ہے، پتا چلنے پر پریشان ہوتی ہے۔ صائم کا شہیر سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔

زوباریہ کے کہنے پر صائم اپنا گٹار توڑ دیتا ہے۔ صائم اس سے معافی مانگتا ہے۔ زیبی اس کے لیے اپنی پاکٹ منی سے گٹار خریدتی ہے۔ اور صائم کی بالکونی میں کارڈ کے ساتھ رکھ دیتی ہے۔ صائم جان لیتا ہے کہ یہ کس کا تحفہ ہے۔

صائم اور زیبی چھت پر بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ فائقہ وہاں آجاتی ہیں اور زیبی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے گھر لے جاتی ہیں اور اس کے گھر والوں خاص طور پر ثمینہ کو کھری کھری سناتی ہیں۔ دانیال بھی وہاں آجاتا ہے۔ فائقہ دانیال کو کہتی ہیں کہ اپنے گھر کی عزت سنبھالو۔ دانیال کہتا ہے کہ رائی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ ثمینہ زوباریہ کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہیں۔

گھر پہنچنے پر صائم فائقہ سے بحث کرتا ہے۔ ابراہیم بھی فائقہ پر ناراض ہوتے ہیں۔ صائم زوباریہ کے گھر معافی مانگنے جاتا ہے مگر ثمینہ اسے سخت سست سنا کر دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

روشانے کی شادی ہو رہی ہے زیبی اداس ہے کہ اس نے تو تمام پروگرام صائم کے ساتھ بنائے تھے۔

سب کے سونے کے بعد زیبی کھانا پلیٹ میں لے کر چپکے سے بالکونی میں جاتی ہے صائم وہاں موجود ہوتا ہے۔ فائقہ بھی ان کے پیچھے آتی ہیں اور میسج کر کے دانیال کو اوپر بلاتی ہیں، دانیال دونوں کو آ کر تھپڑ مارتا ہے اور زیبی کو لا کر روشانے کے کمرے میں اس کے سامنے پھینکتا ہے۔

صائم گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے دوست مراد کے گھر میں کمبائن اسٹڈی کے بہانے رہتا ہے۔ اس کے والد کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ مراد کا گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک فون کال آتی ہے کہ صائم کو گولی لگی ہے۔ وہ ہاسپٹل جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے گولی اس کے بازو کو چھو کر گزری ہے، وہ اسے گھر لے آتے ہیں۔ زیبی کے لیے صائم کا رشتہ آتا ہے۔ وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ فائقہ کے اصرار پر زیبی کو بلایا جاتا ہے۔ وہ انکار کر دیتی ہے۔ صائم دنگ رہ جاتا ہے۔

صائم فائقہ سے معافی مانگ کر کہتا ہے کہ وہ اب اپنی پڑھائی پر توجہ دے گا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ دونوں پھر ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ تب فائقہ ان سے کہتی ہیں کہ وہ دونوں دو تین سال ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ پھر وہ ان کا ساتھ دیں گی۔

تیسری قسط

وہ کب سے دیوان پر بیٹھی جالی دار بند دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ بلیک ٹائٹس پر گھٹنوں تک بلیک اور ریڈ ڈاٹس والی فراک پہنے اس بچی کی طرح، جس کا پسندیدہ کھلونا اس سے چھن گیا ہو......اور وہ سب سے روٹھ کر یہاں آ بیٹھی ہو۔

سنہری دھوپ نے شرارتی بچی کی طرح جالی کے سوراخوں سے جھانکا اور مسکرا کر فرش پر آ بیٹھی......

باہر کی طرف جاتی روشانے ٹھٹکی۔ غور سے زیبی کی محویت کو دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

خیال کی الجھی ڈوریں سلجھاتے سلجھاتے ہو سکتا ہے۔ کوئی سرا زیبی کے ہاتھ لگ ہی جائے......

زیبی نے فرش پر بکھرے دھوپ کے سنہری سکوں کو دیکھا تو نجانے کیا کچھ یاد آ گیا۔ وہ دونوں ہمیشہ اسی دروازے کے پاس کھیلا کرتے۔

اپنی گڑیا سینے سے لگائے، وہ ہمیشہ صائم کا انتظار کرتی۔ جو ماں سے چوری چھپے ٹیبلٹ اٹھا لاتا۔ پھر گڑیا لاوارثوں کی طرح جالی سے ٹیک لگائے انہیں ٹُکر ٹُکر دیکھے جاتی۔ وہ فرش پر اوندھے لیٹے، ٹانگیں جھلاتے، ہتھیلیوں کے پیالے میں معصوم چہرے سجائے سامنے رکھے ٹیب پر بیسیوں نظمیں سنتے جاتے۔

وہ خاموشی سے سنہری دھوپ سے کھیلتی بچپن کو دیکھ رہی تھی۔ دھیان کی تتلی دماغ کی بند مٹھی میں پر پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس سے قبل کہ دم توڑ دیتی.... زیبی نے ہلکی سی سانس بھر کے مٹھی کھول دی۔ دھیان ہٹانے یا بھٹکانے سے حقیقت بدل تھوڑی جاتی۔

جدائی عارضی سہی مگر جان لیوا تھی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں......'' صائم نے بے حد حیرت سے ماں سے سوال کیا تھا اور زیبی کا دل چاہا تھا، وہ صائم کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے بھاگ جائے، اس سے ملے بغیر، اسے دیکھے بغیر وہ سانس کیسے لے گی۔ اس کی سانس ابھی سے اٹکنے لگی تھی۔

فائقہ نے اس کی کیفیت کو دل پر محسوس کیا مگر خود کو سنبھالے رکھا۔

''یہ وقتی جدائی تم دونوں کو ہمیشہ کے لیے ایک کر دے گی۔ ماں کی بات پر اعتبار کرو۔''

زیبی کو اعتبار نہیں تھا کیونکہ وہ اس کی ماں نہیں تھیں۔ صائم متذبذب تھا۔ اسے ماں پر اعتبار تھا مگر خود پر نہیں۔ وہ زیبی سے ملے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔

''اپنے بڑوں کو ضد نہیں دلاتے۔ صبر و ہمت سے آنے والے دن کا انتظار کر لو۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں، تم دونوں کا ساتھ دوں گی۔'' وہ زیبی سے مخاطب تھیں۔

زیبی نے صائم کو دیکھا۔ صائم نے تسلی آمیز انداز میں اپنا ہاتھ زیبی کے ہاتھ پر رکھا۔

''ٹھیک ہے مما! اگر آپ ہمارا ساتھ دیں گی تو ہم تیار ہیں۔''

زیبی نے ہاتھ سمیٹ لیا۔ وہ اس فیصلے سے بالکل خوش نہیں تھی۔

فائقہ نے تھوڑا مطمئن ہو کر گہری سانس بھری۔

''شکریہ بچو، یہ تھوڑا سا سمجھوتا تمہاری آنے والی زندگی کو آسان بنا دے گا۔ مجھے یقین ہے، تم دونوں مجھے دھوکا نہیں دو گے۔'' اس نے دھوپ کے بنتے دائروں کو دیکھتے اس ساری گفتگو کو پھر سے دہرایا۔

''آئے ہائے زیبی! اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔'' وہ تائی کی آواز پر چونکی۔ ایک ہی زاویے پر بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ اس نے سیدھے ہو کر پاؤں زمین پر رکھے۔

''طبیعت ٹھیک ہے بچے؟'' انہوں نے تشویش سے زیبی کا ماتھا چھوا۔

''ٹھیک ہے تائی امی! بس یوں ہی بیٹھ گئی تھی۔'' وہ کھڑی ہوئی بالوں کو سمیٹ کر پونی بنائی۔ بازو میں پہنا بینڈ بالوں میں چڑھایا اور دروازے سے باہر دیکھا۔ اس کی گڑیا کی طرح جالی کے دروازے سے لگی، سنہری دھوپ اب زرد ہو چلی تھی۔

☆☆☆

ساری بات بے حد خاموشی سے سننے کے بعد ابراہیم صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اور صائم کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں آیا۔''

فائقہ نے تکیہ کمر کے پیچھے رکھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی۔ وہ آج بہت تھک گئی تھیں۔ آفس، گھر کے کام اور صائم کا قصہ......

''اسی کے متوقع ردعمل کے سامنے بند باندھا ہے۔''

ابراہیم صاحب کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اور فائقہ بیگم آپ کو کیا لگتا ہے، انٹرنیٹ اور موبائل کے اس دور میں وہ دونوں تمہاری بات پر عمل کریں گے۔''

"تو آپ کے پاس کوئی اور حل ہے۔" فائقہ ان کی مسکراہٹ پر چڑ گئیں۔
"صائم گھر سے گھر چھوڑ دیتا، تو ہم کیا کرتے۔ اب کم از کم اس کے سامنے رکاوٹ تو ہے۔"
"کیسی رکاوٹ؟" وہ چونکے۔
"انتظار کی۔ اس دوران وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دے گا، کیریر بنائے گا...... بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔"
"ہوں......" وہ کسی سوچ میں ڈوبے۔ "اور اگر اس سب کے بعد بھی وہ زوباریہ پر ہی اٹکا رہا تو......"
"تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"
"بشرطیکہ زوباریہ کے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو۔"
"جو بھی ہے...... اب بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔ میں بہت تھک گئی ہوں ابراہیم! نیند آ رہی ہے۔" وہ کچھ بے زار ہو کر لیٹ گئیں۔
"ہاں سو جائیں...... ہماری نیندیں تو اس نئی نسل نے اڑا دی ہیں جنہیں اور کچھ ہو نہ ہو، محبت پیدا ہوتے ہی ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے اب اس کی بھی ویکسینیشن کروانا پڑے گی۔"
نہ چاہتے ہوئے بھی فائقہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆☆☆

زوباریہ، صائم سے روٹھ گئی تھی۔ بھلا کیا ضرورت تھی، ماں سے وعدہ کرنے کی۔ وہ ملیں گے نہیں، ایک دوسرے کو دیکھیں گے نہیں...... یہ ممکن ہے؟ وہ بچپن کی طرح اب بھی لڑتے ہوئے ناک چڑھا لیتی تھی...... اور یہ نک چڑھی موٹی گڑیا اسے بہت اچھی لگتی تھی جب وہ بالکونی کی ریلنگ سے لٹک کر اپنی آنکھیں پھیلائے اسے اپنے اسکول کی باتیں بتاتی تو وہ اس لمحے بھول جاتا تھا کہ اس کے دوست بیٹ پکڑے اس کے منتظر ہیں۔
فائقہ یوں بھی اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کم ہی کھیلنے دیتیں۔ انہیں اطمینان رہتا کہ صائم زوباریہ کے ساتھ گھر کے اندر ہی کھیلتا ہے۔ دونوں جھگڑا نہیں کرتے تھے، ایک دوسرے کا سر نہیں پھاڑتے تھے۔ انہیں لگتا جو اپنی زندگی میں بہن بھائی کی کمی محسوس کرتا ہے وہ کمی زوباریہ پوری کر رہی ہے۔
کبھی کبھار دانیال صائم کو ڈانٹ کر بھگا دیتا اور زوباریہ کو اٹھا کر لے جاتا۔ زوباریہ تو آئس کریم کے لالچ میں بہل جاتی...... اور وہ کتنی دیر دعائیں مانگتا۔ کاش دانیال بھائی اسکول سے واپسی کا رستہ بھول جائیں یا کوئی فقیر انہیں اٹھا کر لے جائے...... اس کا بس نہ چلتا کہ خود کسی فقیر کو دانیال کا پتا دے دے۔
تب ہی ایک سگنل پر اس نے پوری سنجیدگی سے ایک فقیر سے پوچھ بھی لیا تھا۔

"کیا آپ بڑے بچے بھی اغوا کرتے ہیں؟"
فائقہ نے حیران ہو کر گاڑی آگے بڑھائی تھی، مگر جب اس نے یہی بات زیبا سے کی تو وہ ناراض ہو گئی۔ اسے تو دانیال بھائی ہی اتنے ہی پیارے لگتے تھے۔ جتنا کہ صائم......
صائم کا ننھا سا دل بجھ گیا۔
اگر زوباریہ اس کے لیے اتنی اسپیشل تھی تو اسے بھی زوباریہ کے لیے سب سے اسپیشل ہونا چاہیے تھا مگر ا! نہیں تھا۔ اسے زوباریہ پر، اس موٹی گڑیا پر یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ زیبی کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔
"جانتی ہو، میں اس دن گم ہو گیا تھا۔" اپنے کمرے کے نیم گرم آسودگی بھرے ماحول میں بیٹھا وہ دھیمے مدھم لہجے میں زوباریہ کو بتا رہا تھا۔ باہر دسمبر کی دبیز دھند کی چادر سرد رات کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔
"کیا مطلب؟ واقعی گم ہو گئے تھے۔" ہاتھوں پر دستانے، سفید سویٹر اور سرخ اونی ٹوپی میں کھلے بالوں کے

ساتھ کمبل میں گھسی سردی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ کمرے میں ہیٹر نہیں تھا، اس لیے سکون کا احساس صرف صائم کی باتوں سے ہو رہا تھا۔

''ہاں...... میں سارا دن کالونی کے درختوں پر تمہارے لیے چڑیا کے بچے ڈھونڈتا رہا تھا۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔ جیسے ذرا سی اونچی آواز سے وہ لمحہ چونک جائے گا جس کی گرفت میں وہ اس وقت خود کو محسوس کر رہا تھا۔

''چڑیا کے بچے۔''

''تم ہی نے کہا تھا چڑیا کے بچے دیکھنے ہیں۔''

''اچھا، تو ملے؟'' وہ ہنسی۔

''نہیں۔ البتہ میں نے گر کر بازو ضرور تڑوا لیا تھا۔''

''ہاؤ سویٹ۔''

''بازو ٹوٹنا سویٹ ہوتا ہے؟'' صائم برا مان گیا۔

''نہیں۔ کسی کے لیے درختوں پر چڑیا کے بچے ڈھونڈنا سویٹ ہے۔'' وہ کھلکھلائی۔ ''لیکن مجھے یہ تو پتا چل گیا کہ تم بچپن سے ہی رومینٹک ہو اور مجھے موم کی گڑیا کہتے تھے۔''

صائم خاموش رہا۔

''کیا ہوا؟ تم نے کچھ کہا نہیں؟'' زیبی بے چین ہو گئی۔

''کچھ نہیں۔ امی کی باتیں ذہن میں آنے لگی تھیں۔''

''تمہیں ان سے وعدہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے نہیں لگتا ہم یہ وعدہ نبھا سکیں گے...... ہے نا۔'' وہ جیسے صائم کو یہ وعدہ توڑنے پر اکسا رہی تھی۔ صائم ایک لمحے کو چپ سا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟''

''یہ وقتی جدائی ہے زیبی!'' وہ یہ وعدہ نبھانا چاہتا تھا۔ زیبی کے اندر ناگواری سی گزری جو اس کے لیے بھری دوپہر میں چڑیا کے بچے ڈھونڈنے کے لیے بازو تڑوا سکتا تھا۔

کالج میں اشعر کا سر پھاڑ سکتا تھا۔

اپنا گھر، اپنے ماں باپ چھوڑ سکتا تھا۔ وہ ماں سے کیا ایک اسٹوپڈ سا وعدہ نہیں توڑ سکتا تھا۔ زیبی کے اندر ہلکی سی خود غرضی جنم لینے لگی تھی۔

''پریشان مت ہو زیبی! کبھی کوئی محبت کا رستہ روک سکا ہے، یہ تو ہوا کی طرح ہے۔ جہاں سے دل چاہا راستہ بنا لیا۔'' صائم کی تسلی پر وہ پھر سے مغرور ہو گئی مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کا سب سے پہلا رستہ ہی مسدود ہو گیا تھا۔

فائقہ نے صائم کا سارا سامان نیچے والے کمرے میں شفٹ کر دیا تھا۔ صائم کا احتجاج بھی کام نہ آیا۔ وہ ان کی بالکونی کی ملاقاتوں کی گواہ تھی...... کیسے مان جاتیں۔

''یعنی ہم بات بھی نہ کریں۔'' وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

''صائم!'' انہوں نے پیار سے بیٹے کے ماتھے پر بکھرے بال سمیٹے۔ ''یہ تمہارا پہلا امتحان ہے اور تم اسی میں فیل ہو رہے ہو۔ فون ہے اس پر بات کر لو۔ مگر کوئی ملاقات نہیں ہو گی۔ خواہ مخواہ زیبی کے گھر والوں کو غصہ دلانے اور اپنے خلاف کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ بہت سنگ دل ہیں۔''

''یہی سمجھ لو۔ جو کر رہی ہوں، تمہارے بھلے کے لیے کر رہی ہوں۔'' انہوں نے تسلی دی۔

☆☆☆

لان میں میٹرس بچھائے خواتین ساگ کا گٹھڑ رکھے — کاٹنے میں مصروف تھیں (زیبی اب روشانے کو بھی خواتین کی فہرست میں شامل کرتی تھی) تینوں کی ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی رواں تھی۔ ذرا فاصلے پر زیبی کرسی پر اس رخ پر بیٹھی تھی، جہاں صائم کے گھر کا ٹیرس نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے صائم کو کئی میسج کیے تھے مگر وہ غالباً گھر پر نہیں تھا۔

''آج کتنے دن ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔'' زوبار یہ نے انگلیوں پر دن گنے اور جھنجلا گئی۔ کچھ دنوں سے وہ کال بھی کم ہی کرتا تھا۔

''یہ تو وہی بات ہو گئی، آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل۔'' وہ مزید چڑ گئی۔ اسے پورا یقین تھا وہ دونوں فائقہ کی چال کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک اکتائی ہوئی نظر ٹیرس پر ڈال کر وہ کیاری کو دیکھنے لگی۔ ساری کیاریوں سے زرد خشک پتے جمع کر لیے گئے تھے، گویا کیاریاں نئی پنیری لگنے کو تیار تھیں۔

''لڑکی! تم بھی کچھ ہاتھ ہلا لو۔ اگر تمہارے سسرال والے بھی ساگ کھانے کے شوقین ہوئے تو کیا کرو گی۔'' وہ ماں کی آواز پر چونکی۔

''آپ بنا کر بھیج دیا کرنا، میں فریز کرلوں گی۔'' اس نے آسان حل دیا۔ برآمدے میں شرٹ کے بٹن بند کرتا دانیال آیا۔ وہ روشانے کو پکار رہا تھا۔

''جاؤ بھئی، اس لڑکے کا بھی تمہارے بغیر گزارا نہیں۔ اب نجانے کیا چاہیے ہو۔''

ساجدہ نے ہنستے ہوئے کہا تو روشانے شرما کر اٹھ گئی۔ زیبی کی نظروں نے برآمدے تک روشانے کا تعاقب کیا۔ روشانے نے پاس جا کر ناراضی سے کچھ کہا۔ جواباً دانیال اس کا ہاتھ کھینچ کر لے گیا تھا۔

''کیا ہے تائی امی!'' زیبی نروٹھے پن سے بولی۔ ''آپ نے تو ہماری لڑکی پر قبضہ ہی کر لیا ہے۔''

ثمینہ نے ساجدہ سے چوری اسے آنکھیں نکالیں۔

''کیوں امی! لڑکیاں اپنے میکے رہنے نہیں آتیں۔ اب ایک ہی گھر میں رہنے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ سارا حق دانیال بھائی کا ہی ہو گیا۔''

ثمینہ کی آنکھیں، اشارے، گھوریاں کچھ کام نہ آیا۔ اس نے شکایتوں کی پٹاری کھول لی۔ ساجدہ نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ ثمینہ کا آخری اشارہ اپنے جوتے کی طرف گیا تو زیبی کی زبان رکی۔

''بات تو سچ ہے۔'' ذرا غور و خوض کے بعد ساجدہ سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

''اس بچی کی زندگی تو ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہے۔''

''یہی تو......'' زیبی جوش میں سیدھی ہوئی۔

''چلو ٹھیک ہے، آج سے روشانے ایک ہفتے کے لیے میکے جا رہی ہے۔''

''اُفوہ، یہ تو پاگل ہے اور آپ......'' ثمینہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''پاگل نہیں۔ بہت سیانی ہے۔ اس نے جو کہا بالکل ٹھیک کہا۔''

زیبی نے گردن اکڑائی اور روشانے نے اس بات کو اتنی سنجیدگی سے لیا کہ خوشی خوشی بیگ پیک کرنا شروع کر دیا۔ دانیال ہکا بکا تھا۔

''یہ کیا مذاق ہے مسز!''

''مذاق نہیں، مسز میکے جا رہی ہے۔'' وہ مسکائی۔

''کتنے دنوں کے لیے؟''

''اگلی اتوار......'' اس نے بیگ کی زپ بند کی۔ زیبی کی شرط تھی وہ پورا ہفتہ اپنے کمرے کی شکل نہیں دیکھے گی۔

''اور میرے کام کون کرے گا؟'' دانیال حواس باختہ ہوا۔

''گزارا کیجیے صاحب!'' وہ سیدھی ہوئی۔ ''گھر والی ہوں، کام والی نہیں۔''

''اور وہ محبت؟''

''کوئی بات نہیں بیٹا! کچھ دن ماں کی ممتا پر گزارا کر لینا۔''

دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ بے خیالی میں ساجدہ بھی اندر آ گئیں۔

روشانے سرخ ہوتی وہاں سے بھاگ لی۔

دانیال نے خواہ مخواہ بیگ اٹھا لیا۔

''امی! میں چھوڑ آؤں۔''

''ہاں چھوڑ آؤ۔ اب ہر کام کے لیے اسے آواز نہ دینا۔ بچی کو کچھ دن سکون سے رہنے دو۔'' انہوں نے مسکراہٹ دباتے لتاڑا۔ دانیال شرافت سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

زوبار یہ دودھ پتی کے دو بڑے مگ کے ساتھ ڈرائی فروٹس لے کر کمرے میں آئی تو روشانے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بہت ریلیکس انداز میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔

''آج خوب ساری باتیں کریں گے۔''

وہ ٹرے درمیان میں رکھ کر خود بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

''تم بھی بالکل پاگل ہو۔''

''یہی سمجھ لو۔ سارا دن کالج میں گزر جاتا ہے اور تمہاری شام دانیال بھائی کے ساتھ۔ اس کے بعد ساس کے ساتھ کچن۔ تمہارے پاس میرے لیے وقت تھا۔'' وہ لڑنے لگی۔

''اچھا بابا! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' روشانے نے اپنا مگ اٹھایا۔ تب ہی پاس پڑا زیبی کا موبائل بجنے لگا۔ صائم کا نام دیکھ کر روشانے نے چونک کر زیبی کو دیکھا۔

زیبی نے کال کاٹ دی۔ پچھلے کچھ دنوں میں صائم نے اسے اگنور کیا تھا، اب اس کی باری تھی۔

''تمہاری صائم سے اب بھی بات ہوتی ہے۔''

''ہاں......'' زیبی نے اطمینان سے جواب دیا۔

روشانے کو اس کے اطمینان پر حیرت ہوئی۔ ''اور ملاقات؟''

''نہیں، اس پر تو پابندی ہے نہ۔ فائقہ آنٹی نے اس کا کمرا بھی چینج کر دیا ہے۔''

''واقعی؟'' روشانے کو خوشی ہوئی۔

''ہاں، تم تو خوش ہی ہو گی لیکن جناب! ایک بات بہت اچھی ہوئی ہے۔ فائقہ آنٹی نے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔'' اس نے ڈھیرے ڈھیرے ساری بات بتا دی۔ ''اور ہم نے اچھے وقت کا انتظار شروع کر دیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، شکر ہے...... شکر ہے کہ تمہیں بھی کچھ سمجھ میں آیا۔ اب بہت احتیاط کرنا۔ کبھی اس کے گھر جانا، نہ کہیں باہر ملنے کی کوشش کرنا۔''

''ایسا ہی ہو گا...... لیکن کبھی کبھی سوچتی ہوں کہیں فائقہ آنٹی ہمارے ساتھ کوئی گیم تو نہیں کھیل رہیں۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے بہت سمجھ داری سے کام لیا ہے۔ ان شاء اللہ، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ ابو کا خواب پورا کرو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم سے نصیحتیں سننے کے لیے رات نہیں ٹھہرایا۔ خاموشی سے دودھ پی پیو، اتنی سردی ہو رہی ہے۔'' زیبی نے دونوں ہاتھوں میں مگ لے کر گرمائش محسوس کی۔

''ہاں، میں تو آج خوب سوؤں گی، ورنہ آدھی رات تک دانیال کی فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔'' روشانے ہنسی۔ لیکن آدھی رات تک زوباریہ کی باتیں ہی ختم نہیں ہوئی تھیں...... اور صبح دیر تک دونوں کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔

☆☆☆

روشانے کو زوباریہ کے ساتھ بازار جانا تھا۔ ثمینہ کا خیال تھا کہ میکے آئی بیٹی کو شاپنگ کروائی جائے۔ روشانے کا رستہ اچانک سامنے آ کر دانیال نے روکا تھا۔

''بیوی! کہاں بھاگی جا رہی ہو۔''

''اب آپ کو چھوڑ کر کہاں بھاگوں گی۔'' اس نے مسکراہٹ دبائی۔

''یہ میکے میکے کا کھیل کب ختم ہوگا۔''

''سنڈے کو۔'' زوباریہ نے بروقت انٹری ماری۔

''سارا تمہارا چلایا ہوا چکر ہے۔'' دانیال نے گھورا۔

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' زوباریہ نے گردن اکڑائی۔ ''چلیں، اب جلدی سے ہمیں ڈراپ کر دیں۔''

''سوری، میکے گئی بیوی کا ڈرائیور بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔'' اس نے رکھائی سے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''آپ صرف روشانے کے شوہر نہیں، میرے بھائی بھی ہیں۔''

''یعنی چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، کٹنا خربوزے کو ہی ہے۔'' دانیال بے بسی سے گویا ہوا۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔ اس دن دونوں نے خوب شاپنگ کی۔ اس نے صائم کے لیے ایک بہت خوب صورت گفٹ لیا تھا۔ سنہری کلر کا گٹار، بٹن دبانے سے سر بکھیرنے لگتا۔ نیو ایئر کا اس سے خوب صورت گفٹ کیا ہو سکتا تھا۔ روشانے جان گئی تھی تحفہ کس کے لیے ہے، مگر نظرانداز کر گئی۔ فائقہ نے جو رکاوٹ کھڑی کی تھی، وہی کافی تھی۔ رسی کو اتنا کھینچنا ضروری نہیں تھا کہ ٹوٹ جاتی۔

وہاں زیبی نے صائم کو دیکھا تو ٹھٹک کر رک گئی۔

وہ یقیناً اس کے لیے گفٹ خریدنے آیا تھا۔

وہ روشانے کو جیولری دیکھتا چھوڑ کر آگے ہوئی۔ کتنے دنوں سے اسے دیکھا نہیں تھا، روبرو بات نہیں کی تھی۔ جینز پر لیدر جیکٹ پہنے وہ ہاتھ میں ٹیڈی بیئر لیے مڑا۔ زوباریہ نے ہاتھ کھڑا کیا۔ مگر ہاتھ وہیں ساکت ہوا۔ صائم کی توجہ اس کی طرف نہیں، ساتھ کھڑی ردا پر تھی۔ جس نے اس کے ہاتھ سے ٹیڈی بیئر لے لیا تھا۔ پھر اس نے طوبیٰ، اشعر اور علی کو دیکھا۔ وہ سب ایک دوسرے کے لیے گفٹ لے رہے تھے۔ زیبی کا دل بجھ سا گیا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ آئی۔

☆☆☆

کبھی دیکھی ہے سرد دسمبر کی آخری رات کے اخیر پہر میں اترتی اوس......

جو پوری کائنات کے ذرے ذرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے......

میرا دل اس اوس میں بھیگا اکڑ گیا ہے......

کون ہے جو اپنے دہکتے لب اس پر رکھ دے......

وہ اس کے سامنے کھڑا اداسی سے کہہ رہا تھا۔ گھاس پر بیٹھی اس موی گڑیا نے اوس کا ذائقہ اپنے لبوں پر محسوس کیا اور ڈر گئی...... بدقت سر اٹھا کر تاریک آسمان سے گرتی اوس کو دیکھنا چاہا...... وہ اوس نہیں، برف تھی۔

موی گڑیا برف کے مجسمے میں ڈھلنے کو تھی۔

وہ اس پر جھکا۔

برف کے مجسمے کو لگا وہ اپنے حدت بھرے لب اس کی مانگ پر رکھے گا اور وہ پھر سے جی اٹھے گی۔ مگر اس نے بہت پیار سے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا اور اسی خاموشی سے پلٹ گیا۔

وہ اسے پکارنا چاہتی تھی، مگر آواز اس کے نیلے ہونٹوں پر جم گئی۔

وہ خوف زدہ نظروں سے دبیز دھند میں معدوم ہوتے وجود کو دیکھے گئی۔ آتش بازی کی آواز پر وہ چلا کر اٹھی۔ اس کا پورا وجود پسینے پسینے اور دھڑکن بے ترتیب تھی۔

دل سینے سے باہر آنے کو بے قرار۔ اس نے کمبل یوں خود سے الگ کیا کہ وہ زمین پر جا پڑا۔

''یہ کیسا خواب تھا۔'' پورا گلاس پانی کا چڑھا کر اس نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

وحشت زدہ ہو کر اس نے اپنا موبائل ڈھونڈا۔ روشا نے چار دن بعد اپنے سسرال جا چکی تھی۔ صائم جاگ رہا تھا اس نے فوراً کال ریسیو کی اور صائم کی آواز سنتے ہی اسے رونا آ گیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ روئی۔ صائم کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ساری دیواریں توڑ کر اس تک آ پہنچے۔

''تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔'' اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پاتے زیبی بدقت بولی۔

''میں نے تو کئی بار کال کی تھی مگر تم ہی......''

زیبی کو اچانک یاد آیا، ایٹی ٹیوڈ تو وہ دکھا رہی تھی۔

''تمہیں اتنے دنوں دیکھا نہیں تو میں گھبرا گئی تھی۔''

''پاگل ہو یار!''

''مجھے ڈر لگتا ہے صائم! یہ وقتی جدائی ہمیشہ کے لیے ٹھہر نہ جائے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ تمہارا وہم ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں سارے خدشے سمیٹ لیے تھے۔ زیبی نے عقب سے آتی آوازوں کو سنا۔

''تم کہاں ہو؟''

''علی کے گھر۔ نیو ایئر پارٹی ہے۔''

''ردا اور طوبیٰ بھی آئی ہیں؟''

''نہیں، صرف بوائز ہیں۔''

''اچھا۔'' زیبی کو احساس ہوا، وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے ساری پارٹی سے کٹ کر اس سے باتوں میں مگن تھا۔ ''انجوائے کرو، میں نے تمہیں بھی پریشان کر دیا۔''

''اب تو تم پریشان نہیں ہونا۔''

''نہیں۔ تمہارا نیو ایئر گفٹ بالکونی میں رکھ دوں گی۔ موقع ملا تو اٹھا لینا۔''

''نہ ملا تو نکال لوں گا مگر موقع گنواؤں گا نہیں۔'' صائم ہنسا تو زیبی نے ''ہیپی نیو ایئر'' کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ صائم کی باتوں نے اسے ریلیکس کر دیا تھا۔

لیکن اس رات ایک بات طے ہوگئی تھی، انہیں ایک دوسرے سے ملنا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ گویا فائقہ کے ساتھ وعدے کی پاس داری بس یہیں تک تھی۔

☆☆☆

لیکن یہ اتنا آسان کہاں تھا۔

ثمینہ کی بند آنکھیں کھل چکی تھیں۔ دس منٹ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل ہوتی تو پکارنے لگتیں۔ پڑھائی کی بہانے کمرے میں بند ہوتی تو دودھ، چائے یا پھل دینے کے بہانے چکر لگاتی رہتیں۔ پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری دانیال کے سپرد تھی۔

لیکن چور رستوں کا ادراک ہو جائے تو چور رستہ مل ہی جاتا ہے۔

دھوکا دینے کا سوچ لیا جائے، تو دھوکا دینے کی جرأت بھی مل جاتی ہے۔

سرمد صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ وقت سے پہلے گھر آ گئے۔ زوباریہ نے سوچا ماں کو اب کچھ دیر تک فرصت نہیں ملے گی۔

صائم نے اپنا پہلا گانا ریکارڈ کروایا تھا۔ یوٹیوب پر اپ لوڈ کرنے سے پہلے وہ یہ گانا زوباریہ کو سنانا چاہتا تھا۔ تین منٹ کا گانا، تین منٹ آنے اور جانے کے۔ پندرہ منٹ کافی تھے دیدار یار کے لیے اور اتنا وقت تو نہانے میں ہی لگ جاتا۔ اس نے جانے سے پہلے اپنے حساب سے کیلکولیٹ کیا تھا۔ بس ایک چیز شامل کرنا بھول گئی۔ ماں تو باپ کی تیمارداری میں مصروف تھی اور باپ...... باپ کا بیمار دل تو اپنی بیٹیوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

ابھی قدم گھر سے باہر نکلے ہی تھے کہ باپ نے پکار لیا۔

''ذرا سا بخار ہوتا ہے کہ شور مچا لیتے ہیں۔ اب بیٹیوں کو گھٹنے سے لگا کر بیٹھ جائیں۔''

ثمینہ چڑ گئی تھی۔ روشانے زوباریہ کو بلانے بھاگی اور آن واحد میں جان لیا وہ گھر پر نہیں ہے۔ بیرونی دروازہ احتیاط سے بند تھا کہ باہر سے آسانی سے کھل جائے۔ روشانے کے اندر طیش کی لہر اٹھی۔

''بس زبی اس سے زیادہ نہیں۔'' روشانے نے ہاتھ مارا۔ ذیلی گیٹ آٹومیٹک لاکڈ ہوگیا تھا۔ اب وہ صرف اندر سے کھل سکتا تھا۔

ثمینہ کچن میں چائے بنا رہی تھیں۔

روشانے لڑکھڑاتے قدموں سے کرسی پر بیٹھی اور پانی کا گلاس منہ کو لگا لیا۔

''کیا ہوا؟'' ثمینہ نے حیرت سے اس کی عرق آلود پیشانی کو دیکھا۔

''ہوا نہیں، ہونے والا ہے۔''

''کیا؟''

''ابو سے کہہ کر آئی ہوں، بیل ہوئی تو دروازہ خود کھولے گا۔''

''کون آنے والا ہے؟ اور وہ کیوں دروازہ کھولیں گے؟'' ثمینہ جھنجلائیں۔

''انہوں نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا۔'' روشانے بڑبڑائی۔

''میں نے کہا، ابو پردے ڈالنے کا وقت گزر گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گناہ کسی بڑے عذاب میں نہ ڈھل جائیں۔ اس لیے دروازہ خود ہی کھولے گا۔''

ثمینہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ گرا۔

خود انہوں نے سلیب کا سہارا لیا تھا۔

☆☆☆

''مائی گاڈ صائم! یہ اتنا خوب صورت سونگ ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ تم نے گایا ہے۔'' زیبی سن کر ہی نہال ہو گئی۔

''اُف کردی نا ٹیپیکل لڑکیوں والی تعریف۔'' صائم نے لیپ ٹاپ بند کیا۔

''کیا مطلب؟''

''اف زیبی، تمہاری کتنی اچھی تصویر آئی ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ تم ہو۔''

صائم نے نقل اتاری تو زیبی کو ہنسی آ گئی۔

''اچھا بابا، یہ اتنا اچھا سونگ ہے کہ لگتا ہے تم نے گایا ہے۔''

''یوں کہو نا......'' وہ کرسی سمیت اس کی طرف گھوما۔

''اب یہ کسی چینل کو دو گے...... وہ میز کے کنارے ٹک گئی۔

''چینل، کیا ہو گیا ہے۔ چینل والے ہم جیسوں کو کہاں پوچھتے ہیں۔''

''تو......''

''تو یہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا دور ہے۔ ہم اپنی ویڈیو اس پر ڈال دیں گے۔ پھر چینل والوں کی نظر پڑے گی اور......''

''اور تم پاپولر ہو جاؤ گے۔'' زیبی نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

''ان شاء اللہ...... پھر لڑکیاں میرے آگے پیچھے گھومیں گی۔ سیلفیز کے لیے منتیں کریں گی۔'' اس نے فخر سے جیکٹ کا کالر کھڑا کیا۔

''بہت شوق ہے لڑکیوں کے ساتھ سیلفی لینے کا......'' زیبی چڑ گئی۔

''یار اتنا تو میرا حق بنتا ہے۔''

''تو پھر تم بیٹھ کر یہ سہانے خواب دیکھو۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ کھڑی ہوئی۔ صائم نے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

''کیا مطلب، ناراض ہو کر جا رہی ہو۔''

''نہیں، سنڈریلا کے بارہ بج گئے ہیں...... زیبی نے ہاتھ چھڑایا۔

''یار تھوڑی دیر تو رکو۔ اتنے دنوں کے بعد تمہیں دیکھا ہے۔'' وہ مقابل کھڑا ہوا۔

''اچھا ویڈیو چیٹ پر کسے دیکھا کرتے ہو۔'' زیبی اسے ہٹا کر آگے بڑھی۔

''مطلب لائیو اتنے دنوں بعد دیکھا ہے۔''

''توبہ ہے صائم، تم ابھی سے اس لائیو اور ریکارڈنگ میں الجھ گئے۔'' زیبی کو ہنسی آ گئی۔

''ابو گھر پر ہیں...... پھر کسی دن......''

''آؤ دروازے تک چھوڑ آؤں۔'' دونوں ساتھ ساتھ چلتے گیٹ تک آئے۔

''سونگ کانا اچھا تھا؟''

''بہت اچھا تھا......''

''لوگ پسند کریں گے......''

''میں نے پسند کر لیا تو لوگ بھی کر لیں گے۔ ڈونٹ وری بہت پاپولر ہو گا۔'' پہلے صائم نے باہر جھانکا تھا پھر اسے گرین سگنل دیا۔

دو قدم کے فاصلے پر اس کے گھر کا گیٹ تھا۔

وہ گیٹ تک پہنچی تو صائم نے ہاتھ ہلا کر اپنا دروازہ بند کرلیا۔ بس ایک قدم کے بعد وہ اپنے گھر کے اندر ہوتی۔ مگر وہ ایک قدم خلا میں معلق رہ گیا تھا۔

گیٹ لاکڈ تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ کون آیا ہوگا۔ دروازہ کیسے بند ہوگیا۔" لمحوں میں پسینے پسینے ہوگئی۔

ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ واپسی کے لیے مڑی مگر کیا فائدہ بالکونی کا دروازہ بھی بند تھا۔ اب جائے تو جائے کہاں۔

روشانے کو کال کروں؟ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ "لیکن نہیں روشانے کا موبائل کمرے میں ہوگا اور وہ خود ابو کے پاس۔"

اب بیل دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تائی امی وظیفوں میں مصروف ہوں گی۔ امی ابو کی خدمت میں لگی ہوں گی۔

دروازہ روشانے ہی کھولے گی۔ اور روشانے کو رام کرنا مشکل نہ تھا۔ اپنے گمان پر یقین رکھتے اس نے بیل دے دی۔ آدھی بیل پر ہی ذیلی گیٹ کھل گیا تھا۔ وہ غڑاپ سے اندر داخل ہوئی۔ ابھی روشانے کو رام کرنے کے لیے لفظ ترتیب بھی نہیں پائے تھے کہ سامنے کھڑے باپ پر نظر گئی۔

صرف ڈھلتی شام ہی پیلی نہیں پڑی تھی۔ سرمد صاحب کا رنگ اس شام سے زیادہ زرد تھا۔

رہی زوباریہ سرمد۔ تو آئینہ سامنے ہوتا تو اپنی صورت دیکھنے اور پہچاننے سے انکار کردیتی۔

"کہاں سے آرہی ہو۔"

"وہ کہاں سے آرہی تھی......" زوباریہ نے سوچا اور شرم سے زمین میں گڑ گئی۔

"اپنا موبائل دو......"

کاش اس کے ہاتھ میں پکڑا موبائل غائب ہوجاتا۔ سرمد نے موبائل اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔

زوباریہ نے دیکھا۔ کچھ بھی دیکھنے، کچھ بھی پڑھنے سے پہلے ہی ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

سرمد نے میسجز کھولے۔

صرف چند میسجز پڑھ کر ہی انہیں، اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ صائم سے رابطے اور کس حد تک رابطے میں تھی۔

زوباریہ کی نظریں باپ کے جوتوں پر جمی تھیں۔ اسے لگا باپ کی ٹانگیں کانپی ہیں۔ حالانکہ ان کی ٹانگیں نہیں دل کانپا تھا۔ زمانے بھر کا تحیر ان کی آنکھوں میں اترا۔ (وہ آنکھیں جو آج سے پہلے بھی اتنی بوڑھی نہیں لگی تھیں) وہ اپنی گڑیا سی بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔

پھر انہوں نے گیلری کھولی اور پوری طرح اوپن ہونے سے پہلے ہی موبائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش سے ٹکرایا اور بکھر گیا۔

ساتھ میں ان کا مان بھی۔

ان کے اندر طیش کی غضب ناک لہر اٹھی۔ وہ ایک زور کا تھپڑ اس کے چہرے پر مارنا چاہتے تھے۔ اسی گال پر جسے انہوں نے سینکڑوں نہیں ہزاروں بار چوما تھا۔

مگر کیسے؟

بیٹی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس رحمت کو سجدۂ شکر ادا کرکے کلیجے سے لگایا تھا۔ مارنا تو ایک طرف کبھی سخت لفظ نہیں بولا تھا۔ وہ رب کی رحمت جو تھی۔

کہتے ہیں، بیٹیاں رزق ہوتی ہیں۔ ان پر جب بھی نظر ڈالو شکر کی ڈالو۔ مگر آج حلال رزق میں حرام کی آمیزش ہوگئی تھی۔

محبت پاکیزہ جذبہ ہے۔ جسے پاکیزہ رشتوں کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ آج ہیر رانجھا۔ سسی پنوں لکھنے

والے۔
محبت کے دیوانے شاعر یا نام نہاد لبرلز ل کر ان کے منہ پر تھوک بھی دیں۔ تب بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ایک لڑکا ایک لڑکی کے ساتھ یا ایک لڑکی کسی لڑکے کے گھر تنہائی میں ملاقاتیں، درست ہیں۔
''تمہارے درمیان تیسرا شیطان ہے تو یہ کن کے لیے کہا گیا تھا۔'' ان کے اندر آگ دہک رہی تھی۔ مگر ان کے ہاتھ برف بنے پہلو میں گرے ہوئے تھے۔

☆☆☆

ابو کچھ کہہ دیتے تو زوبار یہ کو اتنی بے چینی نہ ہوتی۔ مگر وہ تو خاموشی سے کمرے میں چلے گئے تھے۔ روشانے کی آنکھوں میں زہی کے لیے اتنی بے گانگی تھی کہ زہی کو اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔
روشانے پانی کا گلاس لے کر گئی تو ثمینہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ روشانے نے باپ کو دیکھا گویا باپ نہیں پتھر کا مجسمہ تھا۔
''میں کیسے یقین کرلوں زوبار یہ ہمیں دھوکا دے رہی تھی۔ ہماری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔ اور یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا؟ کم بخت اگر تمہیں پہلے پتا تھا تو پردے کیوں ڈالتی رہی......'' وہ روشانے پر ہی برس پڑیں......
''نہیں پتا تھا...... جب پتا چلا تو بتا دیا۔ ابو! پانی لے لیں۔''
اس نے باپ کا کندھا ہلایا۔ تو وہ چونکے...... ساتھ ہی احساس ہوا سانس لے رہے ہیں ورنہ وہ تو خود کو مرا ہوا سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے دو گھونٹ بھر کے پانی کو دیکھا۔
''وہ رشتہ......'' تھوک نگلا۔ ''اسی کی مرضی سے آیا تھا؟''
''جی......'' روشانے کی آواز مدہم تھی۔
''تب ہی بتا دیتی تو دو بول پڑھوا کر اس فتنے کو گھر سے دفع کرتی۔''
سرمد کھڑے ہو گئے اور چپل پہننے لگے۔
''کہاں جا رہے ہیں؟''
''پیاری بیٹی ہمارے منہ پر کالک ملنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اسی کو دھونے کی کوشش کرنے جا رہا ہوں......'' وہ آہستگی سے کہہ کر چلے گئے۔

☆☆☆

''میرا تو دل نہیں مانتا ہمارا خون اتنا باغی کیسے ہو سکتا ہے۔ گھر میں نظروں کے سامنے یہ بچیاں پلی بڑھی ہیں؟'' زبیر صاحب نے تاسف سے ہاتھ ملے۔ ساجدہ نے آہ بھر کے بیٹے کو دیکھا۔ تو وہ تلخی سے گویا ہوا۔
''چلیں اچھا ہوا۔ چچا تک یہ بات خود ہی پہنچ گئی۔ کوئی اور کہتا تو شاید یقین ہی نہ کرتے۔''
''پتا نہیں کہاں غلطی ہو گئی۔''
''غلطی تو ہوئی ہے۔'' زبیر صاحب کی بات پر دانیال اور ساجدہ بیگم نے چونک کر انہیں دیکھا۔
''ایک غیر لڑکے کو اتنی آزادی سے گھر میں آنے جانے کی اجازت دی۔ ٹھیک ہے بچپن سے آتا جاتا تھا۔ مگر یہ بھول گئے کہ بچپن چلا گیا ہے۔ بچے جوان ہو گئے ہیں۔ اور اب یہ تعلق آگ اور تیل جیسا ہے۔''
''جب پابندیاں لگائیں تو یہی بچے ہمارے منہ کو آتے ہیں کہ ہم ان پر اعتبار نہیں کرتے۔''
''اعتبار کر لیں تو یہ گل کھلاتے ہیں......'' ساجدہ تلخ ہوئیں۔
''ابو! اب کیا کرنا ہے۔''

"سرمد کو فیصلہ کرنے دو۔ ویسے وہ گیا ہے ابراہیم سے بات کرنے۔"
زبیر کی بات پر دانیال چونک گیا۔
"ان سے کیا بات کریں گے......"
زبیر صاحب چپ ہو گئے۔
چپ تو فائقہ اور ابراہیم بھی ہو گئے۔ بیٹی کا باپ سامنے بیٹھا سر جھکائے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی ان کے لڑکے سے کرنے کو تیار ہے۔
"اس دن ہم جذباتی ہو کر آپ کے پاس آئے تھے۔" ابراہیم نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔
"آج آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔"
"جذباتی نہیں، مجبور ہو گیا ہوں۔" سرمد کرلائے۔ فائقہ کو سخت غصہ آ رہا تھا۔ کس قدر جذباتی نسل ہے۔
"سچ پوچھیں تو اس عمر میں بیٹے کی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ابھی اسے زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی تو اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا اور ذرا سوچیں۔ آج جذباتی ہو کر دونوں کی شادی کر دیں۔ دو چار سال میں اسے احساس ہو کہ اس سے تو غلطی ہو گئی تو آپ کی بیٹی کہاں کھڑی ہو گی۔"
سرمد چپ کے چپ رہ گئے۔ ابراہیم نے سمجھو انکار ہی کیا تھا۔ مگر وہ زوباریہ کو اب گھر نہیں رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

"مما! صرف دس منٹ کی بات تھی۔ میں اس کے ساتھ صرف سونگ شیئر کرنا چاہتا تھا" وہ برافروختہ ہوا۔ اچھے خاصے حالات پھر سے بگاڑ کی طرف چلے گئے تھے۔
"جس کے ساتھ زندگی شیئر کرنا ہو۔ اسے اتنے چھوٹے امتحانوں میں نہیں ڈالتے۔ کہا تھا۔ سمجھایا تھا۔ تم دونوں نے وعدہ بھی کیا تھا پھر یہ بے صبری کیوں؟"
وہ بری طرح چڑ گئی تھیں۔
"انہوں نے زوباریہ سے کیا کہا؟" اسے فکر لاحق ہوئی۔
"پتا نہیں۔"
"نجانے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔" وہ مضطرب تھا۔
"کچھ بھی کر رہے ہوں۔ اس کے گھر والے ہیں۔" فائقہ نے باور کروایا کہ وہ اس کا لگتا ہی کیا تھا۔ اور زوباریہ کا کالج جانا بند ہو گیا تھا۔ اس کا موبائل ٹوٹ چکا تھا۔
نیٹ چلانے کی اجازت نہیں تھی۔
"کالج جانا کیوں بند کر رہے ہیں۔ آئندہ نہیں کروں گی۔"
وہ روشانے کی منتیں کرنے لگی۔
"آئندہ کے وعدے بار بار کام نہیں آتے اور نہ ہی کسی کو اتنے چانس ملتے ہیں۔" روشانے سارا غصہ آٹا گوندھنے پر نکالنے لگی۔
"تو گھر رکھ کر کیا کریں گے۔"
"اچار ڈالیں گے۔" ثمینہ نے اندر آتے ہوئے اس کا جملہ سن لیا تھا سو پھٹ پڑیں۔
"جو تمہاری حرکتیں ہیں۔ باپ تمہاری شکل دیکھنے کا روادار نہیں۔ اور گھر میں رکھنا تو مجبوری ہے۔ دھکا دے کر گھر سے نکال نہیں سکتے۔"

زوبار یہ گردن جھکا گئی۔
''اب جاؤ یہاں سے سر پر کیوں سوار ہو۔'' ثمینہ نے غصے سے کہا تو امڈتے آنسوؤں کو روکتے وہاں سے آ گئی تھی۔
''کوئی بات نہیں۔ تھوڑے دن کا غصہ ہے ختم ہو جائے گا۔'' اس نے کمرے میں آ کر خود کو تسلی دی۔ مگر یہ تسلی چند روزہ ہی تھی کہ سرمد نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ لیا تھا۔ زیبی نے سنتے ہی آسمان سر پر اٹھا لیا۔ لحاظ، مروت سب ایک طرف...... کمرے میں ایک طوفان بدتمیزی بپا تھا۔ روشانے نے بھاگ کر کنڈی لگائی۔
''خدا کے لیے اپنی زبان قابو میں رکھو کسی نے یہ بکواس سن لی تو قیامت آ جائے گی۔''
''ابھی قیامت آئی ہے۔'' زوبار یہ کی آواز پھٹ گئی۔
''جو کچھ میرے ساتھ کر رہے ہو وہ کسی قیامت سے کم ہے۔''
''ہم تمہارے دشمن تو نہیں ہیں۔''
''تو کیا ہو؟ کسی کو میری تکلیف کا احساس نہیں۔ خود اپنی محبت کو پا لیا اور میرے لیے بس نصیحتیں رہ گئی ہیں۔'' وہ فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔
''خدا کے لیے زیبی یہ تماشے بند کر دو۔ تمہاری اپنی غلطی تمہارے گلے پڑ رہی ہے۔''
''مجھے میری غلطیوں کا احساس دلاتی رہو گی یا میرے لیے کچھ کرو گی بھی۔'' زیبی مٹھیاں بھینچ کر چلائی۔
''کیا کروں؟''
''ابو سے کہو میری شادی ہی کرنی ہے تو صائم سے کر دیں۔''
''خود گئے تھے۔ یہی کہنے کہ ان کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔'' روشانے نے گویا اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔
''ہو ہی نہیں سکتا۔ جھوٹ بولتی ہو۔''
''نہ کرو یقین، مگر حقیقت یہی ہے۔'' روشانے زچ ہو کر جانے کو مڑی۔
''میری صائم سے بات کرواؤ۔''
''وہ جا چکا ہے۔'' روشانے کا ہاتھ لاک پر رک گیا تھا۔
''کہاں؟''
''اپنے نانا کے پاس۔''
''مجھے اس صورت حال میں تنہا چھوڑ کر۔'' وہ ششدر سی رہ گئی۔ روشانے نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے باہر چلی گئی تھی۔ پیچھے زوبار یہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھی رہ گئی اس کے اردگرد بیسیوں سوال اور سینکڑوں خدشے تھے۔ جو ننھے منے سنپولیوں کی طرح اسے ڈس رہے تھے۔

☆☆☆

کاروبار اور زندگی کے دیگر معاملات سے جیسے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ تبھی وہ آدھے دن کے بعد اٹھ جاتے۔ زبیر صاحب، بھائی کی کیفیت کو سمجھتے تھے اس لیے خاموش رہتے تھے...... کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ روشانے کی آواز پر رک گئے۔ وہ ماں کو سمجھا رہی تھی۔
''امی! وہ یہ زبردستی کی منگنی نہیں کرے گی۔ دیکھا نہیں مہمانوں کے سامنے اس کا رویہ کتنا عجیب تھا۔''
''اس کے اندر اتنی بغاوت کہاں سے آ گئی روشانے۔'' ثمینہ کی آواز میں بے بسی نمایاں تھی۔ ''تم نے دیکھا نہیں۔ اس کی آنکھ میں کوئی شرم، کوئی حیا باقی نہیں رہی۔ ہم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تم لوگوں کی تربیت میں۔''
''روشانے اور زوبار یہ دونوں ایک ہی ماحول میں پلی ہیں۔ جن کی فطرت میں کجی ہو۔ ان کا تربیت بھی

کچھ نہیں کر سکتی۔'' ساجدہ کی آواز بہت مدھم تھی۔انہیں بامشکل لفظ سمجھ میں آئے۔
''امی! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔'' روشانے کے لہجے میں جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔
''اگر اس نے اپنے سسرال والوں کے سامنے رنگ پہننے سے انکار کر دیا۔''
''تو میں اپنے ہاتھوں اس کا گلا دباؤں گی۔''
کچھ یہی خدشات بڑے بھائی نے بھی سامنے رکھے تھے۔
''سوچ لو سرمد! کیا ایک انگوٹھی اس کا راستہ روک سکے گی۔''
''تو ٹھیک ہے منگنی کی جگہ نکاح کر دیتا ہوں۔'' وہ اتنے حواس باختہ تھے کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔
''اچانک نکاح پر لوگ سوال نہیں کریں گے۔''
''انگلیاں اٹھانے سے تو بہتر ہے سوال ہی کر لیں۔'' سرمد تلخ ہوئے۔اپنے خیالوں سے چونک کے انہوں نے اندر کی آوازوں پر توجہ کی۔ پھر بے دلی سے ہٹ گئے۔

☆☆☆

فائقہ نے نانا کی بیماری کا بہانہ بنا کر صائم کو لاہور بھیج دیا تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی صائم کو جانا پڑا۔نانا سے پیار بھی تو بہت کرتا تھا۔
''اباجی کو سمجھا دیا تھا......'' ابراہیم کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔
''بتا دیا تھا۔اسے کچھ دن روک لیں گے۔'' فائقہ کا سر درد نہیں جاتا تھا۔ کہاں لا کھڑا کیا تھا اکلوتی اولاد نے۔ مستقبل، تعلیم، نیک نامی، سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔اس کمبخت محبت نے۔
''اس دوران زوباریہ کی منگنی یا نکاح ہو جائے گا تو شاید یہ لوگ ہار مان لیں گے۔''
''اللہ کرے سب ٹھیک ہو جائے۔'' ابراہیم نے پیشانی سہلائی۔ حالانکہ اس بات پر پورا یقین انہیں بھی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ تمہاری ہونے والی سسرال سے سامان آیا ہے۔''
بیڈ پر بیٹھی زیبی نے سر اٹھا کر سامنے پڑی چیزوں کو دیکھا۔ منگنی کا جوڑا۔ جوتے، جیولری...... وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ سارا احتجاج، بھوک ہڑتال بے کار گیا۔اسے ایک زبردستی کی زندگی جینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔
اس کے اندر نفرت کی لہر اٹھی۔
روشانے نے کچھ لمحے اس کے ردعمل کا انتظار کیا۔
مگر وہ خاموش تھی۔شاید اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔روشانے خوش گمان ہوئی۔
''زیبی، ابا نے تمہارے لیے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔لڑکا بہت اچھا ہے۔ سسرال بھی زیادہ لمبا چوڑا نہیں۔ گھر میں صرف ماں بیٹا ہیں۔ والد کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ بہنیں شادی شدہ، روپے پیسے کی ریل پیل ہے۔تم پر زیادہ ذمہ داریاں بھی نہیں ہوں گی۔
زیبی کے ہونٹوں پر گہری چپ تھی۔
''تم کچھ کہو گی نہیں۔''
''کیا کہوں؟'' زیبی کے لہجے میں شکستگی نہیں تھی کچھ اور تھا۔
روشانے کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی۔
''زیبی! اچھی لڑکیاں ماں باپ کے فیصلوں پر سر جھکا لیتی ہیں۔'' (اور میں اچھی لڑکی نہیں)
اس نے لیٹ کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا...... روشانے نے کچھ اور کہنے کو لب کھولے۔ مگر زیبی پہلے ہی بول اٹھی۔

"کیا تم مجھے کل تک کے لیے اکیلا چھوڑ سکتی ہو۔"

اس کے سپاٹ لہجے پر روشانے نے خاموشی سے کمرہ چھوڑ دیا۔ دروازہ بند کر کے پلٹی تو سامنے کھڑے دانیال کو دیکھ کر چونک گئی۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔" روشانے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"وہ ٹھیک تو ہے۔ مطلب کچھ گڑبڑ تو نہیں کرے گی۔"

"مجھے نہیں پتا دانیال۔" روشانے بے زار ہو گئی۔ اچھی خاصی خوب صورت زندگی جیسے بدصورت کٹہرے میں گزرنے لگی تھی۔

"کیا مطلب؟ تم اس کی بڑی بہن ہو۔"

"ہاں ہوں، لیکن اس کے ہر عمل کی ذمہ دار میں نہیں ہوں۔ دانیال!" وہ چڑ کر بولی پھر جھنجلا کر وہاں سے چلی گئی۔ دانیال نے الجھ کر اسے جاتے دیکھا۔ پھر کمرے کے بند دروازے کو۔ اس بند دروازے کے پیچھے چھٹانک بھر کی لڑکی کیا سوچ رہی تھی کیا کرنے والی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

"زیبی نے کھانا کھالیا۔"

سب لوگ بہت خاموشی اور بے رغبتی سے کھا رہے تھے۔ سرمد کے سوال پر چونکے۔

"نہیں ----" جواب ثمینہ نے دیا تھا۔

"پلیٹ بنا دو۔ میں لے کر جاتا ہوں۔" سب نے پھر حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا مگر کوئی کچھ نہیں بولا تھا۔ روشانے نے پلیٹ میں چاول بھرے۔ سلاد اور کٹلس رکھا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پلیٹ لے کر چلے گئے تھے۔ ثمینہ نے چمچ رکھ دیا۔ پتا نہیں اب باپ بیٹی میں کیا بات ہوگی۔

کمرے میں کرنے کو کچھ نہ تھا۔

بالکونی لاکڈ تھی۔

وہ فرش پر بیٹھی اپنی اسکیچ بک پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ لکیریں جو باہم ملتی تو صائم کا نام لکھتی تھیں۔ زیبی نے آہٹ پر سر اٹھایا اور باپ کو دیکھ کر اسکیچ بک بند کر دی۔ ان کا دل مٹھی میں آ گیا۔

یہ چمپئی رنگت اور بڑی بڑی کٹارتی آنکھوں والی لڑکی ان کی زد بار یہ تھی۔

ایک لمحے کو دل چاہا۔ وہ جو کھیلنے کو چاند مانگ رہی ہے۔ وہ چاند لا کر اس کی ہتھیلی میں رکھ دیں۔

مگر پھر ابراہیم کا جواب......

کم عمری کی قباحتیں اور ان کے ناپختہ جذبات...... زمانے کی باتیں...... عزت و غیرت کے فلسفے......

وہ اس کے پاس نیچے ہی بیٹھ گئے۔ ایک چمچ چاولوں کا بھر کے اس کی سمت بڑھایا۔

زیبی نے خاموشی سے کھا لیا۔

"لوگ بیٹوں کی خوشیاں مناتے ہیں۔ میں نے بیٹیوں کے پیدا ہونے پر منائی تھی۔ انہیں اپنا فخر بنایا۔ مگر اس فخر کو مٹی میں ملایا بھی تو کس نے...... جس پر مجھے سب سے زیادہ مان تھا۔"

چاول زیبی کے حلق میں پھنس گئے۔

"اس فخر کو مٹی میں ملایا بھی تو کس نے۔ جس کے بارے میں، میں ہمیشہ کہتا تھا کہ یہ ہمارے خاندان کا نام روشن کرے گی۔"

"ابو! میں......"

''نہیں زوبار یہ! مجھے وضاحتیں نہیں فیصلہ چاہیے۔ میں تم سے تمہارا باپ ہونے کا حق مانگتا ہوں۔'' وہ ایک لمحے کو رکے۔

زیبی کو لگا اس کے گلے میں پھندا کسا جا رہا ہے۔

''میرا منصب نہیں کہ تمہاری منتیں کروں۔ تمہیں حکم دے سکتا ہوں۔ اس بات کی اجازت میرا مذہب، میرا معاشرہ مجھے دیتا ہے۔ پھر بھی فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔

کس کا ساتھ دو گی؟ میرا یا اس لڑکے کا۔''

پھندا پوری طرح اس کی گردن میں کس گیا تھا۔

یہ پھندا تھا اطاعت کا۔ ماں باپ کی محبت ان کے مان کا۔

''ابو اس طرح مت کریں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھ پر ظلم مت کریں۔'' وہ بلک اٹھی۔

''ظلم......'' انہوں نے تعجب سے دہرایا۔

''بیٹا! آپ نے نہ ظلم دیکھا ہے نہ ظالم باپ، ظلم وہ ہوتا ہے جب ایک باپ اپنی اولاد کو صرف بیٹی سمجھ کر منہ پھیر لے۔ یا بیٹے کی چاہ میں دوسری شادی کر کے بیٹیوں کو فالتو سامان کی طرح گھر کے کونے میں ڈال دے۔ اور وہ اپنی جائز ضرورتوں کے لیے بھی منتیں کرتی پھریں۔''

''ابو۔''

انہوں نے پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف جھکایا اور پیشانی پر شفقت بھرا بوسہ دیا۔

زوباریہ ششدر رہ گئی۔

''فیصلہ کر لو۔ تمہاری پیشانی پر باپ کا یہ پیار آخری تو نہیں۔''

وہ جا چکے تھے۔

اس کی پیشانی پر باپ کا آخری پیار سلگنے لگا تھا۔

☆☆☆

سرمد بیٹی کے کمرے سے نکلے تو قدم من من بھاری تھے۔ دو قدم اٹھاتے تو دو پر رک جاتے تھے۔ پوری مضبوطی کے ساتھ فیصلہ سنا کر آئے تھے تو دل کیوں کانپ رہا تھا۔ بیٹی کی بجھی آنکھیں، آنکھوں میں راکھ ہوتے خواب۔ ویران چہرہ، ہر فیصلے کو سیلاب کی طرح بہائے جا رہا تھا۔ وہ نڈھال سے ہو کر بیڈ پر سیدھے لیٹ گئے۔ ثمینہ نے دیکھا تو سوال کرنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔ اور اسی بے ہمتی میں رات بجھ گئی اور دن روشن ہو گیا وہ ہڑبڑا کر اٹھے۔

''کیا ہوا؟'' ثمینہ نے ان سے زیادہ گھبرا کر قرآن پاک بند کیا۔

''زیبی کے پاس۔''

''اتنی صبح، ابھی تو سو رہی ہو گی۔''

''نہیں سوئی ہو گی۔ ساری رات نہیں سوئی ہو گی۔'' وہ بیڈ سے اترے۔

''آپ نے رات اس سے کیا کہا۔''

''جو رات کہا وہ بھول گیا ہوں۔ میں زیبی کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دے سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

''میں اسے وہی دوں گا جو وہ چاہتی ہے۔'' ثمینہ کو لگا ان کے سامنے کوئی دیوانہ کھڑا ہے۔

''میں خود جا کر ابراہیم کی منت کر لوں گا۔ ہم ان دونوں کی منگنی کر دیں گے۔ پھر جو اس کے نصیب میں ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم اپنے بچوں پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے ثمینہ...... وہ میری آنکھوں کی روشنی ہے۔ میں اسے بجھتے نہیں

دیکھ سکتا۔ اب وہی ہوگا جو وہ چاہتی ہے۔
میں صائم کو اس کا بنادوں گا۔ بھلے مجھے اس کے ماں باپ کی منتیں کرنی پڑیں۔ اگر ہارنا ہی ہے تو ہم ہار جاتے ہیں ثمینہ؟"
وہ بڑبڑاتے ہوئے ننگے پاؤں کمرے سے نکل گئے۔
ثمینہ نے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ انہیں جاتے دیکھا۔ پھر آنکھوں سے نمی صاف کی۔ آج عزت وغیرت کے سارے فلسفے ہار گئے تھے۔ بس محبت کرنے والا باپ جیتا تھا۔
"زیبی! میری گڑیا۔ آؤ تمہاری پیشانی پر ایک بوسہ اور دوں کبھی باپ کا پیار بھی آخری ہوا ہے۔"
انہوں نے دیوانہ وار کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہوا کا جھونکا اندر آیا اور سارے پردے اڑ گئے۔ زیبی وہاں نہیں تھی۔ بیڈ پر ایک سفید کاغذ پڑا ہے۔
"آئی ایم سوری ابو......"
ان کا آخری بوسہ ان لفظوں پر سر رکھے سسک رہا تھا۔
گھر میں اتنے سیل فون تھے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ زیبی کے ہاتھ ایک بھی نہ لگتا اور اس کا صائم سے رابطہ نہ ہوتا۔ ساری سچوئشن جان کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔
"اب بتاؤ میں کیا کروں؟" یہ اس دن کی بات تھی جب لڑکے والے اسے دیکھنے آرہے تھے۔
"ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ ہم نکاح کرلیں۔"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" اس انتہائی قدم کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔
"گھر سے بھاگ کر......" زیبی کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔
"ہم نکاح کریں گے اور واپس آجائیں گے۔ پھر ہماری فیملیز کے پاس کوئی آپشن نہیں ہوگا۔ انہیں ہمارا رشتہ قبول کرنا ہی ہوگا۔" زندگی ان کے نزدیک تین گھنٹے کی فلم تھی جس کے بعد ہیپی اینڈنگ ہونا تھی۔
"پھر سب لوگ مان جائیں گے۔" زیبی تذبذب کا شکار ہوئی۔
"ظاہر ہے۔" صائم کو زیبی کے ساتھ ساتھ اپنے والدین پر بھی غصہ تھا۔ ان کی پلاننگ سامنے آگئی تھی۔ نانا کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ جتنی وہ ظاہر کررہے تھے۔
"دانیال بھائی ہماری جان لے لیں گے۔" وہ ڈر رہی تھی۔ صائم چڑ گیا۔
"اتنا آسان نہیں ہے۔ ہماری جان لیں گے تو خود جیل جائیں گے۔"
"مگر یہ سب ہوگا کیسے؟" اس کے لہجے میں نیم رضامندی تھی۔
"نکاح کے لیے کیا چاہیے ہوتا ہے۔ لڑکا، لڑکی، قاضی اور دو گواہ، ہم یہاں سے نانا کے گھر جائیں گے۔ ٹرین کا سفر زیادہ محفوظ ہوگا۔"
"نانا ہمارا ساتھ دیں گے۔"
"وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور جس سچوئشن میں ہم ان کے پاس جائیں گے۔ ان کے پاس ہمارے نکاح کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہوگا۔ پھر ہم گھر واپس آجائیں گے تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ لیکن وہ تو کب سے ہو رہی ہے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
صائم نے جتنے یقین سے کہا تھا۔ زیبی کو بھی لگا اس کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ایسا صرف اسے لگا تھا۔
☆☆
(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' اشفاق نے فرحین کے بگڑے مزاج کو دیکھ کر جھنجھلا کر پوچھا۔

''ہر بار میں کیوں بتاؤں؟''

فرحین نے رکھائی سے کہا تو اشفاق اپنے ابلتے غصے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے گویا ہوا۔

''دیکھو فرحین! پہلے ہی تمہاری بے جا ضدوں اور دوسروں سے مقابلہ کرنے کی عادت کی وجہ سے میں مسلسل نقصان پر نقصان اٹھا رہا ہوں۔ اب مہربانی کرو اور اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا سیکھو!''

اشفاق نے سخت لہجے میں کہا تو فرحین غصے

نگارزیبہ الطاف ہاشمی

زرخیز مٹی

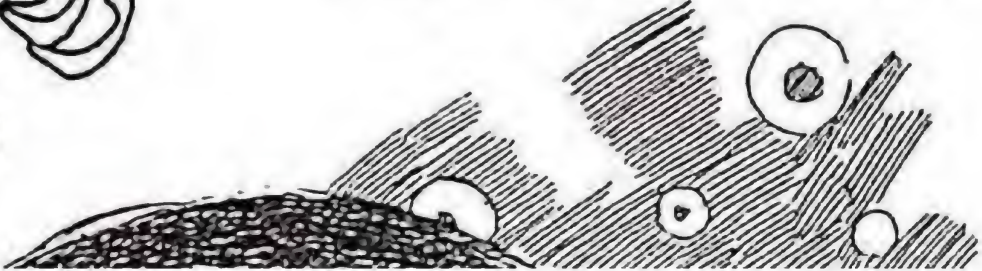

سے اسے گھورنے لگی۔

"ہاں ہاں! میں ہی غلط ہوں! میں یہ سب کس لیے کرتی ہوں۔ آپ کی عزت بنانے کے لیے۔ میرے سلیقے اور عقل مندی کی وجہ سے پورے خاندان اور محلے میں آپ کی شان و شوکت کے چرچے ہیں مگر آپ ہمیشہ مجھے ہی برا کہتے ہیں۔"

فرحین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تو اشفاق کا دل نرم پڑ گیا۔

"میں کوشش کر رہا ہوں کہ نئے گھر کی خوشی میں ایک شان دار سی پارٹی کا بندوبست کرلوں مگر......"

اشفاق کی پوری بات سنے بغیر ہی فرحین بول اٹھی۔

"میں نے خاندان میں سب سے کہہ دیا ہے کہ ہم شان دار باربی کیو پارٹی کر رہے ہیں، تھوڑی بہت آتش بازی کرلیں گے اور کیا۔ ہم نے کون سا بینڈ باجا بجانا ہے جو کسی کو اعتراض ہوگا۔ سب مل بیٹھیں گے کتنا مزہ آئے گا ناں۔"

فرحین خیالوں ہی خیالوں میں سب حریفوں کو شکست کھاتے دیکھ کر خوشی سے ہوا میں اڑ رہی تھی۔

"مگر اس سب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پہلے تو کبھی ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا؟" اشفاق نے جھنجھلا کر کہا۔

"اس لیے کہ پہلے آپ کی والدہ محترمہ کا حکم چلتا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لینے دیتی تھیں۔"

فرحین نے منہ بنا کر کہا تو اشفاق جز بز ہو کر رہ گیا۔

"اماں کو گزرے صرف ایک سال ہی ہوا ہے اور تم...... کچھ ادب لحاظ سے کام لیا کرو۔" اشفاق نے ناگواری سے کہا۔

"یہ مت بھولیں کہ کئی سال میں نے آپ کی ماں کی خدمت بھی کی تھی۔"

فرحین نے فوراً احسان جتایا تو اشفاق گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی فرحین کو اس کا تلخ رویہ اور زبان درازی یاد نہیں کروا سکا جس کا دکھ اس کی ماں کو ہمیشہ رہا۔

"خدمت تو حسن بھائی اور امبر بھابھی نے کی ہے۔ ہم نے تو بمشکل دو یا تین سال ہی ماں جی کو اپنے پاس رکھا تھا۔"

اشفاق نے سر جھکا کر کہا تو فرحین کو غصہ آگیا۔

"ہاں تو کیا انھوں نے احسان کیا ہے؟ جب وہ لوگ دبئی میں تھے تو ہم نے ماں جی کی خدمت کی اور جب وہ واپس آگئے تو ماں جی اپنی خوشی اور رضا سے ان کے پاس رہنے چلی گئیں۔ ہم نے تو کئی بار کہا تھا کہ کچھ دن ہمارے پاس بھی آکر رہ لیں مگر آپ کے والدین کو صرف بڑے بیٹے سے محبت تھی۔"

"ماں جی کی تم سے بنتی نہیں تھی جبکہ امبر بھابھی سے تو وہ بہت خوش تھیں۔"

اشفاق نے ایک اور ملال کا ذکر کر کے فرحین کو آگ لگادی۔

"اس لیے کہ تمہاری امبر بھابھی انتہا درجے کی مکار اور میسنی عورت ہیں۔ میں ٹھہری ہمیشہ سے صاف گو اور منہ پھٹ......!"

فرحین نے کہا تو اشفاق نے مزید بحث کرنے کے بجائے وہاں سے اٹھ جانے میں عافیت سمجھی۔

"باربی کیو پارٹی ڈن ہے ناں!" فرحین نے جلدی سے پوچھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اشفاق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

فرحین خوشی سے اچھل پڑی۔ وہ ہمیشہ ہی لڑ جھگڑ کر اپنی بات منوا لیتی تھی۔

"اب آئے گا مزہ!" فرحین نے چٹکی بجاتے ہوئے سینٹرل میز پر رکھا اپنا موبائل فون اٹھایا اور جلدی جلدی میسج ٹائپ کرنے لگی۔

☆☆☆

"تم نے کس سے اجازت لی ہے؟"

فرحین نے کڑے تیوروں سے اپنے بیٹے کو گھورا جو سامنے والے صوفے پر بیٹھا موبائل میں مگن تھا۔ ماں کے سوال پر چونک کر متوجہ ہوا۔

"کیا مطلب؟" ہارون نے حیرت سے پوچھا۔

''میں پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کس سے اجازت لے کر یہ پروگرام بنایا ہے؟'' فرحین نے سختی سے پوچھا۔

''مما! تایا ابو کے گھر جانے کے لیے پروگرام بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں وہاں پہلے بھی جاتا رہا ہوں۔''

ہارون نے کندھے اچکا کر کہا۔

''پہلے وہاں تم اپنی دادی جان کے لیے جاتے تھے۔ اب وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔'' فرحین نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''مگر کیوں؟ کیا میں وجہ جان سکتا ہوں؟'' ہارون نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''ماں سے سوال جواب کرتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟'' فرحین نے جھنجھلا کر کہا۔

''اف مما! آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا میں وجہ بھی نہیں جان سکتا؟'' ہارون نے چڑ کر کہا تو فرحین نے گہری سانس لی۔

''وجہ بتانے کی ضرورت ہے؟ بس مجھے تمہاری تائی کی عادتیں پسند نہیں ہیں۔'' فرحین نے منہ بنا کر کہا تو ہارون ہنس پڑا۔

''اچھا اب سمجھا، خاندانی سیاست ------ ویسے مما! تائی بہت اچھی ہیں۔'' ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھا۔ اسی وجہ سے میں کہتی ہوں کہ وہاں مت جایا کرو۔ تم ان کی طرف داری کرنے لگے ہو۔'' فرحین نے اصل مسئلہ بتایا تھا۔

''مما! اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں تایا ابو کے گھر جانا چھوڑ دوں۔ آپ بڑوں کے جو بھی مسئلے ہیں، ان سے ہم بچوں کا کیا لینا دینا ہے۔ ہم سب کزن میں اچھی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی ہے۔''

ہارون نے صاف جواب دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اگلے دن اپنے بنائے پروگرام کے مطابق وہ تایا کے گھر ویک اینڈ گزارنے چلا گیا۔ جس پر فرحین کو بہت غصہ آیا مگر وہ ضبط کر گئی۔ فرحین کو اندیشہ لاحق تھا کہ کہیں ہارون، حسن کی چھوٹی بیٹی ماریہ میں دلچسپی نہ لینے لگے۔ ماریہ میں بظاہر تو کوئی خامی یا کمی ایسی نہیں تھی کہ جسے بنیاد بنا کر کوئی بھی اس کے رشتے سے منع کرتا مگر فرحین کو اصل مسئلہ اور حسد امبر سے تھا۔

زندگی میں بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم اپنے حریف کو اچھے اخلاق، کردار یا ظرف سے شکست نہیں دے سکتے تو پھر ہم دنیاوی چیزوں اور خوبیوں کا سہارا لینے لگتے ہیں جیسے دولت، رتبہ، رنگ، روپ وغیرہ۔

فرحین بھی جو ساری زندگی، امبر کو اچھے اخلاق، بہترین کردار اور اعلا ظرفی میں شکست نہیں دے سکی، تو اپنے پیسے اور رتبے کے بل بوتے پر اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگی مگر مقابلے اور حسد کی دوڑ میں وہ ایک بات بھول گئی تھی کہ نیچا اسے دکھایا جاتا ہے جو آپ کو اپنے مقابلے میں سمجھتا یا دیکھ رہا ہو۔ جو شخص اپنے ظرف اور کردار کی بلندی پر کھڑا ہو، وہ بھلا نیچے جھک کر کیوں دیکھے گا۔ یہی امبر کا اس کے ساتھ رویہ تھا۔

☆☆☆

فرحین کی خواہش کے مطابق نئے گھر کی دعوت بہت شان دار ہوئی۔ پیسہ پانی کی طرف بہا کر بھی فرحین مطمئن نہیں تھی کیونکہ وہ جو شکست اپنے خود ساختہ بنائے حریفوں کے چہروں پر دیکھنا چاہتی تھی، وہ تو معمول کے مطابق دعوت میں شامل ہوئے اور مسکراتے ہوئے ہی رخصت ہو گئے۔

''اونہہ! لوگ جل گئے ہیں۔'' رات کو سونے سے پہلے فرحین نے جلے دل سے شوہر کے سامنے تبصرہ کیا تو اشفاق گہری سانس لے کر رہ گیا۔

فرحین کو جواب دینے کا مطلب رات کے اس پہر نئی بحث چھیڑنا تھا اور تھکے ہارے اشفاق کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔ فرحین بڑبڑاتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگی کہ جب وہ فون کر کے اپنی گہری سہیلیوں کے

سامنے دل کا بوجھ ہلکا کرے گی۔

☆☆☆

"ماریہ کے لیے اچھے رشتے آئیں یا برے۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟"

فرحین نے چڑ کر کہا۔ اشفاق آج گھر آیا تو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ رات کھانے کے بعد جب اس نے اپنی سوچ کی وجہ بتائی تو فرحین غصے میں آگئی۔

"ماریہ میری بھتیجی ہے۔ مجھے فرق پڑتا ہے۔" اشفاق نے سخت لہجے میں کہا تو فرحین نے منہ بنالیا۔

"فرحین! تم میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔" اشفاق نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نرم لہجے میں کہا۔

"آپ ہمیشہ اپنے گھر والوں کے لیے مجھے اگنور کر دیتے ہیں۔" فرحین نے ہمیشہ کی طرح جذباتی بلیک میلنگ سے کام لیا۔

"تم یہ سب ڈرامے چھوڑو اور جو میں کہنے جا رہا ہوں، اسے غور سے سنو۔" اشفاق نے جھنجھلا کر کہا تو فرحین سنبھل گئی۔ کیونکہ اشفاق جب ایسے موڈ میں ہو تو فرحین اپنی حد میں رہنا ہی مناسب سمجھتی تھی۔

"جی بولیں۔" فرحین نے سنجیدگی سے کہا۔

"فرحین! دیکھو، میں چاہتا ہوں کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے ہم ماریہ کا ہاتھ مانگ لیں۔"

فرحین کو پوری بات سن کر کرنٹ ہی لگ گیا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہیں؟" فرحین نے پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس میں ایسا بھی غلط کیا ہے؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہارون بھی ماریہ کو پسند کرتا ہے۔"

اشفاق نے پرسوچ انداز میں کہا۔ فرحین غصے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"اپنے اندازے اپنے پاس ہی رکھیں۔ میرا بیٹا اتنا احمق ہرگز نہیں ہے۔ میں اپنی بہن کی بیٹی شفق کو اپنی بہو بناؤں گی۔ ذہین، خوب صورت اور باصلاحیت لڑکی۔ یہ ماریہ کیا چیز ہے اس کے سامنے۔" فرحین نے ناگواری سے کہا۔ اشفاق گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تم ہیرے اور پتھر کا موازنہ کر رہی ہو۔ ماریہ کے گھر کے طور طریقے دیکھو اور اپنی بہن کے گھر کے طور طریقے دیکھو، زمین اور آسمان کا فرق ہے۔" اشفاق نے نرمی سے سمجھانا چاہا مگر فرحین کچھ بھی سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ اشفاق گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

فرحین نے ہارون کو بتائے بغیر اس کے رشتے کی بات اپنی بہن سے کی تو وہ خوشی سے کھل اٹھی کیونکہ ہارون جیسا رشتہ ملنا، آج کے دور میں بہت بڑی بات تھی۔ دونوں بہنوں میں سب معاملات فوراً طے ہو گئے۔ فرحین بہت خوش اور مطمئن تھی۔ وہ جلد از جلد ایک بڑے سے فنکشن میں ہارون اور شفق کا نکاح کر کے سب خاندان والوں کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔

ایک دن فرحین نے خوشی خوشی ہارون کو شفق کے ساتھ اس کے ہونے والے نکاح کے بارے میں بتایا تو ہارون سن کر حیران رہ گیا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" ہارون نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

"دیکھا، میرا بیٹا کتنا خوش ہوا ہے میرے انتخاب پر۔" فرحین نے فخریہ انداز میں اشفاق کو دیکھا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"واٹ مما! کیا میں آپ کو خوش نظر آرہا ہوں؟ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ پاپا نے آپ کو بتایا کیوں نہیں۔" ہارون کے کہنے پر فرحین چونکی۔

"کیا مطلب؟" فرحین نے حیرت سے پوچھا۔

"مما! میں ماریہ کو پسند کرتا ہوں اور میں پاپا کو یہ بات بتا چکا ہوں۔" ہارون نے دوٹوک انداز میں

کہا تو فرحین غصے سے بھر گئی۔

''ان لوگوں کے پاس ہے ہی کیا جو وہ ہمارا مقابلہ کریں۔ تم اس گھر سے لڑکی لاؤ گے؟'' فرحین نے حقارت سے کہا تو ہارون نے افسوس بھری نگاہ ماں پر ڈالی۔

''مما! آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ رشتوں میں مقابلہ کرنا ضروری ہے؟'' فرحین نے حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''مما! تایا اور تائی کے گھر میں کیا نہیں ہے؟ دنیا کی ہر سہولت، عزت، سکون، آپس میں سلوک، اعتماد، محبت، احساس......'' ہارون نے ایک ہی سانس میں کہا۔

''مما! میں آپ کو کیا کیا بتاؤں اب۔ آپ نے کبھی غور کیوں نہیں کیا کہ میں اپنے گھر کے عیش و آرام چھوڑ کر وہاں کیوں جاتا ہوں۔ اس لیے مما کہ جو ان کے پاس ہے اسے آپ پیسے سے نہیں خرید سکتے ہیں، بے لوث محبت اور خلوص۔''

ہارون نے نرمی سے کہا۔ فرحین حیرت سے گنگ اسے سن رہی تھی۔

''مما! میں نے دیکھا ہے کہ انھوں نے دادی اماں کی خدمت کتنے خلوص اور محبت سے کی۔ ان کی بیماری اور تکلیف سے کبھی گھبرائے نہیں! مما! آپ ایسی فیملی سے رشتہ لینے سے انکاری ہیں جن کی مٹی میں اتنی وفا اور محبت ہے۔ کیا آپ کو اپنے گھر اور آنے والے کل کے لیے اس وفا کی ضرورت نہیں پڑے گی! باقی آپ سوچ لیں۔ اگر اب بھی آپ کا انتخاب، آپ کی بھانجی ہے تو میں آپ کے فیصلے کا احترام کروں گا مگر آنے والے کل میں اس فیصلے کی ذمہ داری نہیں لوں گا۔'' ہارون نے سخت لہجے میں مستقبل کا ایک عکس دکھایا اور وہاں سے چلا گیا۔

اشفاق نے ہمدردی بھری نگاہ گم صم بیٹھی فرحین پر ڈالی تھی۔

☆☆☆

''میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے، کسی چیز کی کمی نہ ہو۔''

پچھلے کئی مہینوں سے فرحین اسی بات کو بار بار دہراتی بازاروں اور گھر میں گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ کام تھے کہ ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ اللہ اللہ کر کے شادی کا دن آ گیا۔ سارے انتظامات بہترین تھے۔ شادی کی ساری رسمیں بہت خوشی سے نبھائی گئی تھیں۔ رخصتی کا وقت آیا تو سب کے دل ایک دم ہی موم میں تبدیل ہو گئے۔ رخصتی کے وقت، دلہن جب روتے ہوئے اپنے والدین سے گلے ملی تو انھوں نے اس کے سر پر پیار دیا۔

''بیٹی! اپنے ساس سسر کو اپنے والدین کی طرح ہی سمجھ کر دل سے خدمت کرنا اور اپنے والدین کی تربیت اور بھروسے کا مان رکھنا۔''

حسن نے نرمی سے بیٹی کے ماتھے پر پیار دیا تو اشفاق نے آگے بڑھ کر بھائی کو گلے سے لگا لیا۔

''وہ ایک باپ سے دوسرے باپ کے گھر جا رہی ہے، فکر مت کرو۔'' اشفاق نے یقین دلایا اور فرحین کی طرف دیکھا جو اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے، امبر کو دلاسا دینے لگی۔

ماریہ کو پوری شان و شوکت کے ساتھ رخصت کروا کے اپنے گھر لے جاتے ہوئے، فرحین بہت مطمئن تھی۔ ہارون نے فیصلے کا اختیار اسے دے کر معتبر کر دیا تھا۔ اس دن فرحین کو ہارون کی کہی ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ......

''جس گھر میں بزرگوں اور بڑوں کا احترام اور خدمت کی جاتی ہے، اس زمین کی مٹی میں اتنی خیر ہوتی ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کو سنوار دیتی ہے۔''

اور ہمیشہ کی طرح نفع نقصان کو دیکھنے والی فرحین نے، اپنے آنے والے کل کے لیے نفع کا سودا ہی کیا تھا۔

حمیرا شفیع

سال نو کا تحفہ

"ذرا سنیے!" بیگم نے چائے کی پیالی سائیڈ ٹیبل پر دھری اور نہایت شیریں لہجے میں اپنے صاحب بہادر کو پکارا جو کہ بری طرح سے اپنے موبائل میں غرق تھے۔ موصوف کے کان چونکہ ایک چیختے چلاتے اور اکھڑ لہجے کے عادی تھے۔ اس لیے اتنی نرم اور شہد آگیں آواز سن نہ پائے جس کا موقع شاذونادر ہی آتا تھا۔ وہ مسلسل موبائل میں ہی گم رہے۔

ان کی اس قدر بے توجہی پر بیگم کے اندر غصے کا اُبال سا اٹھا اور جی چاہا کہ تمام لحاظ سمیٹ کر ایک طرف رکھیں اور واپس اپنی جون میں لوٹ آئیں مگر پھر بامشکل خود پر قابو پایا اور ایک دفعہ پھر میٹھے لہجے میں پکارا۔

"ذرا بات تو سنیں! میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔" ساتھ ہی ان کا شانہ بھی ہلایا۔ اب کی بار شوہر صاحب نے بدقت موبائل سے نظریں اٹھائیں اور کچھ اچنبھے سے بیوی کو دیکھا۔ بیگم تو وہی پرانی والی تھیں مگر لب ولہجہ یکسر بدلا بدلا سا تھا۔ دماغ میں کہیں گھنٹی سی بجی۔ فوراً خود کو سنبھالا اور کچھ بارعب آواز میں بولے۔

"کیا بات ہے؟ بیگم صاحبہ! خیریت ہے......!"

"جی ہاں! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے سب خیریت ہے۔" وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ دسمبر ختم ہونے میں بامشکل ہفتہ رہ گیا ہے۔ خیر سے نئے سال کی آمد آمد ہے۔" ان کی عادت تھی کہ اصل بات بتانے سے پہلے لمبی تمہید باندھتی تھیں۔ اس لیے وہ سیدھے ہو کر بیٹھے اور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"تو پھر...... کوئی نئی خبر......؟"

"وہ دراصل بڑی بھابھی صاحبہ کا فون آیا تھا۔ نئے سال کی خوشی میں اپنے گھر پارٹی رکھی ہے۔ خاندان بھر کی خواتین کو مدعو کیا ہے۔" وہ دبے دبے جوش سے بتانے لگیں۔

"کیا کہا...... نئے سال کی خوشی میں پارٹی...... واہ بھئی! لگتا ہے، بھابھی صاحبہ کو بھی نئے زمانے کی ہوا لگ گئی ہے......" وہ حیرت سے مسکرا کر بولے۔

"جی ہاں! میں بھی حیران ہوں کہ آپ کی کفایت شعار بھابھی صاحبہ کو یہ کیا سوجھی۔" (وہ کفایت شعار کے بجائے کنجوس کہنا چاہ رہی تھیں مگر شوہر کے سامنے خود کو باز رکھا)

"اب انہوں نے اتنے پیار سے بلایا ہے تو جانا پڑے گا۔ وہ بھی تو اتنی مصروفیت کے باوجود ہر خوشی غمی میں شریک ہوتی ہیں۔ پھر کوئی تحفہ وغیرہ بھی۔"

"دیکھو بیگم! کوئی خرچے والی بات نہ کرنا۔ آپ کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ مجھے ہر ماہ کی پانچ تاریخ کے بعد تنخواہ ملتی ہے۔" وہ ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولے۔

"لیکن دعوت میں خالی ہاتھ کون جاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو دینا دلانا پڑتا ہے......!" وہ بھی الجھ گئیں۔

"مگر بیگم صاحبہ! کہا تو ہے کہ میری تنخواہ تو پانچ تاریخ کے بعد......"

"ارے بھاڑ میں جائے آپ کی تنخواہ...... آپ کی تنخواہ کو کون پوچھ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مہینے کے آخر میں آپ کتنے قلاش ہوتے ہیں۔ میں نے کچھ اپنے ذاتی پیسے جمع کرر کھے ہیں۔ آپ سے تو

صرف تحفے کے بارے میں مشورہ کرنا چاہ رہی تھی۔"
انہوں نے ہر قسم کی مروت کو بالائے طاق رکھا اور اپنی اصلیت پر آتے ہوئے کھری کھری سنا دیں۔ پھر تن فن کرتی ہوئی اٹھیں اور کچن میں جا کر سنک میں پٹخ پٹخ کر برتن رکھنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد شوہر صاحب بھی شرمندہ شرمندہ سے اندر داخل ہوئے وہ بے نیاز بنی کام میں مشغول رہیں۔

"سنو! یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ اپنی بچت میں ملا کر کوئی تحفہ خرید لینا۔ مجھے بھلا عورتوں کی شاپنگ کا کیا خاک پتا ہے۔" انہوں نے شیلف پر پیسے دھرے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی وہ کھل کر مسکرا دیں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی تھی۔

اگر وہ براہ راست ان سے پیسے مانگتیں تو شاید ایک دھیلا بھی نصیب نہ ہوتا۔

☆☆☆

بڑی بھابھی صاحبہ بھی عجیب وغریب اور من موجی شخصیت کی مالک تھیں۔ کچھ کنجوس فطرت بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ تمام دیورانیاں سیل سے کئی جوڑے خریدتیں جبکہ وہ پوری قیمت پر ہی ہر سیزن کے فقط چار جوڑے بناتیں۔ دو گھر کے استعمال کے لیے اور دو کہیں آنے جانے کے واسطے...... جیولری کے نام پر بھی برسوں سے ایک ہی لاکٹ جھول رہا تھا گلے میں' جو غالباً بھائی صاحب نے ہی انہیں منہ دکھائی میں دیا تھا۔

کھانے کا مینیو بھی عجب سادہ سا بناتیں۔ ہفتے میں چار دن سبزی، ایک دن کوئی سی دال اور جمعے کے جمعے گوشت وہ بھی شوربے والا۔ اس دوران اگر کوئی مہمان آ ٹپکتا تو کٹوری بھر کر بھنے گوشت کو الگ کر لیتیں اور باقی گھر والے بغیر چوں چرا کیے شوربے سے ہی لطف اندوز ہوتے۔ اس قسم کی شخصیت کی طرف سے نئے سال کی خوشی میں دعوت تو اچھی خاصی حیران کن بات تھی سو تھی مگر تحفے کا انتخاب زیادہ بڑا مسئلہ تھا۔ کپڑوں جوتوں کی شوقین وہ نہیں۔ ہر قسم کا رسالہ، کتاب خود ان کے گھر میں آتی تھی۔ اب آخر ان کو کیا دیا جائے۔ کچن کا کوئی آئٹم یا پھر گھر کی سجاوٹ کی کوئی چیز...... وہ اسی ادھیڑ بُن میں تھیں، ایسے میں صفیہ چلی آئی۔ وہ پچھلے تین دن سے غائب تھی۔ اسے دیکھ کر بے حد غصہ آیا۔

''ارے کہاں غائب تھیں تم......؟ دیکھو ذرا! سارا گھر کتنا گندا ہو رہا ہے۔'' تحفے کے انتخاب کی ساری جھنجلاہٹ اس پر اتاری۔

''باجی! بڑی پریشان ہوں...... ہفتے کے روز کمرے کی چھت گر گئی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میں کام پر تھی اور بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ اس لیے بچت ہوگئی۔ مگر اندر کا سارا سامان ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اب تین دن سے اتنی سردی میں برآمدے میں پڑے ہیں۔ اس کی چھت بھی خستہ حال ہے۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ ان کو بھی بہت دکھ ہوا۔

''مگر پرسوں تو تم کو گڈو نے بڑی بھابھی کے ہاں دیکھا تھا۔ ہمارے ہاں تو نہیں آئی تھیں تم......؟'' ان کو اچانک یاد آیا۔

''جی باجی...... میں نے ان کا بھی کام نہیں کیا تھا۔ صرف بتانے گئی تھی۔ جلدی میں تھی۔ اس لیے آپ کے ہاں نہیں آ سکی۔ چھوٹے کو بھی بخار تھا۔'' وہ جلدی جلدی وضاحت دینے لگی۔ وہ کوئی پتھر دل تو تھیں نہیں ان کو بہت ترس آیا مگر کیا کرتیں۔ یہ کوئی دو چار سو کا معاملہ تو نہیں تھا کہ وہ فوراً اس کے ہاتھ میں تھما دیتیں۔ ہزاروں کا خرچا تھا۔ آج کل مہینے کے آخر میں ان کا اپنا بھی ہاتھ تنگ تھا۔ پھر اوپر سے اب یہ بھابھی صاحبہ کی دعوت اور تحفہ کا گھڑاک...... خیر انہوں نے صفیہ کو تسلی دی کہ وہ کچھ دن تک تھوڑے بہت پیسوں کا انتظام کر دیں گی۔

صفیہ گئی تو چھوٹی دیورانی فائزہ چلی آئی۔ اسے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئیں۔ ''ارے فائزہ! بہت اچھا ہوا جو تم خود ہی آ گئیں۔ میں تمہیں ہی فون کرنے والی تھی۔''

''کیوں......؟ خیریت تھی بھابھی جان؟'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''وہ دراصل بڑی بھابھی صاحبہ نے دعوت میں بلایا ہے۔ تمہیں بھی تو بلایا ہوگا۔ تحفے کے بارے میں مشورہ کرنا تھا۔ کیا سوچا ہے......؟'' وہ اس کے سامنے دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کچھ رازداری سے بولیں۔

''جی ہاں بھابھی جان نے بلایا تو ہے مگر تحفہ لینے پر تو وہ شاید رضامند نہیں ہیں۔'' فائزہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ چونک گئیں اور کرسی کو مزید اس کے قریب سرکاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟ تحفہ لینے پر رضامند نہیں! وہ کیوں بھئی؟''

''وہ دراصل بھابھی جان! آپ جانتی تو ہیں کہ میں اور عاتکہ (اس سے چھوٹی دیورانی) ان کے ساتھ والے پورشن میں رہتے ہیں۔ ہر وقت کا آنا جانا ہے۔

بے تکلفی بھی کافی ہے۔ اس لیے ہم نے براہ راست ان سے ہی پوچھ لیا تھا کہ وہ کیا پسند کریں گی۔ پہلے تو انہوں نے رسمی سا انکار کیا پھر کہنے لگیں کہ اگر تم لوگ زیادہ پرجوش ہو تو نقد رقم دے دینا میں اپنے حساب کتاب سے خود لے لوں گی......!''

''ہیں......؟ کیا؟ یہ بھابھی جان نے کہا۔'' حیرت کی زیادتی سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ آواز بھی پھنسی پھنسی سی نکلی۔ ''کیا خود اپنے منہ سے پیسوں کا کہا......؟'' ان سے تو فائزہ کی بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''جی ہاں...... نہ صرف ہم سے کہا بلکہ شازیہ باجی اور ثمرین باجی (نندیں) سے بھی نقد رقم کا ہی کہہ دیا جوان کو زبردستی مارکیٹ لے جانا چاہ رہی تھیں تاکہ وہ اپنی پسند سے اپنے لیے شاپنگ کر لیں۔''

''تحفے کی جگہ نقد رقم کی فرمائش......وہ بھی خود اپنے منہ سے۔'' ان کی تو حیرت ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ بھابھی جیسی سنجیدہ مزاج خاتون سے اس بچکانہ رویے کی توقع نہ تھی۔

''چھوڑیں بھابھی جان! ایک طرح سے انہوں نے اچھا ہی کیا۔ ہمیں مفت کی خواری سے بچا لیا۔ ہم جو خریدتے ہو سکتا ہے وہ ان کے کسی کام نہ آتا۔ اب وہ اپنی پسند سے اپنے لیے کوئی کارآمد چیز لے آئیں گی۔'' فائزہ نے انہیں افسوس اور حیرت کی اس کیفیت سے نکالا۔

☆☆☆

نئے جذبوں اور نئی امنگوں کے ساتھ یکم جنوری 2020ء کی صبح طلوع ہوئی۔ نماز فجر کے بعد انہوں نے گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹائے۔ پھر اپنا بہترین جوڑا زیب تن کیا۔ پیسوں کا لفافہ پرس میں ڈالا اور بھابھی صاحبہ کے گھر جا پہنچیں۔ خاندان بھر کی خواتین جمع تھیں۔ خوب رونق میلے کا سماں تھا۔ اشتہا انگیز کھانے کی خوشبو سارے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ کسی خاتون کے ہاتھ میں گفٹ پیک نہ تھا۔ غالباً سب تک ان کا پیغام پہنچ گیا تھا۔ سب ان کی طرح پرس میں لفافے رکھ کر لائے تھے۔

خوش گوار ماحول میں کھانا پینا ہوا۔ بھابھی صاحبہ نہایت پیار سے ملیں۔ انفرادی طور پر ہر ایک کا حال احوال پوچھا۔ محبت سے گلے لگایا۔ یونہی ہنستے کھیلتے محفل اختتام پذیر ہوئی۔

کچھ دن کی غیر حاضری کے بعد صفیہ دوبارہ کام پر آئی تو انہوں نے اس کی پریشانی کے خیال سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ جب وہ جانے لگی تو انہوں نے اسے کچھ رقم دینا چاہی تو وہ بولی۔

''بس باجی! رہنے دیں۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اللہ کے کسی نیک بندے نے کمرے کی چھت ڈلوادی تھی اور برآمدے کی چھت بھی مضبوط کروادی تھی۔'' وہ خوش تھی۔

''کوئی بات نہیں۔ میں نے یہ پیسے تمہارے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ راشن وغیرہ خرید لینا۔'' انہوں نے پیسے اس کی مٹھی میں دبا دیے۔

رات کو جب وہ دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئیں تو شوہر صاحب، بڑے بھائی جان سے فون پر بات کر رہے تھے۔

''بھائی جان! مہنگائی بہت ہوگئی ہے۔ ٹھیکیدار نے تو 50 ہزار تک تخمینہ لگایا تھا مگر 70 تک پہنچ گیا۔ 40 تک تو آپ کا منشی دے گیا تھا باقی 30 کا انتظام بھابھی صاحبہ نے کر دیا تھا۔ آج سارا بل کلیئر ہو گیا ہے۔''

ان کے قدم دروازے پر ہی جم گئے۔ بھابھی صاحبہ کے نام پر وہ چونک گئیں۔ یقیناً بات صفیہ کے گھر کی ہو رہی تھی جو کہ سب کی مشترکہ ملازمہ تھی۔ پھر وہ آناً فاناً سارا معاملہ سمجھ گئیں کہ بھابھی صاحبہ نے نقد رقم کا مطالبہ کیوں کیا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا وہ بھی یقیناً انجانے میں ایک نیکی کا حصہ بن چکی تھیں۔ یہ سوچ کر ایک خوب صورت مسکراہٹ ان کے چہرے پر آگئی۔

ناولٹ

سورج سوا نیزے پہ چڑھ آیا تھا۔ گھر میں معمول کی چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ برآمدے میں اماں کا تخت بچھا تھا۔ بھاوجیں ابھی ناشتے سے فراغت کے بعد اپنے اپنے کمروں کا پھیلاوا سمیٹ رہی تھیں۔

چھوٹے بچوں کی ریں ریں جاری تھی۔ جو بچے کچھ بڑے تھے، وہ اسکول جا چکے تھے۔

کام والی ماسی نے آ کر جھاڑو اٹھائی تو زویا نے اپنے اور مہرو کے مشترکہ کمرے کا پھیلاوا سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔

مہرو نے بے دلی سے چادر کھسکائی۔

"کیا شور مچا رکھا ہے، آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔"

"میں تو بولی بھی نہیں۔" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں تو تمہارے جو جوتے کی ٹک ٹک ہے، کتنی بار کہا ہے اسے باہر اتار کر آیا کرو، دماغ میں ہتھوڑے کی طرح بجتی ہے۔"

"آم آ گئے ڈھائی سو کے تین کلو، ڈھائی سو کے تین کلو، میٹھے اور رسیلے آم جو ایک بار کھائے وہ بار بار آئے۔" باہر سے ریڑھی والا آواز لگا رہا تھا۔

"ایک تو اس کا ٹیپ ریکارڈر۔" دانت پیستے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر کیچر لگایا۔

"جاؤ، ناشتہ بنا کر لاؤ۔" اگلا حکم زویا کے لیے تھا۔

"ابھی سارے برتن سمیٹ کر کچن صاف کر

سمیرا عثمان گل

کے آئی ہوں۔" وہ چادریں تہہ کرنے لگی۔ مہرو نے اس کی پشت کو گھورا۔

"تم نے کیوں سمیٹا کچن، وہ مہارانیاں کیا کر رہی تھیں۔" اشارہ بھاوجوں کی سمت تھا۔

"بچے ہیں ان کے چھوٹے اور صبح صبح تو بچوں کے کام ہی ختم نہیں ہوتے۔"

"ان کے لیے بڑی ہمدردیاں اُمڈ رہی ہیں اور میرے لیے ایک پراٹھا بناتے ہوئے باتیں سنا رہی ہو۔" حسبِ معمول اس نے منہ پھلا لیا تھا۔ زویا نے چادر وہیں رکھ دی۔

”اچھا لاتی ہوں۔“ وہ کہہ کر کچن میں چلی گئی مہرو نے وہیں بیٹھے بیٹھے دو، چار لمبی لمبی جمائیاں لیں اور سیل فون نکال کر چیک کیا۔
عماد کا میسج تھا ”گڈ مارننگ۔“
”اس بندے کو بھی نا ذرا رومانس جھاڑنا نہیں آتا، اماں نے بھی کس زاہد خشک کے پلے باندھ دیا شکل وصورت کا اچھا ہے مگر ذرا جو ہیرو والی صفات پر پورا اترے۔“
وہاں سے ہٹ کر سوشل میڈیا کا چکر لگایا۔
دو، چار اوٹ پٹانگ پوسٹیں جھاڑیں، اتنے میں خستہ گرم پراٹھا، آملیٹ اور چائے آ گئی۔
”اچھا زویا! کمرہ بعد میں سمیٹنا، پہلے ذرا وہ میرا کیمل براؤن سوٹ استری کردو اور ذرا یہ فون چارج پہ لگانا۔“ وہ ایسی ہی تھی کاہل، سست، کام چور۔
کبھی تو زویا کو غصہ آتا۔ کبھی چڑ جاتی لیکن پھر کیا کرتی۔ مہرو کے بغیر اس کا گزارا بھی تو نہیں تھا۔
”کال آ رہی ہے۔“ زویا نے چارج لگاتے ہوئے اطلاع دی۔
”رہنے دو، رات گیارہ بجے تک میرا دماغ کھایا ہے اس بندے نے۔“ یہ خیال آرائی منگیتر کے لیے تھی۔
چند روز قبل ہی اس کی منگنی ہوئی تھی۔
دو ہی بھائی تھے۔ لڑکا باہر ٹیکسی چلاتا تھا۔ شریف، خاندانی لوگ تھے۔ اماں نے رسمی سا وقت لے کر منگنی کر دی تھی۔
پھر لڑکے نے فون پہ بات کرنے کی درخواست کی تو اماں نے کہہ دیا تھا۔
”کرلیا کرو بات، لڑکے کو قابو کرلوگی تو آگے تمہارا ہی راج ہوگا۔“ اور اس نے گویا اماں کی بات پلے سے باندھ لی تھی۔
”آج کالج چلیں گے فارم سب مٹ کروانے ہیں۔“ وہ موبائل چارج پہ لگا کر اس کے پاس آ بیٹھی۔
”کیا ضرورت ہے کالج میں ایڈمشن لینے کی، اوپن یونیورسٹی سے کرتے ہیں بی اے۔“
”مجھے بی ایس آنرز کرنا ہے اور یونیورسٹی سے ہی کرنا ہے تمہیں شوق ہے تو کرو۔ بی اے، میں تمہاری یہ بات کبھی نہیں مانوں گی۔“ وہ اٹھ کر اماں کے پاس چلی گئی۔ دوسرا موبائل اماں کے پاس تھا اسے اپنی سہیلی سے بات کرنی تھی۔
”اماں! اس نے کیا کرنا ہے کالج جا کر۔ سارا دن لڑکیاں وہاں آوارہ گردی کرتی ہیں۔ جب گھر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں تو فضول میں ان خواریوں میں کیوں پڑیں۔“ وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی اور اب اماں کو خوب بھڑکا رہی تھی۔ زویا کو غصہ آ رہا تھا بس نہیں چل رہا تھا کہ مہرو کا کیا حشر کر ڈالے۔ وہ ہمیشہ اس کے ہر کام میں ٹانگ اڑاتی تھی۔
اسے منہ پر کوئی کریم نہیں لگانے دیتی تھی، بلیچ نہیں کرنے دیتی تھی، لپ اسٹک نہیں لگانے دیتی تھی۔ محلے میں سہیلیوں کے گھر نہیں جانے دیتی تھی اور اب اسے کالج میں ایڈمیشن لینا تھا تو یہاں بھی پھڈا ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔
”اماں! مجھے جو مضمون پڑھنے ہیں۔ وہ گھر بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتی۔“
”اور بالفرض ہو گیا تو جاؤ گی کس کے ساتھ۔“
”وین میں جاؤں گی۔“
”وین تمہیں گھر سے لینے آئے گی۔“ مہرو نے طنز کیا۔
”میں وین کو اسٹاپ سے لے لوں گی۔“
”دیکھا اماں! یہ اکیلی اسٹاپ تک جایا کرے گی۔“
”زویا! مہرو ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا ہم نے کیا کرنا ہے اتنی پڑھائیاں کر کے گھر بیٹھ کر ہی پڑھ لو۔“
اماں نے لب کشائی کی اور زویا نے رونا دھونا شروع کر دیا۔
”آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتی آئی ہیں، وہی آپ کی بیٹی ہے میں تو جیسے کچھ لگتی ہی نہیں، بچپن سے ہی میرے ساتھ ناانصافیاں ہوتی آ رہی ہیں۔ ہمیشہ اس کی اترن، کپڑے اور جوتے پہناتی تھیں آپ مجھے۔ اب جو اس نے پڑھا ہے، وہی میں بھی پڑھوں۔“ روٹھ کر اس نے کمرہ بند کر لیا تھا۔
”اے مہرو! جاؤ کروا دو اس کا کالج میں داخلہ۔“ اماں کا دل بس اتنے میں ہی پسیج گیا تھا۔

''ہمیشہ آپ اس کی ایموشنل بلیک میلنگ میں آجاتی ہیں۔'' مہرو اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

خود تو اسے پڑھنے کا شوق تھا نہیں، پہلے بھی چار سال میٹرک میں لگا دیے تھے۔ ایف اے زویا کے ساتھ بیٹھ کر کر لیا۔ اب بی اے میں وہ راہیں الگ کر رہی تھی اور پھر اتنی اچھی ڈگری زویا کو کیوں لگتی بھلا۔

زویا نے اوپن یونیورسٹی کے فارم پھاڑ دیے دو چار روز وہ ہنگامہ مچا کہ الاامان۔

لیکن زویا کے مزے ہو گئے تھے۔ اماں نے اجازت دے دی تھی۔ ایک دن کی بھوک ہڑتال کے بعد اب مزے سے اماں کے ہاتھ کا کھانا کھایا تھا۔ رات دیر تک سدرہ سے فون پہ بات کی تھی۔ کانوں میں ہینڈ فری لگا کر ریڈیو سنا تھا۔

اور مہرو کو اس کی یہ ساری تپانے والی حرکتیں زہر لگ رہی تھیں۔ یہ پہلی بار تھا جب زویا نے اس سے بات نہیں کی تھی اور اگلے روز اسے خود زویا کی منتیں کرنا پڑی تھیں۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں حماد آیا بیٹھا تھا۔

''چلو اٹھو ابھی۔'' وہ سر پہ کھڑی تھی زویا نے کانوں میں ہینڈ زفری لگا رکھی تھی حالانکہ وہ سب سن رہی تھی۔

اماں اس وقت گھر پہ نہیں تھیں۔ بھابیاں اپنے بچوں میں مصروف تھیں اور اسے حماد کو کمپنی دینا پڑی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی ہونے والی بھابی سے ہی تو ملنے آیا تھا مگر اس کا مطالبہ سن کر مہرو سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس کا زویا کو منہ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اب......

''اف کیسے رف سے لگ رہے ہیں ہاتھ۔'' جلدی سے پہلے ہاتھوں پہ تنقید کی اور اب زویا کے روبرو کھڑی تھی۔

اور ارادہ زویا کا بھی اس کو منہ لگانے کا نہیں تھا۔

''تم مہندی لگا رہی ہو کہ نہیں۔'' مہرو نے اس کے ہینڈ زفری کھینچے۔

''کیوں تمہیں آج مایوں بیٹھنا ہے۔''

''وہ حماد آیا ہے۔ منگنی تو ہوئی نہیں تھی۔ بس اس کی ماں آ کر انگوٹھی پہنا گئی۔ اب عماد کہہ رہا ہے کہ انگوٹھی پہن کر اپنے ہاتھ کی تصویر بنا کر بھیجو۔ اس لیے اٹھو اور ڈرائنگ روم میں چل کر مجھے مہندی لگا دو ذرا ہاتھ خوب صورت تو لگنا چاہیے نا۔''

اب وہ اسے ہاتھوں سے پکڑ کر کھینچ رہی تھی گویا زویا کا انکار اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اب اسے مہندی لگوا کر ہی دم لینا تھا تو کیوں نہ زویا بھی اپنی بات منوا لیتی۔

''ایک شرط پر۔''

''کسی کاروبار میں شراکت نہیں کرنی جو تمہاری شرطیں مانوں۔''

''تو ٹھیک ہے پھر کسی اور سے لگوا لو۔'' وہ ہاتھ چھڑا کر واپس بیٹھ گئی۔

''چھوٹو۔'' دانت پیستے ہوئے مہرو نے گھورا۔

''پیار سے پوچھو۔'' اس کا انداز محظوظانہ تھا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھا حماد بلاوجہ مسکرایا تھا کیونکہ ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے میں ہونے والی محاذ آرائی وہ باآسانی سماعت فرما رہا تھا۔

''تیری تو۔'' وہ جھاڑ کر اس کے پیچھے لپکی۔

''میرے ساتھ کالج چلو گی۔''

مہرو نے اسے اتنا گھورا جتنا گھور سکتی تھی۔

''اچھا یہیں لگوا لو مہندی، وہاں حماد بیٹھا ہے۔'' اب کے وہ آواز دبا کر بولی۔

''تو اسے کمپنی کون دے گا۔ اماں بھی گھر پہ نہیں اور بھابیوں کے بوتھے ہی سیدھے نہیں ہوتے اور وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا، میں ہوں نا ساتھ۔'' اب کی بار مہرو اسے گھسیٹنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''یہ کیا تاج محل مینارے بنا رہی ہو۔'' زویا نے ابھی ڈیزائن شروع ہی کیا تھا کہ وہ چلا اٹھی۔

''تو اور کیا بناؤں۔''

''ان چراغوں اور موم بتیوں کے سوا اور کچھ نہیں بنا سکتیں۔'' وہ اٹھ کر ہاتھ دھونے جا چکی تھی۔ زویا کا چہرہ خفت کے مارے سرخ ہو گیا۔ اسے اس بدتمیز کو مہندی لگانی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اس پر حماد کی پرشوق نگاہیں تھیں جو مسلسل اسے پریشان کیے جا رہی تھیں۔

''میرے پاس سیل فون ہے۔ آپ وہاں سے ڈیزائن گوگل کر لیں۔'' کہا تو اس نے زویا سے تھا مگر مہرو نے بیچ سے ہی موبائل اچک لیا۔

''اتنی دیر سے گھنے میسنے بن کر کیوں بیٹھے تھے۔ اف دیکھو تو کتنے زبردست ڈیزائن ہیں۔'' ایک ڈیزائن منتخب کر کے اس نے جونہی نشست سنبھالی زویا نے نچی آواز میں دانت پیسے۔

''اب اگر تم ہاتھ دھو کر آئیں تو دوبارہ نہیں لگاؤں گی۔''

''بیوٹی کیم سے پک لینا۔'' اب کی بار اس کا مخاطب حماد تھا۔

''میں اپنے بھائی کو یہ دھوکا کیوں دوں۔''

''اچھا تو یہ دھوکا ہے؟ چلو خوب صورت دھوکا کھانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

حماد اب اس کے ہاتھوں کی تصویریں لے رہا تھا اور ذرا سا کیمرہ اوپر کر کے بڑے محتاط انداز میں اس نے زویا کی تصویر بھی لے لی تھی۔

☆☆☆

واپس گھر آتے ہوئے وہ بے حد خوش تھا۔ اتنے دنوں کی بے قراری کو کچھ قرار آیا تھا۔ راستے میں اس نے گاڑی روکی اور نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گیا جیب سے سیل فون نکالا۔

خوب صورت، معصوم، سادہ حسین چہرہ سامنے تھا۔

وہ اسے دیکھتا رہا اور لب خود بخود مسکراتے رہے۔

''خیال یار اتنا حسین ہے تو وصال یار کیا ہوگا۔'' کسی نے اس کے کاندھے پر دھپ رسید کی تھی۔ وہ احمد تھا اس کا اکلوتا دوست۔

حماد نے بوکھلاتے ہوئے جلدی سے موبائل پاکٹ میں رکھا۔

''کون ہے یہ مہ جبین۔'' اس نے حماد کے گرد بازو پھیلایا۔

''کوئی نہیں۔'' وہ جھینپ گیا۔

''ارے تم تو لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔'' وہ ہنسنے لگا تھا۔

''اچھا ای انتظار کر رہی ہوں گی، میں چلتا ہوں۔ شام میں ملیں گے۔'' وہ جان چھڑا کر اٹھ آیا۔

کیسی بے اختیاری حرکت اس سے سرزد ہوئی تھی۔

اب احمد میرے سیل فون کی جان نہیں چھوڑے گا۔

دو ہی راستے ہیں یا تصویر ڈیلیٹ کر دوں یا اسے بتا دوں۔

وہ شام تک فکرمند ہی رہا۔ اب کرے تو کیا کرے۔

''چلو عماد کو تصویریں سینڈ کرتا ہوں، وہ خوش ہوگا۔'' یہ سوچ کر سیل فون نکالا اور وہ چھم سے اسکرین میں اتر آئی تھی۔

اسے بے ساختہ وہ دن یاد آیا جب وہ لوگ عماد کے رشتے کے لیے مہرو بھابی کے گھر گئے تھے۔ عماد بھی ساتھ ہی آیا تھا لیکن وہ گاڑی میں تھا۔ اندر وہ، امی اور رشتے والے انکل ہی گئے تھے۔

صحن عبور کرتے ہی اس کی نگاہ برآمدے میں کھڑی ایک لڑکی سے ٹکرائی تھی جو گود میں چھوٹے بچے کو اٹھائے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی اور بچہ تھا کہ خوب بھاں بھاں کر کے رو رہا تھا۔

حماد کو وہ اتنی پیاری، معصوم سی لگی کہ وہ بے ساختہ دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ جس لڑکی کو دیکھنے آئے ہیں وہ یہ نہ ہو۔ کتنی ہی دیر گزر گئی تھی اور لڑکی آ نہیں رہی تھی اور اس کی جان سولی پہ ٹنگی ہوئی تھی۔

اندر مہرو، اماں سے کہہ رہی تھی۔

''میں کیوں جاؤں ان کے سامنے، آپ میری تصویر لے جا کر دکھا دیں۔''

''یہ کیا بے تکی ہانک رہی ہو۔'' اماں کو ہول اٹھنے لگے۔

''ہاں تو ہم لڑکیاں کیا شوکیس میں سجی گڑیا ہیں کہ لاٹ صاحب کو پسند آئیں گی تو ٹھیک ورنہ

ریجیکٹ، اوہو بڑے آئے ریجیکٹ کرنے والے۔
میں نے خود کھڑکی سے دیکھا ہے باہر گاڑی میں آئے بیٹھے ہیں دیکھنا ان کی اماں کسی بہانے سے ان کو بھی بلوائیں گی کہ آ کر لڑکی پسند کر لو۔ لڑکی نہ ہوئی کوئی بیل گائے ہو گئی۔"
اصل میں اس نے لڑکے کو دیکھ لیا تھا اور لڑکا اسے پسند آ چکا تھا اب اگر وہ اسے پسند نہ آتی تو کیسی سبکی ہوتی۔
"گائے تو سمجھ میں آ رہی ہے لیکن بیل کیسے۔" زویا کو شگوفے سوجھ رہے تھے۔
"اتنی پیاری لڑکی کو بھی کوئی ناپسند کر سکتا ہے وہم نہ پالو اور آ جاؤ۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔" بڑی بھائی نے پیار سے سمجھایا تو وہ اٹھ گئی تھی۔
لڑکی نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا اور حماد کی سانسیں بحال ہوئیں۔ ایک ساتھ اس نے تین گلاس پانی کے چڑھا لیے تھے۔
عماد کو مہرو پسند تھی۔ ایک ہفتے بعد وہ واپس چلا گیا۔ امی نے جا کر انگوٹھی پہنا دی تھی اور حماد اس روز سے دوبارہ جانے کے بہانے تلاش رہا تھا بہت سوچ و بچار کے بعد اسے یہی آئیڈیا ذہن میں آیا اور وہ چلا گیا تھا۔
اور اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔
کل انہیں کالج جانا تھا۔
☆☆☆
وہ فارم سب مٹ کروا کر باہر نکلی تو مہرو کو ایک دم سے بھوک لگ گئی تھی۔ اصل میں وہ زویا کی ساری پاکٹ منی اپنے لنچ میں اڑانا چاہ رہی تھی۔
زویا نے کسی ٹیکسی کے انتظار میں ادھر ادھر دیکھا۔
"چھوڑو ٹیکسی کو۔ چنگ چی میں چلتے ہیں۔"
"کیوں۔" زویا نے سرتاپا اسے گھورا۔
"زمانہ بہت خراب ہے اور ویسے بھی وہ جس اسٹاپ پہ رکے گا اس کے سامنے نیا ہوٹل کھلا ہے اور مجھے لنچ کرنا ہے بہت بھوک لگ رہی ہے۔" مسکین صورت بنائی۔
"اور جو صبح دو پراٹھے ٹھونس کر آئی ہو۔"
"وہ تو کب کے ہضم ہو چکے۔"
"السلام علیکم۔" وہ اپنی ہی باتوں میں ابھی ہوئی تھیں جب ایک گاڑی ان کے قریب آ کر رکی اور پھر چہرہ بھی نمودار ہو گیا۔
"حماد! تم یہاں کیا کر رہے ہو۔" مہرو کو دلی مسرت ہوئی تھی۔
"بس گزر رہا تھا، اچانک آپ لوگوں پر نگاہ پڑ گئی۔" اب کیا بتاتا کہ وہ تو صبح سے خوار ہو رہا ہے۔
"آئیں۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" مخلصانہ سی آفر۔
"نہیں اٹس اوکے۔ ہم چلے جائیں گے۔" یہ زویا تھی۔
"ایسے کیسے چلے جائیں گے۔ بیٹھو گاڑی میں، وہ کوئی غیر تھوڑی ہے۔" تیکھی نظروں سے زویا کو گھورتے ہوئے اب وہ اس کا بھی ہاتھ کھینچ چکی تھی۔
اور حماد نے اس کے بیٹھتے ہی بڑی مہارت سے بیک ویو مرر اس پہ سیٹ کر لیا تھا۔
کچھ دیر کے لیے گاڑی میں عجیب معنی خیز سی خاموشی چھا گئی مگر وہ جو بھی افلاطون جسے دعوا تھا کہ اڑتی چڑیا کے پر بھی گن لیتی ہوں۔
دونوں بازو اگلی سیٹ کی بیک پہ جماتے ہوئے بولی۔
"مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ دو دل مل رہے ہیں مگر چپکے چپکے۔" مہرو جیسی منہ پھٹ سے یہی امید کی جا سکتی تھی۔ حماد کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا جبکہ زویا کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ دبا دبا سا چیخی تھی۔
"خیر ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اگر اچھا سا لنچ کروا دو تو۔" وہ مزید پھیل رہی تھی۔ حماد کے تو دل کی مراد بر آئی تھی۔
اس نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے

پارک کی تھی۔

زویا کو اس پہ خوب غصہ آ رہا تھا۔

"ویسے میں نے تو ہوا میں تیر چلایا تھا، اب کیا معلوم تھا کہ نشانے پہ جا لگے گا۔ لڑکا برا نہیں، اچھا خاصا ہینڈسم ہے۔" گھر آ کر بھی وہ اس کے کانوں میں گھسی ہوئی تھی۔

"بھول ہے تمہاری، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"کیوں نہیں ہو گا۔" مہرو نے آنکھیں مٹکائیں۔

"میری مرضی۔" کیا شان بے نیازی تھی۔

☆☆☆

مہرو کا تو منہ بند کر دیا تھا لیکن خود پریشان ہو چکی تھی۔ اس روز بھی حماد نے سیل فون سے اس کی تصویر اتاری تھی۔ وہ اتنی بھی بے خبر نہیں تھی اور آج بھی بیک ڈیو مرر اس پہ سیٹ کر رکھا تھا۔

اور سب سے بڑی بات مہرو کی نوک جھونک کو اتنا انجوائے کیوں کر رہا تھا۔

ویسے دیکھا جاتا تو ہینڈسم تھا، پڑھا لکھا، بات کرنے کا انداز، اٹھنا بیٹھنا، رکھ رکھاؤ، تمیز و تہذیب کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لیکن وہ مہرو کا دیور تھا۔ بس یہی ایک کمی تھی۔

مہرو جیسی نیچر کے ساتھ رہنا مشکل تھا۔ بہنوں کا اور حساب ہوتا ہے لیکن جب رشتے بدل جائیں تو ہر چیز بدل جاتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ نئی رشتے داریوں میں اس کا اور مہرو کا رشتہ خراب ہو اور دوسری جانب مہرو بہت ایکسائٹڈ ہو رہی تھی سارے جمع جوڑ، ضرب تقسیم کر کے دیکھ لیے تھے۔ زویا اگر اس کی دیورانی بن جاتی تو بس پھر سسرال میں اس کا راج ہوتا۔

عماد کی کال آئی تھی اور وہ بڑے خوش گوار موڈ میں حماد کے دل کا وہ احوال جو ابھی حماد کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا ہوگا۔ عماد کو بتا رہی تھی وہ سن کر بس خاموش ہو گیا تھا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔"

"کیا میرے لیے ڈائمنڈ رنگ لی ہے۔" پر اشتیاق لہجہ۔

"اچھا تمہیں کیا چاہیے۔ میں یا ڈائمنڈ رنگ؟" وہ کھنکا۔

"دونوں۔" وہ بغیر سوچے بولی۔

"کوئی ایک بتاؤ۔" وہ بھی بضد ہوا۔

"تم سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔" منہ کے زاویے بگاڑتے ہوئے بے دلی سے کہا گیا۔ لیکن وہ اس کے جملے پر ہی خوش ہو گیا تھا۔

"اچھا میں اگلے مہینے واپس آ رہا ہوں اور امی آئیں گی شادی کی تاریخ لینے۔"

"اتنی جلدی۔"

"تمہارے لیے جلدی ہوگی، مجھے تو ایک ایک دن گزارنا محال لگ رہا ہے۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے۔ ابھی اس سال نہیں آ سکتے۔"

"بس اچھا گاہک مل گیا تھا۔ ٹیکسی بیچ دی۔ ایک بندے کے ساتھ مل کر سپر اسٹور کھولنے کا ارادہ ہے ایک مہینے تک کام سیٹ ہو جائے گا تو دو ماہ کی چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔ میرے واپس آنے کے بعد پھر اسے بھی اپنے ملک جانا ہے۔" کچھ دیر مزید باتوں کے بعد اس نے فون رکھ دیا تھا۔

لیکن مہرو کا چہرہ اتر چکا تھا۔

"اتنی جلدی شادی کی تیاری کیسے ہوگی۔"

☆☆☆

اگلے ہفتے اس کی والدہ آئیں اور ان کا مطالبہ سن کر اماں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

"بس بہن اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ میرا کوئی بیٹی نہیں ہے۔ اب جو کچھ ہے، وہ میرے بیٹوں کا ہی تو ہے۔ بس دو جوڑوں میں لڑکی کو وداع کر دو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ، ہم ایسے کوئی کنگلے تھوڑی ہیں۔ خوب شان سے رخصت کریں گے اپنی بچی کو۔" اماں نے کچھ زیادہ ہی بڑھک ماردی تھی

گویا انہیں کھل کر اپنی فرمائش نوٹس کروانے کا موقع دے دیا تھا۔

''میرا کہنے کا مطلب تھا کہ ضرورت کی تو ہر شے گھر میں موجود ہے۔ جگہ کم اور سامان زیادہ کا کیا فائدہ، وہی آپ کوئی زیور وغیرہ ڈال دیں یا پھر گاڑی لے دیں۔ ویسے گاڑی ہو جائے تو دولہا کی باراتیوں میں ٹور بن جائے گی۔'' اور اب ہکا بکا ہونے کی باری اماں کی تھی۔

☆☆☆

''لو دیکھو ذرا، خود ہی منہ بھر کر گاڑی کی فرمائش کر دی۔'' ان کے جانے کے بعد اماں دوپٹہ بھگوئے سر پہ رکھے بیٹھی تھیں۔

زویا کو بھی برا لگا۔ وہ اماں کی ہم خیال تھی۔ جبکہ مہرو کو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں تو کیا ساری جائیداد اپنے بیٹوں میں ہی بانٹ دو گی۔ ہمارا بھی کوئی حق بنتا ہے کہ نہیں۔ عماد کہہ رہا تھا، شادی کے بعد وہ مجھے بھی باہر لے جائے گا تو پھر جہیز بنانے کا کیا فائدہ، حماد جب بھی آتا ہے۔ اپنے دوست کی گاڑی مانگ کر لاتا ہے اپنی گاڑی ہو گی تو دونوں بہنوں کو سہولت رہے گی۔''

کن اکھیوں سے زویا کو دیکھتے ہوئے آخری جملہ کہا جس پر وہ آگ بگولہ ہو چکی تھی۔

''تم اکیلی کو یہ سہولت مبارک۔'' اس نے ہاتھ جوڑے۔

''یہ تو غلط بات ہے، اگر تم کو گاڑی دیں گے تو زویا کو بھی گاڑی دینا پڑے گی اور جو خاندان میں ایک غلط روایت پڑے گی وہ الگ۔'' یہ بڑی بھابی کا فرمان تھا۔

''زویا کی فکر چھوڑ دیں آپ، اس کی بعد میں دیکھی جائے گی، ابھی تو میں ہر صورت گاڑی لوں گی۔''

☆☆☆

چند دنوں بعد دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں، بعد میں مہرو نے اماں کی کچھ ایسی برین واشنگ کی تھی کہ وہ بھی نیم رضامند ہو گئی تھیں۔

دوسری جانب فرخندہ بیگم نے حماد کو ٹک سک سے تیار سیڑھیاں اترتے دیکھا تو پوچھ بیٹھیں۔

''تمہاری کدھر کی تیاری ہے۔''

''کیوں آپ کو کوئی کام تھا۔'' وہ بڑے ادب سے قریب آ بیٹھا۔

''ہاں۔ وہ میری پرانی ڈائری لاؤ اور عذرا کو کال ملاؤ۔ اس سے کچھ بات کرنی ہے۔'' انہوں نے اپنی رشتے کی بھتیجی کا نام لیا تھا۔

''ان سے کیا کام ہے۔''

''شادی والا گھر ہے۔ سو کام ہیں۔ ابھی مہرو کی بری بھی خریدنی ہے تو بلوانا ہے اسے۔''

''چلیں، اپنے لیے بلوانا ہے تو بلوا لیں لیکن جہاں تک بری کا تعلق ہے۔ وہ تو عماد نے پیسے بھجوا دیے ہیں اور کہا ہے کہ مہرو کو اس کی پسند کی شاپنگ کروا دو، میں وہیں جا رہا تھا۔'' اس نے کہا اور فرخندہ بیگم کا منہ کھل گیا۔

''یہ بالا ہی بالا سارے فیصلے ہو گئے۔''

''امی! آپ کو کیا پتا، آج کل کیا فیشن ہے۔ اچھا ہے نا جس نے پہننے ہیں، وہ اپنی مرضی کے ہی لے لیں۔'' حماد نے ان کے شانوں پہ ہاتھ رکھا لیکن انہوں نے جھٹک دیا۔

''کیا تھا جو چار دن میری مرضی کا پہن لیتی۔''

بہو کی بری خریدنے کا ارمان ہی رہ گیا۔ زیوروں کے ڈبے بند کر کے رکھ دیے۔

بیٹا جا چکا تھا اور وہ افسردہ سی بیٹھی تھیں۔ دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔

اتنے برسوں سے وہ بہو کی بری تیار کر رہی تھیں اپنی بیٹی تو کوئی تھی نہیں۔ سوچا تھا بہو بھی بیٹی کی جیسی ہی ہو گی۔

مگر اب تو کئی واہم اور اندیشے اندر ہی اندر سر ابھار رہے تھے۔ خوشی پر ایک خوف حاوی ہونے لگا تھا۔

اپنی راجدھانی کے چھن جانے کا خوف۔

"عماد کی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ حماد کیوں باؤلا ہوا پھر رہا ہے۔" کچھ ہی پل گزرے تھے اور اب ایک اور خیال پریشان کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"اچھا تھوڑی لگے گا۔ ہم دو جوان جہان لڑکیاں ایک لڑکے کے ساتھ گھومتے ہوئے، امی کو یا بھابی کو ساتھ لے کر جاؤ۔" زویا تو اس کی نئی فرمائش سنتے ہی بدک اٹھی تھی۔

"امی اتنا گھوم پھر نہیں سکتیں اور بھابیوں کو لے جا کر نظر نہیں لگوانی مجھے۔"

وہ زبردستی اسے لے آئی تھی لیکن اس کا موڈ سخت بگڑا ہوا تھا۔ بھلا یہ کوئی تک ہے۔ مہرو ہمیشہ اس پہ ایسے ہی اپنی مرضی چلاتی تھی جو اسے سخت زہر لگتی تھی۔ کہ اس کے انکار کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

اور شام تک جو تھکایا مہرو نے، اسی لیے کوئی اس کے ساتھ نہیں آتا تھا۔ وہ ان چیزوں کو بھی نکلوا کر دیکھتی تھی جنہیں لینے کا اس کا دور دور تک کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا تھا۔

"لڑکیاں تو شاپنگ پہ آ کر خوش ہوتی ہیں۔" حماد نے اس کے تپے ہوئے روپ کو دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"اگر اپنی مرضی سے آئیں تو۔" اس نے مزید ایک بھی قدم چلنے سے انکار کر دیا تھا اور اب گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ حماد بھی اس کے ساتھ رک گیا۔ مہرو دونوں کو موقع فراہم کرتی خود مال میں گھس گئی تھی۔

زویا کو حماد کے سامنے شرمندگی ہو رہی تھی اگر جو عماد بھائی نے کہہ دیا تھا کہ اپنی مرضی سے شاپنگ کر لو تو مہرو کو بھی تھوڑا خیال کرنا چاہیے تھا۔

ایک سے بڑھ کر ایک مہنگی اور برانڈڈ چیزیں بس لیے جا رہی تھی۔

"آپ نے اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔" وہ بات کرنے کا بہانا ڈھونڈ رہا تھا۔

"پہلے مہرو صاحبہ کا دل بھر جائے پھر میں بھی سوچ لوں گی۔"

"اگر میں آپ کے لیے کچھ لوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا۔" حماد نے اس کی سمت دیکھا۔

"بہت برا لگے گا۔" تب ہی زویا نے بھی اس کو دیکھا تھا۔ گہری سیاہ محبت لٹاتی نظریں۔

"آپ مجھے اچھی لگیں بہت پہلے۔ جب میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا، اس روز میں اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے آیا تھا اور جب میں نے آپ کو دیکھا تو پتا نہیں کیوں دعائیں مانگنے لگا کہ جس لڑکی کو دیکھنے آئے ہیں وہ آپ نہ ہوں۔"

پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا، رخ تھوڑا سا زویا کی سمت تھا اور ہوا سے اس کے بال ماتھے پہ بکھر رہے تھے، آنکھوں میں سچے جذبوں کا عکس تھا۔

زویا کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔

اور اگلے ہی پل مہرو نے آ کر فسوں توڑ دیا تھا۔

پھر اس سے اگلے روز اور اس کے بعد آنے والے دو، چار روز تو زویا نے اس کے ساتھ نہ جانے کی قسم کھالی تھی۔

مجبوراً مہرو کو بڑی بھابی کو ساتھ لے جانا پڑا تھا۔

آخری شاپنگ والے روز مہرو اس کے لیے بھی دو سوٹ لائی تھی۔ کلر اور ڈیزائن بہت خوب صورت تھے۔

"یہ بارات اور ولیمے کا ڈریس ہے کسی نے خاص تاکید کی ہے۔" دونوں سوٹوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے مہرو کا لہجہ خاصا معنی خیز ہو چکا تھا۔

اور پھر ڈھولک، مایوں، بارات اور ولیمے میں مہرو رخصت ہو کر سسرال چلی گئی۔ زویا نے وہ ڈریس کسی بھی دن نہیں پہنے تھے۔

دینے والے کا چہرہ اتر گیا۔

ہر فنکشن میں وہ دو آنکھوں کے حصار میں رہی تھی۔

☆☆☆

شادی لیکن چند روز ہی گزرے تھے، جب فرخندہ بیگم کو کچھ کچھ مہرو کی فطرت کا اندازہ ہو چکا تھا ہر کام اور بات میں وہ اپنی من مانی کر رہی تھی۔ انہیں تو آتے ہی جیسے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔

اور خود کھل کر سارے گھر میں دندناتی پھر رہی تھی۔ اور بیٹا تھا کہ اس کی زلفوں کا اسیر ہوا جا رہا تھا۔

دونوں نک سک سے تیار باہر نکلتے اور اجازت لینے کا تو اب شاید رواج ہی نہیں رہا تھا، بس اطلاع ہی دی جاتی تھی۔

رشتے داروں کے گھر اور دعوتوں میں ایک بار بھی انہیں ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی اپنے آپ میں جل کڑھ رہی تھیں۔

دوسرا حماد کا دکھ تھا جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک دن بھی زویا نے اس کا دیا ہوا جوڑا نہیں پہنا تھا۔ وہ من ہی من اس سے کیا کیا امیدیں جوڑ بیٹھا تھا اور وہ تھی کہ ایک ذرا سا اس کی چاہت کا مان نہ رکھ سکی تھی۔

مہرو کو اتنا غصہ آ رہا تھا۔ دو سوٹ استری کیے تھے اور لٹکانے کو جگہ نہیں مل رہی تھی۔

بیڈ روم میں تھا ہی کیا۔

پرانی سی مسہری، دو کرسیاں اور ساس کے زمانے کی سیف الماری۔

"باتیں تو ایسے کر رہی تھیں جیسے نیا فرنیچر بنا کر رکھا ہوا ہے ضرورت کی ہر چیز ادنہہ...... مجھے کیا پتا تھا یہ پرانا سامان میرے لیے رکھا ہے تو کبھی گاڑی نہ لگتی۔

جہیز نہ لے کر میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے اپنی چیز بندہ حق سے استعمال کرتا ہے۔"

دو ہفتوں سے گزارہ کر رہی تھی مگر اب اپنی ہی جیولری، کپڑے سنبھالنے مشکل ہو رہے تھے تو عباد کی چیزوں کو کہاں رکھتی۔

وہ پرانا رواج بکسوں میں رکھو اور ٹرنکوں سے نکالو۔ یہ 1970ء کی یادگاریں ہی رہ گئی تھیں۔ تنگ آ کر اس نے اماں کو فون کھڑکایا۔

اور رو دھو کر فرمائش کر دی کہ بیڈ روم کا سامان بھجوائیں ورنہ میں سب چھوڑ چھاڑ واپس آ جاؤں گی۔

اماں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

زویا کالج سے آئی تو وہ بھی سن کر جھنجلا گئی۔

"ابھی لاکھوں روپیہ اس کی شادی پہ خرچ کیا ہے۔" بھابیوں نے سنا تو الگ سے منہ پھلائے۔

نصرت بیگم نے بینک کے پیسوں کا حساب کتاب لگایا اور اسے حماد کو فون کرنے کا کہا کہ وہ مارکیٹ میں ملے اور وہیں سے سامان لوڈ کروا کر لے جائے۔

اور زویا فون ہاتھ میں پکڑے سوچ رہی تھی کہ کیسے اس سے بات کرے گی۔ بہر حال اس نے نمبر ملا کر فون اماں کو تھما دیا تھا۔

☆☆☆

"عماد! میری بات سن رہے ہیں۔" مہرو باہر سے تپی ہوئی اندر آئی تھی۔

"کہو جان۔" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"میں نے بیڈ روم کا سامان منگوایا ہے لیکن یہ کمرہ اتنا چھوٹا ہے۔ کیوں نا ہم آنٹی والا کمرہ لے لیں اس گھر کا سب سے اچھا کمرہ وہی ہے۔ کھلا، روشن اور ہوادار، چاہیے تو یہ تھا کہ سب سے اچھا کمرہ ہمیں ملتا لیکن یہ دو فٹ کا ڈربا دے دیا اب یہ سالوں پرانا فرنیچر مجھے تو دیکھ کر ہی وحشت ہوتی ہے۔"

عماد نے کچھ لمحوں کے لیے سوچا پھر کہا۔

"تم نے گھر کیوں فون کیا، مجھے کہتیں۔"

"ہاں تا کہ آپ کی والدہ محترمہ عمر بھر جہیز نہ لانے کا طعنہ دیتی رہتیں۔"

"امی نے تم سے کچھ کہا۔"

"جو بات کہہ رہی ہوں، وہ مانیں۔"

"یار! ایسا نہیں ہو سکتا۔ پہلی بات وہ کمرہ دیں گی نہیں اور دوسری بات میں کیوں خوامخواہ برا بنوں۔"

"عماد۔"

''ان کے ڈائیلاگ جانتی ہو۔ کیا ہوں گے۔
''بیوی نے جالی بھری اور تو آ گیا ماں کو سنانے۔ اب میرے گھر میں مجھے ہی بے دخل کیا جائے گا۔ ارے میرے معصوم بیٹے ایسی فرمائشوں پہ ان لاڈلیوں کو وہیں سیٹ کرنا پڑتا ہے۔ اسے جا کر کہو۔ جو ہے اسی میں گزارا کرے۔''
اس نے کچھ ایسے نقل اتاری کہ مہرو کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی تھی۔
''ویسے میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے کل بتاؤں گا بلکہ دکھاؤں گا۔''

☆☆☆

مطلوبہ شاپ پہ پہنچ کر اس نے سامان لوڈ کروایا اور واپس آ گیا۔ وہ بھی تھی وہاں لیکن حماد نے بس اسے سرسری سا ہی دیکھا تھا۔ وہ اسے جتانا چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے لیکن وہ اتنی کٹھور، بے رحم اور سنگ دل تھی کہ مجال ہے جو اسے سرسری سا بھی دیکھا ہو۔
گھر آ کر بھی اس کا موڈ خراب ہی رہا تھا۔
گھر میں آج آلو پالک بنے تھے۔ مہرو نے سالن کا ڈونگا دیکھتے ہی برا سا منہ بنایا تھا۔ جتنے دن عذرا خاتون رہیں۔ اچھا کھانے کو مل جاتا تھا۔ کل سے وہ گئی تھیں اور آج خالی آلو پالک اور روٹیاں۔
مہرو تو ویسے بھی کھانے میں بڑے نخرے کرتی تھی جب بھی زویا اس کے لیے ٹرے میں کھانا لاتی۔ اس کے اعتراضات شروع ہو جاتے۔
مسور کی دال کے ساتھ لیموں والی پیاز، اور سبزیوں کے ساتھ پلیٹ بھر کر سلاد بنواتی تھی اور پھر زویا کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا۔ اس کے ہاتھ سے پکے آلو والے چاول بھی بریانی کا لطف دیتے تھے۔
اور اب فرخندہ بیگم کہہ کر گئی تھیں کہ ''کل میٹھا بنا لینا اور پرسوں سے کچن تمہارے حوالے۔''
''اف کیسے کروں گی یہ سارے کام، سب سے مشکل ہوگا اپنے ہاتھ کا بدمزہ کھانا کھانا، میں کیسے کھا سکتی ہوں وہ ملغوبے جو مجھ سے بنتے ہیں۔'' سوچ کر اسے آلو پالک کا ذائقہ اور بھی بدمزہ لگ رہا تھا دو نوالے لیے اور تیسرا حلق میں اٹکنے لگا۔
''رہنے دو، مت کھاؤ یہ، میں تمہارے لیے کچھ لے آؤں گا۔'' عماد نے اس کے آگے رکھی پلیٹ اٹھالی تھی۔ خود وہ رغبت سے کھا رہا تھا۔ وہ باہر رہتا تھا اور اس کے لیے تو پکا پکایا ملنا ہی غنیمت تھا۔
''لیکن آپ تو گاڑی اندر کر چکے ہیں۔'' اسے فکر ہوئی، رات کے دس بج رہے تھے۔
''ارے نہیں۔ میں پیدل چلا جاؤں گا، زیادہ دور نہیں ہے، بس جب تمہارے سیل فون پہ بیل دوں تو چپکے سے دروازہ کھول دینا۔'' اس نے سارے برتن سمیٹے اور چلا گیا۔
مہرو اپنی سوچوں میں دوبارہ گم ہوئی۔
''بڑی چالاک ہیں یہ بڑی بی، اف ابھی تو شادی کو دو ہفتے ہوئے ہیں اور ابھی سے چولہا چوکی سنبھال لوں۔ کتنا ارمان تھا۔ مری، کاغان، ناران گھومنے کا، لیکن یہ عماد بھی بس کنگلا ہی ہو کر آیا ہے کہہ رہا تھا۔ سارے پیسے اسٹور میں لگا دیے ہیں۔
اگلے سال کا وعدہ کر لیا بس پھر تو جا چکے۔ یوٹیوب سے کچھ خوب صورت نظاروں کی تصویریں ڈاؤن لوڈ کیں۔ اور فیس بک پہ اسٹیٹس لگا دیا۔
''ہنی مون مناتے ہوئے۔'' ایسے تو پھر ایسے ہی سہی۔
کچھ دیر میں کمنٹ آنا شروع ہو چکے تھے۔ وہ بھی تصور میں خود کو ہنی مون مناتے دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔
سیل فون پہ بیل ہوئی تو اس نے چپکے سے جا کر دروازہ کھولا وہ اس کے لیے کباب، روٹی اور شوارما لایا تھا۔
مہرو نے خوب مزے سے یہ خفیہ دعوت اڑائی۔ اور جان بوجھ کر کاغذ باہر والے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔
''اب آئے گا مزہ۔'' دل کمینگی سے مسکرایا تھا۔

"گھر میں ہے ہی کون جو تم اپنی بیگم کے لیے چھپا کر چیزیں لاتے ہو۔" فرخندہ بیگم نے بھی جتا ہی دیا۔

"امی! اس سے آلو پالک نہیں کھائی جا رہی تھی اور آپ سو چکی تھیں۔"

مگر کیا فائدہ۔ ان کا دل بدگمان ہو چکا تھا۔ وضاحتیں بے کار تھیں۔

☆☆☆

شام میں چہل قدمی کرتے ہوئے وہ گھر سے ذرا دور نکل آئے۔ عماد محض اس کا دل بہلانا چاہتا تھا جس کا دوپہر سے ہی چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے آج کھیر بنائی تھی۔ اوپر سے فرخندہ بیگم سارا کچھ اس کے حوالے کر کے خود جیٹھانی کے گھر جا بیٹھی تھیں۔

ذرا سا دماغ لڑا کر جو اس نے بنایا وہ کھیر تو ہرگز نہیں تھی اور فرخندہ بیگم نے دو چار اسے سنا کر بڑے دھڑلے سے وہ محلے بھر میں بانٹی تھی "اچھا ہے اس کے بھی ذرا جوہر کھلیں۔" مہرو کو رونا آ گیا تھا۔

زویا کو بتایا تو وہ الٹا خفا ہوئی تھی۔

"تھوڑا سا اور دماغ استعمال کرتیں تو یوٹیوب، گوگل سے ہی ترکیب دیکھ لیتیں یا پھر مجھے ہی کال کر لیتیں...... سب تمہارا ہی قصور ہے۔"

"چپ کرو تم، اماں نے بھی کس ٹٹ پونجیے خاندان میں بیاہ دیا ہے۔ میرے تو سارے خواب مٹی میں رول دیے ہیں۔" وہ اپنا قصور ماننے کے بجائے دوسروں کو الزام دے رہی تھی۔

"زویا! تم آ جاؤ یہاں۔ میں اکیلے نہیں سنبھال سکتی۔" اور زویا نے فون ہی رکھ دیا تھا، تب سے وہ جیسے خود سے بھی خفا ہو گئی تھی۔ اب بڑی مشکل سے عماد اسے بہلا کر باہر لایا تھا۔

"اچھا اس دن میں نے تم سے ایک سرپرائز کی بات کی تھی۔" وہ چلتے چلتے بہت دور نکل آئے تھے۔

"کیا۔" مہرو نے سر جھٹک کر جیسے خود کو پرسکون کیا تھا۔

"وہ سامنے پچیس مرلے کا پلاٹ دیکھ رہی ہو۔" عماد نے ایک نو تعمیر شدہ پلاٹ کی سمت اشارہ کیا۔ جس پہ خوب صورت گھر کا نقشہ بنا کر بنیادیں بھر دی گئی تھیں۔

"یہ ہمارا ہے۔ بس چند مہینوں کی بات ہے، سپر اسٹور کا کام سیٹ ہو جائے تو یہاں ایک خوب صورت گھر بناؤں گا پھر تم اس میں اپنی پسند کا کمرہ لینا۔"

"واقعی!" یہ مہرو کے لیے بڑا خوش گوار سرپرائز تھا جسے سنتے ہی وہ خوش ہو گئی تھی۔

"لان اور گیراج تو ضرور ہوگا۔"

"ہاں یار! بھلا کیسے بھول سکتا ہوں تمہارے وہ فرمائشی نقشے، جو جیسا تمہیں پسند تھا، اسی کے مطابق نقشہ بنوایا تھا۔" اب وہ اسے تفصیل سمجھا رہا تھا۔

"آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔"

"کیسے۔"

"آپ کو تو میری ہر بات یاد ہے۔"

"اچھا اب تم بھی میری باتیں یاد کر لو۔ گھر کے کاموں میں دلچسپی لو۔ اب امی کو بھی آہستہ آہستہ چھٹی دینا شروع کرو۔ میں تو چند روز میں چلا جاؤں گا اور تم دونوں کو ساتھ رہنا ہے تو بہتر ہوگا تم ان کا مزاج سمجھ لو۔"

"دھت تیرے کی۔" اس کی اگلی بات نے مہرو کا سارا موڈ بگاڑ دیا تھا۔ "دو ہفتوں کی دلہن سے بھی کوئی کام کرواتا ہے۔" حسب توقع اس نے ناک چڑھائی تو وہ کچھ سنجیدہ ہوا۔

"مہرو! مجھے اپنا ہر رشتہ بہت عزیز ہے، میں نہیں چاہتا کہ ایسا وقت آئے کہ مجھے انتخاب کرنا پڑے تو ایک بات یاد رکھنا۔ میں اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

اس کے ان جذباتی جملوں پہ بھی اس نے خاص کان نہیں دھرے تھے، بظاہر ہامی بھر لی تھی۔

اگلے روز گہری نیند میں اس کے دماغ پہ جیسے ڈزن ڈزن ہتھوڑے کی مانند برسا تھا پھر ذہن کچھ بے زار ہوا تو سماعتیں آواز کا تعاقب کرنے کے قابل

ہوئیں۔
"ارے دن چڑھ آیا ہے، نہ نماز نہ قرآن، گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ رات کو بتایا بھی تھا کہ بی بی صبح اٹھ کر ناشتہ بنالینا۔" اسے آج پتا چلا تھا کہ صبح اتنی جلدی بھی ہوتی ہے۔ اٹھنا پڑا اور اٹھ کر کچن کے درشن بھی کرنے پڑے۔
روٹی گول کیا اسے چوکور بھی بنانی نہیں آتی تھی۔ بہرحال رات کا سالن گرم کیا۔ انڈا بنایا۔ چائے بنائی اور روٹی کے پیڑے بنا کر رکھ دیے، بعد میں باتیں سننے سے اچھا تھا ابھی سے جان چھڑالے۔
"امی! روٹی آپ خود بنالیں کیونکہ مجھے روٹی بنانی نہیں آتی۔" تمام لوازمات میز پر چننے کے بعد وہ خود بھی کرسی سنبھال چکی تھی۔
فرخندہ بیگم کا منہ حیرت سے ایسا کھلا کہ حماد کی ہنسی نکل گئی۔ وہ بلا کا سحر خیز تھا اور ابھی باہر سے واک کر کے آیا تھا۔ وہ اور فرخندہ بیگم اسی وقت یہ ناشتہ کرتے تھے اور اب ...... ذرا جو مہرو کو کوئی شرمندگی ہو۔
وہ خود ہی بکتی جھکتی اٹھ کر کچن میں چلی گئیں اور مہرو کو جو مزہ آیا، وہ الگ کہانی تھی۔
"مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔ میں بعد میں عماد کے ساتھ ناشتہ کرلوں گی۔"
کہہ کر وہ پھر سے کمرے میں جانے والی تھی جب نصرت بیگم نے آواز دے کر روک لیا۔
"کوئی ضرورت نہیں دوبارہ سو کر نحوست پھیلانے کی، ابھی نسرین آتی ہے۔ تو اس سے گھر کی صفائی کرواؤ اور بھی اسے تین گھروں کا کام کرنا ہوتا ہے اس لیے میں نے اسے یہی ٹائم دیا ہے۔"
"اف یہ خاتون میری سوچ سے زیادہ چالاک ہیں۔" اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ وہ نسرین کے آنے تک صوفے پہ بیٹھی سو چکی تھی۔
☆☆☆
"باجی۔" نسرین کی پاٹ دار آواز پہ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑاتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

"کیا بات ہے۔" گھر میں کوئی اسے ایسے جگاتا تو وہ اس کا منہ نوچ لیتی۔ وہ تو جب سو رہی ہوتی تھی تو گھر کے بچے بھی شور کرنے سے پرہیز کرتے تھے اور یہاں ایک ملازمہ کی بھی کیا جرات تھی۔
"صفائی کروالیں مجھ سے۔" کیا البیلا انداز تھا۔
"کیا مطلب صفائی کروالوں تم سے، تم کس مرض کی دوا ہو۔"
"اللہ نہ کرے باجی! میں کیوں کسی مرض کی دوا بنوں۔ ابھی تو بس سترہ سال کی ہوں۔ اب ایسی بد دعائیں تو نہ دیں مجھے۔" وہ تو رونے والی ہوچکی تھی۔
"او، ایموشنل ڈرامہ! وہ سامنے تین کمرے ہیں جاؤ پہلے وہ صاف کر کے آؤ۔"
"ایسے کیسے صاف کر کے آؤں، پہلے پھیلاوا تو سمیٹ کر دیں۔" بڑی بڑی آنکھیں خوب پٹ پٹائیں۔
"کیوں پھیلاوا میں کیوں سمیٹوں۔" وہ بدک کر سیدھی ہوئی۔ "کوئی قیمتی چیز ہو سکتی ہے۔ الٹا بعد میں چوری کا الزام لگا دیں گی اور پھر آپ کا گھر ہے، مجھے کیا پتا کس چیز کو کہاں رکھنا ہے۔"
"اوہ میرے خدا۔" وہ اٹھ کر اس کے ساتھ آئی بس جھاڑو نسرین کے ہاتھ میں تھی۔ باقی مغز ماری اسے کرنی پڑ رہی تھی۔
حماد آج کل اس کے کمرے کے خوب چکر کاٹ رہا تھا۔ اسے مہرو سے ضروری بات کرنا تھی اور فرخندہ بیگم کی آنکھوں نے دیور بھابی کی اس لکا چھپی کو خوب تاڑا تھا۔
جو اسے سنا ہی دیا تھا۔
"حماد کے لیے میں نے اپنی بھانجی کو سوچ رکھا ہے۔ بس اس کا باپ باہر سے آجائے تو باقاعدہ رسم بھی ہوجائے گی۔"
وہ خاموش رہی۔ رات حماد اس سے کہہ رہا تھا۔
"بھابی! کچھ کرو نا۔"
"کیا کروں۔"

''میری منگنی ہی کروادو۔'' وہ مسکینیت سے بولا۔

''کس سے؟''

''اب یہ بھی میں بتاؤں۔''

''ظاہر ہے جب منگنی کے لیے دل مچل رہا ہے تو کوئی لڑکی بھی ہوگی نظر میں۔''

''نظر اور دل میں تو کب سے ہے۔ بس اسے گھر میں لانے کا انتظام کرنا ہے۔'' اور اس سے قبل کہ وہ عماد سے بات کرتی یہ نئی کہانی کھل گئی تھی۔

☆☆☆

اس گھر میں وہ زویا کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور عماد سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا جب وقت آئے گا دیکھی جائے گی۔ پہلے وہ کچھ بن تو جائے۔ اس کا دماغ بہت الجھ رہا تھا۔

''ایک یہ زویا بھی، ذرا جو حماد کو لفٹ کروادے اگران ماں، بیٹے نے مل کر اسے سمجھا دیا تو کیا پتا، وہ بھی یہ سوچ لے کہ کون سا لڑکی کے دل میں اس کے لیے محبت تھی، اب کیا کروں۔'' اسے کسی پل چین نہیں تھا۔

تھک ہار کر زویا کا نمبر ملایا۔

''کیسی ہو مہرو۔'' وہ بڑے پیار سے بولی تھی۔

''تمہیں کیا میری پروا، تمہاری طرف سے جیوں یا مروں۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''کیا ہوا ہے، ایسے کیوں بول رہی ہو۔'' دوسری طرف وہ پریشان ہوئی تھی۔

''مجھے اس بھاڑ میں جھونک کر خود کتنے سکون میں ہو۔''

''مہرو تمہاری شادی ہوئی ہے اور وہ تمہارا گھر ہے وہاں دل لگانے کی کوشش کرو۔ عماد اتنے اچھے ہیں اپنی ساس کے پاس بیٹھا کرو۔ گھر کے کاموں ......''

''تمہارے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتی، حماد اتنا اچھا تو ہے پھر کیا مسئلہ ہے تمہارا۔'' پٹری بدل کر وہ جذباتی ہوئی۔

''یہ معاملہ میں نے امی کو سونپ رکھا ہے۔ وہ جو بہتر سمجھیں گی۔ فیصلہ کریں گی۔'' بالآخر اس نے جان ہی چھڑائی تھی۔

''یعنی تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر میں حماد کا رشتہ لے کر آؤں۔'' جوش میں وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر تمہاری ساس اور امی کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو دیکھیں گے۔'' وہ جانتی تھی جس طرح کی مہرو کی عادتیں ہیں، اسے دیکھتے ہوئے اس کی ساس کبھی اس گھرانے کی دوسری لڑکی نہیں لائیں گی۔

ساس کے ذکر پہ مہرو کا حلق تک کڑوا ہوا تھا۔

''چلو، دیکھتے ہیں۔ ویسے حماد کو پچھلے ایک ہفتے سے فیور ہوا ہے۔ تمہارا ہی جوگ لے کر بیٹھا ہوگا۔ منتیں کررہا تھا میری کہ زویا سے منگنی کروادو۔''

دو چار مزید باتوں کے بعد اس نے فون رکھ دیا سر سے کچھ بوجھ تو اترا تھا۔

''چلو ایک طرف تو بات بنی، امی کو میں منالوں گی۔'' اور اسے پتا تھا امی کو کیسے منانا تھا۔

پہلے اسے سسرال کا امیج ٹھیک کرنا پڑے گا۔

اگلے روز وہ خوب بج سنور کر میکے پہنچ گئی۔

اور خوب دل کھول کر سسرالیوں کی تعریفوں کے پل باندھے۔

امی تو خوش ہوئیں کہ چلو شکر ہے، اس کا وہاں دل تو لگا مگر زویا کو اس کی مکاریاں خوب نظر آرہی تھیں۔

''تمہارا سب سے بڑا ویک پوائنٹ یہی ہے کہ تم اس وبال جان کے دیور ہو۔'' دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

''یہ حماد نے تمہارے لیے بھیجی ہیں۔'' دو سرخ گلاب کی کلیاں اس نے زویا کے بالوں میں لگائیں۔ زویا نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''اب یہاں سے دو سفید گلاب توڑ کر لے جاؤں گی تاکہ مریض عشق کو کچھ افاقہ ہو۔''

"مہرو! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔" وہ روہانسی ہو کر اس کے پیچھے لپکی مگر مہرو کو اپنی من مانی کی عادت تھی۔

"ان پھولوں میں جو خوشبو ہے، وہ میری ہی محبت ہے۔" سیل فون پہ اس کا پیغام جھلملا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ سفید گلاب اتنے خوب صورت تھے کہ حماد نے مٹی کے گلدان میں پانی بھر کر اس میں سجا دیے۔ وہ روز انہیں دیکھتا اور بلاوجہ مسکراتا۔ فرخندہ بیگم کی نظروں سے یہ کھیل پوشیدہ نہ رہا۔ وہ لان سے کچھ تازہ گلاب توڑ لائیں۔

"میرے بیٹے کو لگتا ہے، پھول بہت پسند ہیں اس لیے میں تازہ پھول لائی ہوں۔" انہوں نے یہ کہہ کر گلدان کے باسی پھول نکال دیے اور حماد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"نہیں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

"کیا۔" فرخندہ بیگم نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھول لگاتے ہاتھ رک گئے۔

"ہاں۔ لگا دیں لیکن یہ پھول مجھے دے دیں۔ میں اپنی ڈائری میں رکھوں گا۔ کسی دوست نے گفٹ دیے تھے۔"

آگے بڑھ کر اس نے ماں کے ہاتھ سے پھول لے لیے اور دراز سے ڈائری نکال کر اس میں رکھ دیے۔ اب کچھ سانس بحال ہوئی تھی۔

"یہ کون سا دوست ہے جو تمہیں پھول دیتا ہے۔" اچنبھے بھرا انداز۔ حماد ایک پل کو بوکھلایا پھر لبوں پہ بڑی دلفریب مسکراہٹ پھیلی۔

"بتا دوں گا۔ وقت آنے پہ آپ کو ہی بتاؤں گا۔"

"اچھا آ کر کھانا کھا لو۔ تمہاری پسند کا مٹن قورمہ بنایا ہے۔" وہ بات پلٹ گئیں، ضروری تھا سارے حجاب آج ہی اٹھ جاتے اور لحاظ بھی باقی نہ رہتا۔ ان کا شک اب یقین میں بدل چکا تھا۔

رات انہوں نے عماد کو اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

پیچھے مہرو کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔ اب جانے کیا گھول کر پلائی ہیں، کچھ دیر تو وہ ٹینشن میں رہی پھر حماد کے کمرے میں چلی آئی۔

"آیئے بھابی! زہے نصیب۔" وہ اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

"حماد! زویا میری اکلوتی لاڈلی بہن ہے تم اس کے ساتھ سیریس بھی ہو یا محض وقت گزاری کر رہے ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آنٹی اس روز مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہارے لیے اپنی بھانجی لے کر آئیں گی اب عماد کو بلوایا ہے تم دیکھنا، یہی بات ہو گی پھر تم کیا کرو گے۔"

"امی نے آپ سے ایسا کہا۔" وہ حیران ہوا۔

"بالکل۔"

دوسری طرف فرخندہ بیگم عماد سے کہہ رہی تھیں۔

"میں چاہتی ہوں۔ تم حماد کا ویزا لگواؤ اور اسے اپنے ساتھ ہی باہر لے جاؤ، نوکری تو اسے کوئی مل نہیں رہی۔ اچھا ہے کاروبار میں ہی سیٹ ہو جائے۔ تمہیں بھی اسٹور کے لیے کسی مددگار کی ضرورت ہو گی تو اپنا بھائی کیوں نہیں۔" اور عماد نے ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

کچھ دنوں میں ویزا لگا اور دونوں بھائی باہر چلے گئے۔

جانے سے پہلے جو گڈ نیوز مہرو نے اسے سنائی تھی۔ وہ ماں کے گھٹنے تھام کر بیٹھ گیا۔

"اب میرے بعد آپ نے مہرو کا خیال رکھنا ہے۔" اور پوتے کی خواہش تو فرخندہ بیگم کو بھی تھی۔ اب تو وہ ملازمہ کو بھی اس کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اور پھر ننھے حمزہ کی آمد نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ مہرو کا اصرار تھا کہ زویا چند روز کے

لیے اس کے پاس آئے اور اماں نے اسے بھیج بھی دیا تھا۔

باہر حماد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کاش ان دنوں وہ گھر ہوتا۔

زویا بھی تو اسی لیے آئی تھی کہ حماد گھر میں نہیں تھا۔ ننھے بچے کے کام، اس کا سونا اٹھنا، جاگنا، وہ خوب انجوائے کر رہی تھی۔ بچے ویسے بھی اسے بہت پسند تھے۔ بھابیاں اسی لیے اس سے خوش رہتی تھیں کہ وہ ان کے بچوں کے بھی بڑے لاڈ اٹھاتی تھی۔

فرخندہ بیگم گم صم تھیں۔ ایک طرف پوتے کی خوشی تھی تو دوسری طرف عماد کی فون کال نے پریشان کر رکھا تھا۔

''امی! حماد تو بالکل اٹل ہے کہ شادی کرے گا تو بس زویا سے۔'' عماد نے کہا تھا۔

''لیکن میں اس کے لیے اپنی بہن سے بات کرنے والی تھی۔''

''ابھی نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ وہ بالکل نہیں مان رہا۔ ایسے ہی بعد میں آپ دونوں بہنوں کا رشتہ خراب ہوگا۔'' بات تو اس کی بھی ٹھیک ہی تھی۔

''بات کرواؤ میری حماد سے۔'' انہوں نے ڈائریکٹ اس سے ہی بات کرنے کا سوچا تھا لیکن عماد نے فی الوقت ٹال دیا۔ رات اس نے خود فون کیا تھا۔ اور اس سے قبل کہ وہ ایموشنل ہوتا انہوں نے خود ہی ایموشنل بلیک میلنگ شروع کر دی تھی۔

''کیا تمہاری خوشیوں پر میرا اتنا بھی حق نہیں ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے امی، زویا میری خوشی ہے اور آپ کا مکمل حق ہے اس پہ۔'' اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''میں مہرو کو لا کر پچھتا رہی ہوں بس بیٹے کی وجہ سے خاموش ہوں ورنہ ایسے کوئی سکھ میں نہیں رکھا ہوا اس نے مجھے، اتنی پھوہڑ، کم عقل اور چالاک ہے، ہر کام بتانا اور سکھانا پڑتا ہے اور وہ کہنے پہ بھی نہیں کرتی اب ایک سے بھلی دو، تم کیوں میرا بڑھاپا خراب کرنے پر تلے ہوئے ہو۔''

''امی! زویا اس سے بہت الگ ہے، ابھی وہ ہمارے گھر میں موجود ہے۔ آپ دیکھ لیں، پرکھ لیں پھر کوئی فیصلہ کریں۔''

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زویا میں کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ ماں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سچ مچ وہ بہت ڈسٹرب ہو چکا تھا۔

''لکی ہو تم جو اس پیار والے جھنجھٹ میں نہیں پڑے اس لیے تو آرام سے سو رہے ہو اور میں...... کاش امی کو وہ پسند آ جائے ورنہ ایک کمپرومائز میرا منتظر ہوگا۔'' اس نے عماد پر نظر ڈالتے سوچا تھا۔

☆☆☆

''زویا! اٹھو۔'' ابھی اس کی آنکھ لگی ہی تھی کہ مہرو کے جھنجھوڑنے پر اٹھ گئی۔ ''کیا ہوا ہے؟'' ذہن غنودگی میں تھا۔

''منا کب سے رو رہا ہے۔'' اس کی اگلی پکار پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور پھر چھوٹو کو اٹھا کر گود میں لیا۔

''مہرو! بھوکا ہے بے چارہ، فیڈ کروا دو تو سو جائے گا۔'' اس نے نرمی سے مہرو کی گود میں لٹانا چاہا تو وہ بدک کر دور ہٹی۔

''جاؤ۔ فیڈر بنا لاؤ۔''

''تم نے دن رات اسے فیڈر پر رکھا ہوا ہے ایسے بیمار بھی پڑ سکتا ہے کل ہی تمہاری شکایت لگاؤں گی۔''

زویا کو اس پہ خوب غصہ آ رہا تھا۔ وہ اس قابل تھی پھر بھی اسے مدر فیڈ نہیں کروا رہی تھی۔ مہرو کو پروا نہیں تھی۔ وہ بچے کو اس کے حوالے کر کے خود سو چکی تھی۔ زویا نے بڑبڑاتے ہوئے اسے فیڈر بنا کر دیا۔ آرام سے کیری میں لٹایا اور فریج سے پانی کی بوتل لینے باہر آئی تو فرخندہ بیگم وہیں لاؤنج میں صوفے پہ غیر آرام دہ بیٹھی تھیں۔

رات کے دو بج رہے تھے۔

''آنٹی! آپ سوئیں نہیں۔'' وہ ان کے قریب چلی آئی۔

بیٹے نے جو رام لیلا سنائی تھی، اس کے بعد بھلا نیند کہاں آتی۔

"بس سر میں درد ہے۔" وہ چاہ کر بھی رکھائی نہ برت سکیں۔ زویا ان کے لیے پانی کا گلاس اور پین کلر لے آئی تھی۔

"یہ کھالیں پھر میں آپ کا سر دباتی ہوں۔" وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور وہ کہہ نہیں سکیں کہ سر درد کی وجہ بھی تم ہی ہو۔

"آنٹی! آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" زویا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کہو۔" وہ حیران ہوئیں۔ "مہرو تھوڑی بے وقوف سی ہے اتنا سمجھایا ہے میں نے لیکن بالکل اثر نہیں ہو رہا۔ وہ بچے کو مسلسل ڈبے کا دودھ دے رہی ہے آپ خود سمجھائیں یا پھر عماد بھائی سے کہیں، وہ ذرا کلاس لیں اس کی۔ میری بات تو سنتی ہی نہیں۔"

ایسا معصومیت بھرا انداز۔ وہ اپنی ہی بہن کی شکایت ان سے لگا رہی تھیں۔

شکل کی تو خوب صورت تھی ہی، ادا کا بھولا پن انہیں بھی بھا گیا تھا۔ "اچھا۔ میں صبح ہی بات کرتی ہوں۔"

"آپ ایسا کرنا، وہ دودھ والا ڈبہ، ڈریسنگ کے پہلے کیبن میں رکھا ہے۔ وہاں سے اٹھا لیجیے گا۔" اٹھنے سے پہلے پھر سے یاد دہانی کروائی۔

"چلو جو ہو، دیکھا جائے گا لیکن مجھے بھی اپنی تعصب بھری نظروں کو ایک طرف رکھ کر حقیقت کا مشاہدہ کر لینا چاہیے۔ بیٹا تو میرا ہی ہے۔ میری اجازت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔"

وہ سوچ کر کچھ ہلکی پھلکی ہوئیں۔

☆☆☆

"ویسے نسرین! ایک بات ہے، تم ناشتہ بہت مزے کا بناتی ہو۔" خستہ کرارہ پراٹھا اور ساتھ رات کا سالن اور چائے کا مگ۔" وہ ایسی ہی سادہ مزاج تھی۔ اس لیے اسے تو بہت مزہ آ رہا تھا۔ نسرین نے منہ پہ ہاتھ رکھا اور لگی کھی کھی کرنے۔

"باجی! بڑی بی بی تو مجھے کچن میں گھسنے بھی نہ دیں۔ کہاں میرے ہاتھ کا ناشتہ کریں گی۔" وہ کمرے کی جھاڑو لگا کر جا چکی تو زویا نے عجیب سی نظروں سے مہرو کو دیکھا۔

"ناشتہ آنٹی بناتی ہیں؟" گویا اس سے تصدیق چاہی۔

"تو کون سا احسان کرتی ہیں اور ناشتہ تو دیکھو، پراٹھا اور رات کا بچا سالن نکال کر بھجوا دیا۔ اتنا نہ ہوا۔ ساتھ آملیٹ ہی بنا لیتیں، مہمان ہو چار دن کی لیکن دیکھا۔ کیسا سلوک ہو رہا ہے تمہارے ساتھ۔"

"مہرو! ان کی ہمت ہے جو اتنا بھی کر رہی ہیں اور تمہارے لیے دلیہ بھی بنوا کر بھجوایا ہے۔ اس روز سے وہی تو گھر سنبھال رہی ہیں۔" زویا کو اس کا انداز بے حد برا لگا تھا۔

"اب تم نہ نکل پڑنا ان کی چاکری کرنے۔"

لیکن زویا کو اب چین نہیں تھا۔ اسے گھر میں بھی کام کرنے کی عادت تھی، برتن اٹھا کر کچن میں رکھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر سبزی بنوائی اور دوپہر کا کھانا بھی اس نے ہی تیار کیا تھا۔

فرخندہ بیگم منع کرتی رہیں لیکن اس نے ان کی بھی ایک نہیں چلنے دی تھی۔

اگلے روز خود نسرین کے ساتھ مل کر ساری ڈسٹنگ کی۔ باہر صحن کے گملے پودوں سمیت خوب دھو کر پینٹ کر کے رکھے۔

مہرو کی طرح اسے الگ تھلگ رہنے کی عادت نہیں تھی۔ جب بھی مہرو اور منا سو جاتے۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آ جاتی تھی۔

فرخندہ بیگم کو وہ اچھی تو لگنے لگی تھی لیکن دل ڈرتا تھا کہ کہیں یہ دکھاوا ہی نہ ہو، مہرو نے بھی تھوڑی ڈھیل دے دی کہ اچھا ہی ہے اس طرح ہی سہی بڑی بی مانیں گی تو سہی۔

بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔

☆☆☆

آٹھ دن گزار کر وہ گھر آ گئی تھی۔ فرخندہ بیگم نے آتے ہوئے کہا تھا۔

''اب آتی جاتی رہنا۔ تم سے عجیب انسیت سی ہوگئی ہے۔'' مہرو کے دل پہ یہ الفاظ برچھی کی طرح لگے تھے۔

''اونہہ! انسیت، میں جو سال بھر سے یہاں رہ رہی ہوں۔ مجھے تو کبھی نرم نگاہوں سے بھی نہیں دیکھا اور اس کے ساتھ انسیت، یہ زویا کی بچی جانے کیا گھول کر پلا گئی ہے، میرا تو جینا محال کردے گی اب یہ۔'' اور یہ سچ بھی تھا۔ بعد میں وہ ہر کام میں اسے جتاتی رہیں۔

''تمہاری بہن تم سے بالکل الگ ہے۔ اتنی سلجھی ہوئی، سگھڑ، سلیقہ مند، اگر تمہاری بہن نہ ہوتی تو میں......'' باقی کی بات اندر ہی دبالی۔

حماد نے بہت دنوں کے بعد فون کیا تھا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بات پھر وہیں آ کر رک گئی تھی۔

''امی! اگر آپ دل سے رضامند نہ ہوئیں تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔''

بیٹے کی بات نے ان کا مان بڑھا دیا تھا اور ساری بات اس مان کی ہی تو ہوتی ہے جو ہمیں اپنے سے وابستہ رشتوں پہ ہوتا ہے۔

''میں سچ کہوں تو مجھے بالکل وہ اپنی بیٹی جیسی لگی جیسے میری کوئی پکی سہیلی ہو۔ میرے بالوں میں تیل کی مالش کرتی تھی۔ کبھی فریج سے کوئی فروٹ کاٹ کر لے آتی۔ کبھی میرے ساتھ مل کر کیاریوں میں لگی سبزیوں کی گوڈی کرتی، میرے سارے گملوں کو نیا رنگ بھی کیا اس نے اور کیا کیا بتاؤں، اتنی عادت ہوگئی مجھے ان دنوں میں اس کی کہ اب اس کے بغیر اپنا ہی گھر سونا سونا سا لگ رہا ہے۔''

فرخندہ بیگم کی باتوں میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی اور زویا نے جیسے انہیں مان اور پیار دیا تھا۔ وہ خود کو اس سے محبت کرنے سے روک نہیں پائی تھیں۔

ایسی من موہنی صورت، سادہ اور پرخلوص وہ بھلا کیسے اس کے لیے انکار کرتیں۔

لیکن دل ڈرتا بھی تھا کہ کہیں بعد میں وہ بھی مہرو جیسی ثابت نہ ہو۔ حماد کا دل چاہ رہا تھا وہ خوشی سے ناچے گائے۔

یہ تو اسے بھی نہیں پتا تھا کہ وہ پیاری سی لڑکی دل کی بھی اتنی خوب صورت ہوگی۔

''آپ اپنے دل سے سارے خدشے نکال دیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ آپ کی سوچوں کے برعکس کبھی نہیں ہوگی۔'' اور فرخندہ بیگم مان گئی تھیں۔ حماد اگلی ہی سیٹ سے واپس آ گیا تھا۔ عماد کیسے پیچھے رہتا۔ اسے بھی اپنے بیٹے کو دیکھنے کی جلدی تھی۔

سو چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی کی تاریخ طے ہوئی تو عماد نے سارے پیسے مہرو کو تھما دیے کہ جو خریداری کرنی ہے کرلو، لیکن زویا نے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔

''جو آنٹی میرے لیے پسند کریں گی، وہی ٹھیک ہے۔''

''کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ انہیں کیا پتا آج کل فیشن میں کیا ان ہے۔'' مہرو نے آنکھیں دکھائیں۔

''ان، آؤٹ جو بھی ہوگا۔ میں پہن لوں گی۔ ان کے بھی ارمان ہیں کہ وہ اپنی بہو کی شاپنگ خود کریں۔''

اور فرخندہ بیگم تو یہ بات سنتے ہی نہال ہوگئی تھیں لگتا تھا۔ کسی نے ان میں چابی بھر دی ہو۔ بڑی چاہت اور ارمانوں سے انہوں نے زویا کی بری خریدی تھی۔ مہرو جو سوچ رہی تھی۔

''دیکھتی ہوں، کیا خرید کرلاتی ہیں نک چڑھی شہزادی کے لیے بعد میں ان کپڑوں کو دیکھ کر خود ہی روئے گی۔'' اور اب اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب ایک سے بڑھ کر ایک دیدہ زیب ملبوسات اور

زیورات میں ان کے خاندانی گلوبند اور کنگن سب کچھ زویا کو چڑھایا جارہا تھا۔

وہ تو سوچ رہی تھی کہ ایک ان چاہی بہو ساس کے متھے لگا رہی ہے لیکن یہاں تو کایا ہی پلٹ گئی۔

ہر کام اتنے چاؤ اور چاہت سے ہو رہا تھا کہ اب دن رات سوائے جلنے کڑھنے کے اسے اور کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

''ایک بار یہ شادی ہو جائے، ان کے یہ چونچلے تو میں اتاروں گی۔'' وہ روز کئی ارادے باندھتی اور گھنٹوں کڑھتی رہتی۔

فرخندہ بیگم جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ ان کی سمجھ میں مہرو کی نفسیات آ چکی تھی پھر کسی پر خلوص بندے نے مشورہ دیا تھا کہ دونوں کو توڑنے کا ایک ہی حل ہے کہ چھوٹی کو زیادہ پیار اور اہمیت دو گی تو بڑی کے قدم خود ہی رک جائیں گے۔

اس لیے زویا کا پرتپاک استقبال ہوا تھا۔

سرخ عروسی لباس میں اس کا مسحور کن حسن اور حماد کی وارفتہ نگاہیں، مہرو کو تو جیسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''شاید میں نے کچھ غلط کر دیا ہے۔'' اس کی خواہش پہ دونوں کا رشتہ ہوا تھا اور اب وہ خود ہی حاسدانہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

عماد شادی کے ایک ہفتے بعد واپس چلا گیا تھا اس کے اپنے مسئلے تھے۔ پیچھے اسٹور کا کام رکا ہوا تھا۔

انہیں دعوت پر جانا تھا۔ زویا بھاری کام والا جوڑا پہنے تیار تھی۔

''تم یہ سوٹ پہن کر جاؤ گی؟'' مہرو نے دیکھتے ہی اعتراض کیا۔

''ہاں۔ آنٹی نے کہا تھا تو......''

''تم کیا کوئی بچی ہو جو ہر کام آنٹی کے کہنے پہ کرو گی۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر غصے سے بولی۔

''اب انہوں نے میرے لیے بنوائے ہیں تو ان کا دل چاہتا ہے۔ میں انہیں پہن کر دکھاؤں پھر کیا فرق پڑ جائے گا اگر چار دن ان کی مرضی سے پہن لوں گی۔ آئی ایم کمفرٹیبل۔''

حالانکہ اتنے بھاری بھرکم ملبوسات اور زیور خود پہ چڑھا کر وہ بالکل ایزی نہیں ہوتی تھی۔

لیکن ہر ساس کو یہ ارمان ہوتا ہے کہ اس کی بہو بری کا جوڑا پہنے تو چار دن پہن لینے سے کوئی حرج نہیں ہو جاتا۔ زویا کو بھی ان کے چہرے کی مسکراہٹ بھلی لگ رہی تھی جیسے وہ اس کی تیاری سے مطمئن ہوں اور بس یہی نہیں زویا ان کی ہر پسندیدہ بات کو اختیار کر رہی تھی۔

صبح وہ جلدی اٹھ کر کمرے سے باہر آ جاتی تھی نماز، قرآن ان کے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ مہرو آج کل خوب گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ حمزہ کے ساتھ اسے گھر بھی دیکھنا پڑ رہا تھا۔

نہ نیند پوری ہو رہی تھی نہ کوئی کام ڈھنگ سے ہو رہا تھا۔

اس پر زویا کی سج دھج ہی الگ تھی۔ ساس کی ناز برداریاں اور حماد کی نظریں، سب اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

وہ اپنا میلا حلیہ دیکھتی، حمزہ کا رونا دھونا، اور کاموں کا انبار...... عماد بھی اس بار اس سے روٹھا روٹھا سا ہی رہا تھا۔ وہ اسے بھی مکمل وقت نہیں دے پائی تھی۔

اور اب یہ نیا نویلا جوڑا اور ان کی شوخ کھنکتی ہنسی، اس کے جذبوں میں انگارے بھر جاتے تھے۔

صبح ناشتے کے دوران روتے ہوئے حمزہ کو اس نے زویا کو پکڑانا چاہا تو فرخندہ بیگم فوراً بول اٹھی تھیں۔

''لاؤ مجھے دو، زویا کو ڈھنگ سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دے گا۔'' حمزہ کو اٹھاتے ہوئے انہوں نے بڑے لاڈ سے زویا کو دیکھا تھا۔

وہ کچن میں آ کر برتن پٹخنے لگی۔

''خود دیکھ لو، اتنا سا کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر پاتی۔''

فرخندہ بیگم نے زویا سے کہا تو وہ خوامخواہ نظریں

چڑ گئی اور ایسا تو ہر بار ہوتا تھا۔ مہرو کی حرکتیں اسے کوفت میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

اب بھی برتن پٹخ کر وہ سب کو یہ تاثر دے رہی تھی کہ جیسے بڑی بیزاری اور بے دلی سے وہ ناشتہ بنا رہی ہے اور زویا تو یہ کام منٹوں میں کر لیتی تھی۔

اگلے روز سے اس نے نیا حربہ ڈھونڈ لیا تھا جب بھی حماد باہر سے گھر آتا۔ وہ حمزہ کو اٹھا کر زویا کو دے آتی اور خود نہ جانے کن نادیدہ کاموں میں اس قدر مصروف ہوتی کہ دو دو گھنٹے گزر جاتے۔ اسے بچے کی پروا ہی نہیں ہوتی تھی۔

حماد کو بھی وہ بچہ بہت عزیز تھا لیکن ان دنوں اسے بس زویا عزیز تھی۔ وہ اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا اور اگلا ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مہرو نے اس سے کہہ دیا تھا۔

''زویا! کچھ میٹھا بنا لو اور اپنا گھر سنبھالو۔'' اور اس معاملے میں وہ فرخندہ بیگم کے انکار کو بھی خاطر میں نہیں لائی تھی۔

زویا نے میٹھے میں زردہ بنایا تھا، اتنا لذیذ اور مزیدار۔ ایک ایک دانہ نکھرا ہوا، بڑے فخر سے سارے محلے میں بانٹا۔

''مہرو نے جو کھیر بنائی تھی، اسے بانٹتے ہوئے تو مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا اور آج تعریفیں سمیٹ سمیٹ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں خود دو پلیٹیں کھا گئی ہوں۔''

زویا کی تعریف کے ساتھ اسے انعام میں ہزار روپے بھی دیے تھے۔

اور یہ سارا منظرنامہ مہرو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

''تم یہاں کیا میری بے عزتی کروانے آئی ہو۔'' اس نے زویا کو بالکونی میں جا لیا۔ مارے غصے کے چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''میں تمہاری بے عزتی کروا رہی ہوں یا تم ہر بات میں مجھے شرمندہ کروا رہی ہو۔'' زویا کو پہلے ہی اس پہ بہت غصہ تھا۔ اس کی ساری حرکتیں کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔

''کسی اونچی اڑان میں مت رہنا۔ ساری بڑھیا کی چال بازیاں ہیں جو ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

''مہرو! ذرا تمیز ہی سیکھ لو...... کیسے بات کر رہی ہو۔''

''تمہیں سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں، اب امی ہی تم سے بات کریں گی۔'' وہ کہہ کر بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں چلی آئی اور نصرت بیگم کو ایک کی دس لگائیں۔

رات کو اس کے سیل فون پر ان کی کال آ رہی تھی۔

حماد بھی پاس تھا۔ وہ جانتی تھی کیا ٹاپک ہوگا سو اس نے سیل فون ہی آف کر دیا۔ اس عجیب صورت حال پر اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

''جناب کا موڈ کیوں خراب ہے۔'' وہ کب سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''نہیں تو۔'' وہ بدقت مسکرائی۔

''چلو، تمہیں باہر گھمانے لے کر جاتا ہوں۔'' حماد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا جیسے ابھی کھینچ کر لے جانا چاہتا ہو۔

''مجھے تیار تو ہونے دیں۔''

''بھلا اس سے زیادہ کیا تیار ہو گی۔'' میرون سوٹ پہ گہری میرون لپ اسٹک میں وہ کس قدر جچ رہی تھی، یہ کوئی حماد سے پوچھتا۔

''یہ تو عام سا جوڑا ہے اور ایسے ہی لپ اسٹک لگالی تھی۔''

''مجھے تو عام جوڑے میں بھی سب سے خاص لگ رہی ہو۔'' حماد نے کہا تو وہ مسکرا پڑی۔

''لیکن لوگوں کی نظریں آپ جیسی نہیں ہوں گی۔''

''لوگوں کی نظروں کو ہم نے خود یہ لگوانا بھی نہیں۔'' وہ چابی اٹھا کر نکل گیا۔ زویا کو بھی تقلید کرنا پڑی۔

راستے میں مہرو کھڑی تھی۔
''تم کہاں جارہی ہو۔اچھا۔ایک کپ چائے تو بنا دو۔سر میں اتنا درد ہو رہا ہے۔''
''جاؤ تم۔حماد باہر انتظار کر رہا ہے اور تم ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا لینا۔''
زویا کو باہر بھیج کر فرخندہ بیگم نے اگلا حکم مہرو کو دیا تھا وہ پیچ و تاب نہ کھاتی تو کیا کرتی۔
☆☆☆
چند روز گزرے تھے۔مہرو کی طبیعت پھر سے خراب رہنے لگی تھی۔دل خراب، متلی، چکر چیک کیا تو رپورٹ پازیٹو تھی۔
خوش ہونے کے بجائے اس نے تو نیا سیاپا ڈال دیا تھا۔
''اتنی جلدی۔ابھی تو حمزہ سات ماہ کا ہے۔'' وہ رونے بیٹھ گئی تھی۔
''یار! ایسے ناشکری نہ کرو۔میں ہوں نا۔تم کیوں فکر کرتی ہو۔میں پال لوں گی اسے، بس یہ رونا دھونا بند کر دو۔''
وہ مہرو کا واویلا نصرت بیگم سے چھپانا چاہ رہی تھی ورنہ خواہ مخواہ گھر کا ماحول خراب ہوتا اور اس کے بعد سے تو مہرو نے گویا ہاتھ پاؤں ہی ہلانے چھوڑ دیے تھے۔ہر کام زویا کے سپرد کر کے وہ سارا دن پلنگ توڑتی تھی۔سارے آرڈر وہیں سے پاس کیے جاتے۔
جب کاموں سے تھک کر کمرے میں آتی تو وہ حمزہ کو اس کی گود میں ڈال جاتی کہ ''بہت تنگ کر رہا ہے۔ساری رات بھی سونے نہیں دیا اور مجھے بہت نیند آرہی ہے۔''
فرخندہ بیگم کچھ کہتیں تو شکایتوں بھرے فون اماں کو کھڑکائے جاتے تھے اور اماں اس کی خوب ہی کلاس لیتیں۔
''زویا تمہیں بہن کا خیال کرنا چاہیے۔چھوٹا بچہ ہے اور اوپر سے حالت بھی ایسی تو کیا ہو جائے گا اگر تم ہی کام کر دیا کرو اور اپنی ساس کو بھی سمجھاؤ کہ ہر وقت اس کے ہی پیچھے نہ پڑی رہا کرے، میرے بھی گھر میں بہویں ہیں۔عیش کر رہی ہیں۔بس میری بیٹی کو ہی سکھ نہیں۔'' سارا مہرو کی لگائی بجھائی کا اثر تھا جو اماں اس کی اتنی طرف داری کر رہی تھیں۔
''وہ بھی عیش ہی کر رہی ہے۔آپ کو پتا نہیں کیا کچھ سنا دیتی ہے۔آپ کو اس کے مزاج کا پتا......''
''پھر بہن کی خامیاں کھنگال رہی ہو، ارے میکے اور سسرال میں فرق ہوتا ہے۔وہاں اس کی ہر خامی پر تمہیں ہی پردہ ڈالنا ہے اور۔'' زویا نے خود ہی فون بند کر دیا۔
''چاہے اس کے لیے خود بری بن جاؤ۔'' وہ خاموشی سے باہر سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔حماد الگ اس سے خفا تھا۔کہتا کچھ نہیں تھا لیکن اس کے انداز بتاتے تھے کہ وہ اس کی روٹین سے سخت بیزار ہو رہا تھا، گنتی کے چند روز رہ گئے تھے پھر اسے چلے ہی جانا تھا اور ابھی تک تو ان کی باتیں ہی پوری نہیں ہوئی تھیں۔
اتنا کچھ تھا جو کہنا تھا، سنانا تھا اور فرصت......
مہرو جتنا ٹائم انہیں دے سکتی، دے رہی تھی۔
''حماد! کچھ دنوں کے لیے اسے کہیں باہر لے جاؤ۔بھلا ایسی ہوتی ہیں نئی نویلی دلہنیں...... سونی کلائیاں بے رنگ ہاتھ اور سادہ کپڑے۔چند ہی دنوں میں مرجھا کر رہ گئی ہے زویا۔''
فرخندہ بیگم نے خود ہی حماد کو بلا کر کہا تھا اور وہ شمالی علاقہ جات کے ٹکٹ لے آیا تھا۔
''زویا! تم میری طرف ہو یا ان کی طرف ہو۔'' وہ اپنی پیکنگ کر رہی تھی جب مہرو بہت اکھڑی سی اس کے پاس آئی تھی۔
''اب کیا ہوا۔''
''تمہیں پتا بھی ہے، میری حالت کیسی ہے پھر بھی تم نے جانے کا پروگرام بنا لیا۔منع بھی تو کر سکتی تھیں۔''
''چند دنوں کی بات ہے پھر حماد کو چلے ہی جانا ہے۔میں اس کو خفا نہیں کر سکتی۔''

بتا نہیں پا رہی تھی کہ اس نے بھی شکر ادا کیا تھا جو اس کی جان چھوٹ رہی تھی ورنہ تو ایسا ماحول بنا ہوا تھا کہ وہ تنگ ہی آ گئی تھی۔

"اور بہن کو خفا کر سکتی ہو۔"

"نہیں۔" اس نے کہہ کر جان چھڑائی۔

"تو پھر مت جاؤ۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر میں بھی جا رہی ہوں جب تم واپس آؤ گی تو میں بھی آ جاؤں گی۔" زویا سے پہلے ہی وہ اپنا بیگ تیار کر کے میکے چلی گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں رکھ لوں گی اپنا خیال۔ تم لوگ جاؤ۔" فرخندہ بیگم نے بہت سی دعائیں اور تسلیاں، دلاسے دے کر رخصت کیا تھا۔

پہلی بار حماد کے دل میں مہرو کے لیے گرہ لگی تھی۔

☆☆☆

"تم بھی کبھی مہرو جیسی تو نہیں ہو جاؤ گی۔ میرا دل ڈرتا ہے کہ کسی دن تم بھی میری امی کی پروا کرنا چھوڑ دو گی یا پھر ان کے خلاف میرے کان بھرو گی۔" آخری جملہ شرارت سے بھرپور تھا۔

وہ پہلے تو خفا ہوئی پھر مسکرا دی۔

"شوہر کو گھر والوں سے الگ کرنے کے چکر میں محض آپسی تعلق ہی خراب ہوتا ہے اور کبھی کبھار ٹوٹ بھی جاتا ہے اور میں تو یہی چاہتی ہوں سب مل جل کر رہیں۔ مہرو کی عادت ہے، وہ جلد بدگمان ہو جاتی ہے۔"

"پھر تم اس کی بہن ہو۔ اب اس کی مخالفت تو نہیں کرو گی۔"

"ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" زویا نے اسے تسلی دی کہ وہ سب سنبھال لے گی۔

☆☆☆

دو ہفتے گزار کر وہ لوگ آ گئے تو مہرو بھی گھر آ گئی تھی۔ اس سے تین روز بعد حماد کی فلائیٹ تھی۔ وہ بھی چلا گیا تھا۔ کچھ روز اداسی کی نذر ہوئے فرخندہ بیگم نے اس سے کہا تھا۔

"میرے کمرے میں سو جایا کرو۔" اس نے بھی حامی بھر لی حالانکہ آدھی رات کے بعد حماد کی کال آتی تھی اور اسے جتنی بھی نیند آئے، وہ جان نہیں چھوڑتا تھا جانے اسے کہاں سے اتنی باتیں آتی تھیں۔

اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور کبھی تو فون کان سے لگا ہوتا اور وہ سو جاتی تو حماد کال ڈس کنیکٹ کر کے دوبارہ ملاتا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھتی تھی۔

دوسری جانب وہ قہقہہ لگا کر ہنستا تھا۔

"دیکھ لو، دور رہ کر بھی مجھے تمہیں جگانا آتا ہے۔"

"میں سوئی کب تھی۔" وہ صاف مکر جاتی۔

"یار! میرا بالکل دل نہیں لگ رہا۔ میں کیسے رہوں تمہارے بغیر۔" بس آج کل یہ اس کا من پسند جملہ تھا۔

"رہنا تو پڑے گا۔" وہ جان کر چھیڑتے۔

"اوئیں، ایک تو اتنی مشکل سے تمہیں پایا ہے تو کیا ساری زندگی ان دوریوں، جدائیوں میں ہی کٹ جائے گی۔ کبھی نہیں۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتا ایک دو جگہ اپلائی کیا ہے جہاں سے بھی مثبت جواب ملا۔ میں نے آ جانا ہے۔"

"یہ کیا تم نے فوراً ہاں کر دی، میں تم سے کہنے والی تھی کہ تم میرے بیڈروم میں سویا کرو، پتا بھی ہے حمزہ کتنا تنگ کرتا ہے۔" فرخندہ بیگم کے اٹھتے ہی مہرو نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"اب تو میں نے بول دیا ہے۔" اسے لگتا تھا وہ ان ساس، بہو کے بیچ بالکل پنڈولم بن گئی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کی مخالفت میں اس قدر پکی تھیں کہ وہ بے چاری کرے تو کیا۔

"تو کیا ہوا۔ اب منع کر دو۔" اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

"اچھا ایک دو روز میں دیکھوں گی۔" اس نے ٹرخانا چاہا۔

"نہیں۔ تم ابھی بول کر آؤ۔" یہ اچھی زبردستی

تھی۔

''جب حمزہ تنگ کرے تو تم مجھے بلا لینا۔ میں آجاؤں گی۔'' اس نے بیچ کی راہ نکالی لیکن مہرو نے گھورنا بند نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

''بڑی آئی ساس کی چمچی، اپنی بہن کو چھوڑ کر اس کی طرف داری کرتی ہے۔'' سارا غصہ اس نے حمزہ کو تھپڑ مار کر نکالا تھا۔

زویا نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھالیا۔

''یہ کیا طریقہ ہے۔ اس پہ کیوں غصہ اتار رہی ہو۔''

''تم جاؤ، ان بڑی بی کے پاؤں دباؤ۔ اتنا اچھا موقع میں تمہاری وجہ سے ضائع نہیں کر سکتی۔''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ان کے بیٹوں کی کمائی ہے جہاں چاہیں خرچ کریں۔''

''ستر ہزار کم نہیں ہوتے۔''

''بھاجی کی شادی پہ دیے ہیں۔''

''یہ تو آج میں نے دیکھ لیا ورنہ جانے کتنا لٹاتی رہی ہیں۔ پردیس میں رہ کر ایسے تو نہیں پیسہ کمالیا جاتا میں نے عماد سے کہہ دیا ہے کہ وہ پیسے میرے اکاؤنٹ میں بھجوایا کرے، اب سے گھر کا خرچ میں ہی چلاؤں گی۔''

''مہرو! یہ......'' ابھی بات اس کے منہ میں تھی جب فرخندہ بیگم بھی آ گئیں۔

''تم کون ہوتی ہو میرے گھر کے فیصلے کرنے والی۔''

''جتنا یہ گھر آپ کا ہے۔ اتنا میرا بھی ہے۔'' اسے یہ شہ عماد نے ہی دی تھی، اسے اگلے بندے کا دماغ گھمانا آتا تھا۔ اسے جانے کیا کچھ سنایا تھا کہ وہ سیخ پا ہو گیا تھا۔

''میں یہاں پردیس کاٹ رہا ہوں۔ بیوی بچوں سے دور، اور امی ایسے میری کمائی لٹا رہی ہیں۔''

''یہ گھر بھی میرا ہے اور عماد بھی میرا ہی بیٹا ہے۔''

''اور اب آپ کا وہ بیٹا میرا شوہر ہے۔'' اس نے استہزائیہ کہا۔

''مہرو۔'' زویا نے تنبیہی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر۔

''دیکھ رہی ہو اس کی زبان۔'' اب کی بار مخاطب زویا تھی۔

''نہیں امی! آپ اس گھر کی بڑی ہیں۔ آپ کے ہوتے ہوئے یہ کیوں کرے گی گھر کے فیصلے جو جیسا آپ چاہیں گی۔ ویسا ہی ہوگا۔'' زویا نے انہیں کول ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر دونوں ساس بہو نے آج ایک دوسرے کو سنانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اس کی بات نہ کوئی مان رہا تھا نہ سن رہا تھا۔

وہاں باہر حماد بھی عماد سے الجھ پڑا تھا کہ تمہاری بیوی کی یہ مجال......اور عماد کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی غصے میں کی بات کا مہرو اتنا بتنگڑ بنائے گی۔

اس نے مہرو سے بات کی، وہ اپنے مطالبے سے ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ غصے میں اس نے کہہ دیا۔

''جاؤ اپنی ماں کے گھر جا کر اپنے یہ چونچلے پورے کرو۔''

اس نے بھی اٹھایا بچہ اور چلی گئی۔

وہاں جا کر جانے کیا داستان سنائی تھی کہ زویا کو بھی گھر سے فون آنے لگے تھے کہ......''جب اسے نکال دیا تو تم وہاں کیا کر رہی ہو تم بھی گھر آ جاؤ۔''

اور وہ حیران پریشان ......بھلا اس کا کیا قصور تھا۔ اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

عماد جھگڑا نبٹا نے گھر آ گیا۔ مہرو کو بھی لے آیا لیکن فرخندہ بیگم نے زویا سے کہہ دیا تھا۔

''کل سے میرا کھانا الگ بنانا مجھے عماد کی کمائی نہیں چاہیے۔'' عماد نے بہت منایا پھر سوچا، چند روز میں غصہ اتر جائے گا تو خود ہی مان جائیں گی۔ نئے گھر کی تعمیر شروع ہو چکی تھی۔

آدھا کام وہ کروا کر گیا تھا آدھا اب ٹھیکے پہ دے کر خود واپس چلا گیا تھا ان ہی دنوں مہرو کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔

☆☆☆

زویا نے کچن کو دو حصوں میں الگ الگ بانٹ دیا تھا۔ مہرو دیکھ کر دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

"تم میری طرف ہو یا اس بڑھیا کی طرف۔"

"دونوں۔" اس نے مسکین صورت بنالی۔

"تو پھر آج تمہیں کسی ایک کو چننا ہوگا۔"

"میرے پاس چوائس کا اختیار ہی کہاں ہے جب حماد اپنی ماں کے ساتھ رہے گا تو میں بھی ان کے ساتھ ہی رہوں گی نا۔"

"اتنی بھی بے چاری نہیں ہو تم۔" کہہ کر وہ اس کے مزید قریب ہوئی۔

"یہی موقع ہے زویا! جب انہوں نے خود ہی کہہ دیا ہے تو تم میرے ساتھ رہو۔ کتنے دن اکیلی رہیں گی۔ خود ہی دماغ درست ہو جائے گا پھر اس گھر پہ ہماری ہی حکومت ہوگی۔"

"دفع ہو تم۔" وہ اس کے پاس سے ہی اٹھ گئی تھی۔ لیکن اگلے روز سے اس کا مزید امتحان شروع ہو چکا تھا۔

مہرو کا کبھی لہسن ختم ہو جاتا۔ کبھی چینی تو کبھی گھی، اور وہ زویا سے مانگتی تھی وہ بھی فرخندہ بیگم کے سامنے۔

"کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ دکان دور نہیں ہے۔ خود جا کر لائے۔" پھر کیا تھا وہ بچے اس کے حوالے خود نکل جاتی۔

محلے میں دوستیاں بھی گانٹھ لیں۔ دس منٹ کا کہہ کر جاتی اور دو دو گھنٹے لگا کر آتی تھی۔

ہانڈی بنانے کچن میں آتی تو کسی نہ کسی بچے کا باجا اسٹارٹ ہو جاتا۔ سارا کام اس کے حوالے کر کے وہ جو غائب ہوتی تو زویا کے کچن سمیٹنے پر ہی واپس آتی تھی۔

☆☆☆

حماد کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی جاب مل گئی تھی۔ زویا کے رخساروں کی سرخیاں لوٹ آئیں۔ حماد بھی لوٹ آیا تھا۔

فرخندہ بیگم آج کل اٹھتے بیٹھتے بس ایک ہی دعا کرتی تھیں کہ اللہ زویا کی گود بھی بھر دے۔

مہرو سوچ کر استہزائیہ ہنستی۔

"اگر زویا کے بچے ہو گئے تو میرے بچے کون سنجالے گا۔ اس لیے ابھی دو چار سال تو نہیں ہونے دوں گی۔"

حماد جب بھی باہر سے آتا۔ شام کی چائے مہرو بناتی تھی۔ بس یہ ایک کام تھا جو وہ بڑی مستعدی اور جانفشانی سے کرتی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں باہر صحن میں بیٹھے تھے۔ حمزہ اور ولی اس کے پاس ہی کھیل رہے تھے۔ حماد پانی لینے کچن میں گیا تھا اور دروازے سے پلٹ کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ کچھ تھا جس نے اسے چونکا دیا تھا۔

اور کھٹک تو وہ بہت دنوں سے رہا تھا لیکن آج وہ جان بوجھ کر اس کے تعاقب میں آیا تھا۔ بعد میں اس نے وہ گولی نکالی۔

تو اس کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے۔

وہ زویا کو مانع حمل گولیاں دیتی تھی۔ وہ روز حیران ہوتا تھا کہ مہرو جو سارا دن بہانے بہانے سے اپنے کام زویا کے نام لگاتی رہتی تھی۔ شام کی چائے میں اس قدر اہتمام کیوں کرتی تھی۔

اس کے بعد گھر میں ایسا طوفان اٹھا تھا کہ اتنے قریبی رشتے ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہے تھے۔

زویا نے تو اس کی سمت اب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

عماد کا باہر کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ لڑائی اس قدر بڑھی کہ پولیس تھانے کی نوبت آ گئی۔ وہ سب چھوڑ چھاڑ محض اپنی جان بچا کر آیا تھا اور آگے یہ تماشا اس کا منتظر تھا۔

اس نے مہرو کو ایک بار پھر گھر سے نکال دیا تھا۔

اس عورت کی باتوں میں آ کر اس نے ماں کو ناراض کیا تھا۔ بھائی سے جھگڑا کیا اور آج دیوالیہ ہو کر گھر بیٹھا تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا۔

"جو اپنی بہن کی سگی نہ بنی، وہ میری کیا بنے گی۔"

☆☆☆

اور مہرو کو یقین تھا۔ زویا اسے اس گھر سے

جانے نہیں دے گی اور پھر اب وہی تھی جو اس کا گھر بچا سکتی تھی۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہ اوپر چھت پہ آئی تھی۔ زویا نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔

''پلیز زویا! مجھے معاف کر دو، جب سے تم ناراض ہو، مجھے ایک پل بھی سکون نہیں ملا۔''

''سکون انسان کی نیت میں ہوتا ہے اگر ہم صرف اپنی نیت شفاف کرلیں تو کوئی بات کبھی ہمیں بے چین نہ کرے۔''

''میری اور آنٹی فرخندہ کی نیت ایک دوسرے کے لیے شفاف تھی۔ انہوں نے بیٹی کہا تو میں نے بھی ماں ہی سمجھا۔ انہوں نے مجھ سے پیار کیا تو میں نے بھی ہمیشہ ان کا مان رکھا۔ کبھی جو انہوں نے ڈانٹ دیا تو میں نے مسکرا کر ٹال دیا بس اتنی سی بات نے میری زندگی کو پرسکون بنا دیا۔ اور تم سب پانے کی چاہ میں آج خالی ہاتھ بیٹھی ہو۔

تم مجھے اس گھر میں بیاہ کر لائیں تو اپنے مطلب، اپنے مفاد کے لیے، مجھے اپنے ساتھ ملا کر تم فرخندہ آنٹی کو نیچا دکھانا چاہتی تھیں۔

جس کے لیے تم نے اتنی سازشیں کیں کہ تمہارا دماغ ہر وقت نیگیٹو ہی رہا اور منفی چیزیں، منفی سوچ، منفی جذبات انسان کو کبھی پرسکون نہیں ہونے دیتے۔

پھر تمہارے دماغ کو اس بات نے پریشان کیا کہ ساری کمائی تو تمہارے میاں کی خرچ ہو رہی ہے تو تم نے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ آج دیکھو، الگ ہونے کا کیا فائدہ ہوا۔

رشتے دکھ سکھ میں ساتھ نبھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ منفی جذبات اور انتقام کی بھینٹ چڑھانے کے لیے نہیں۔ میں نے تمہارے بچوں کو راتوں کو جاگ کر سنبھالا اور تم مجھے مانع حمل گولیاں دیتی رہیں۔''

''زویا۔'' مہرو نے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔

''میں مانتی ہوں۔ میری غلطی تھی، میں آنٹی سے بھی معافی مانگ لوں گی ہم۔ سب اس گھر میں مل کر رہیں گے۔''

''کون سا گھر؟'' پہلی بار وہ استہزائیہ ہنسی۔

''وہ نیا گھر عماد بھائی نے فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ انہیں اپنے کاروبار کے لیے رقم چاہیے۔ اور حماد کو کمپنی کی طرف سے فرنشڈ گھر مل چکا ہے ہم سب وہیں شفٹ ہو رہے ہیں اور رہا یہ گھر تو یہ تمہیں ہی مبارک ہو، وہ بھی اگر تمہیں ملا تو۔''

''زویا۔'' مہرو نے پکارا لیکن وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

عماد تو اس کی سمت دیکھنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

''بزرگوں کا وجود گھر میں باعث برکت ہوتا ہے شاید تمہیں جو ل رہا تھا۔ وہ میری ماں کے نصیب اور دعاؤں سے تھا اور میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ مجھے انتخاب کے دوراہے پر لا کر کھڑا کیا گیا تو میں اپنی ماں کو نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ عماد کے الفاظ تھے۔

وہ بچوں کو لے کر میکے آ گئی تھی۔ یہاں بھی کوئی سیدھے منہ اس سے بات نہیں کر رہا تھا۔ بھاوجیں تو پہلے ہی اس سے تنگ تھیں۔ ایک ماں کا وجود تھا تو اس بار اس نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

وہ اکیلی ہی روتی تڑپتی رہی۔

دو مہینے گزر گئے تھے اور اسے کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ زویا میکے نہیں آئی تھی تو نصرت بیگم ایک دن خود ہی چلی آئی تھیں۔

زویا کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ تم معاف کر دو تو سب معاف کر دیں گے۔ وہ ماں کے ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

''آپ کو آج بھی اس کا ہی دکھ نظر آتا ہے۔''

''معاف کرنے کا بڑا اجر ہے زویا! کیا پتا تمہاری یہی نیکی تمہارے آنگن میں پھول کھلا دے۔'' وہ خاموش رہی۔ دل تو نہیں مان رہا تھا لیکن اس نے ہی عماد بھائی کی منت کی تھی۔

اور وہ جا کر اسے گھر واپس لے آئے تھے اور مہرو کی نگاہیں مزید جھک گئی تھیں۔ کیا کچھ کھو دیا تھا اس کے مان، اعتبار، رشتے۔

رشتوں کی قدر اور اہمیت اسے بڑی دیر سے سمجھ میں آئی تھی۔ شاید وہ بھی اپنی نیت کو شفاف کرلے تو سب ایک بار پھر سے پہلے جیسا ہو جائے۔

☆

صبا شوکت

ام ہانی

ام ہانی میری کزن تھی، میری خالہ زاد۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کب ہمارے گھر آئی تھی، شاید اپنی پیدائش کے چند دن بعد جب اس کے اماں، ابا ایک حادثے میں چل بسے اور میری والدہ جو کسی مدر ٹیریسا سے کم نہیں، ان کی محبت نے جوش مارا اور لے آئیں بچی کو ہمارے گھر۔ بہرحال!

ام ہانی کوئی بری بچی نہیں تھی۔ اس کے ہونے یا نہ ہونے سے میری اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ کم گو تھی اور چونکہ میں کچھ مغرور قسم کا تھا تو اس کی کم گوئی مجھے زہر لگا کرتی تھی۔ اس لیے مجھے وہ بچپن سے ہی بری لگتی تھی۔

وہ شکل وصورت کی بری نہیں تھی اور ذہین تو بلا کی تھی۔ میں چونکہ کچھ زیادہ ہی خوش شکل تھا تو میرے لیے یہ معاملہ گھر کی مرغی دال برابر والا ہی تھا۔ اس نے ماسٹرز کے بعد ایم فل کر لیا اور اس کی اچھی خاصی نوکری مجھ سے پہلے ہو گئی۔ (میں کوئی نکما نہیں تھا بس اس مینسی کا وقت ان دنوں اچھا چل رہا تھا) نوکری کے بعد تو وہ مجھے کچھ زیادہ ہی زہر لگنے لگی۔ خیر میرے قدموں میں تو پہلے بھی نہیں بچھی رہتی تھی لیکن اب تو میری طرف دیکھنے سے بھی گریز برتنے لگی۔ میرا نام تو اس کے لیے شجرِ ممنوعہ ہو گیا۔ میرے نام میں کوئی برائی نہیں تھی بس وہ ہی خود کو کوئی اعلا شے سمجھتی تھی۔ بھلا ''عبدالہادی'' بھی کوئی ایسا نام ہے جسے لے کر کوئی خود کو گناہ گار سمجھنے لگے؟

خیر! مجھے اس بات سے کوئی ایسا خاص فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ وہ مجھے اہمیت دیتی ہے یا نہیں لیکن اگر اس قدر خوبرو اور اسمارٹ (اللہ اللہ) لڑکے کو اس کی کزن ہی گھاس نہ ڈالے تو یہ بات تشویش ناک تو تھی نا؟

اس دن بھی وہ ڈنر کے وقت عادتاً اپنی پلیٹ پر جھکی تھی۔ (ایک تو اس بندی کے مینرز مجھے تپائے رکھتے تھے) میں نے ایک نظر اس پر اور دوسری امی پر ڈال کر لہجے کو سرسری بناتے ہوئے کہا۔

''امی! سرمد اپنا رشتہ بھیجنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کیوں؟'' اس معصومیت نے مجھے سخت تپا دیا۔

''میرے لیے، مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے وہ۔'' اپنی طرف سے میں نے جل کر جواب دیا مگر امی تو مجھ سے اکھڑ گئیں۔

''ہائے...... دماغ خراب ہو گیا ہے کیا اس کا؟ ساری دنیا کی لڑکیاں مر کھپ گئی ہیں جو وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ لیکن تم کان کھول کر سن لو ہادی! میری زندگی میں تو ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ میں ہونے نہیں دوں گی، اور میرے مرنے کے بعد بھی تم ایسا نہ سوچنا۔'' اس ساری تقریر کے دوران میں ضبط سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

''اف! توبہ ہے آپ سے امی۔'' میں نے دانت پیس کر ایک نظر ام ہانی پر ڈالی وہ سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔

''ان محترمہ کے لیے رشتہ بھیجنا چاہتا ہے وہ۔'' اس دفعہ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''کیا واقعی؟'' امی فوراً...... پرجوش ہو گئیں۔

میں اسے بے چین کر چکا تھا اب اطمینان سے اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ اچانک ہی وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ کوئی رشتے کروانے والی آنٹی نہیں ہیں ہادی بھائی! اس لیے یہ ڈیپارٹمنٹ ان ہی کے لیے چھوڑ دیں۔'' وہ دھپ دھپ کرتی چلی گئی، میں نے کھسیا کر امی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراہٹ دبائے مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''ہونہہ! احمق......'' میں نے غصے سے سر جھٹکا۔

''تم خود کیوں نہیں کر لیتے اس سے شادی عبدالہادی! کیا کمی ہے اپنی ہانی میں؟'' امی نے سرسری انداز میں کہا۔ کیونکہ وہ بچوں کی مرضی کے خلاف ان پر زبردستی رشتے تھوپنے کی قائل نہیں تھیں۔

''خدا کے واسطے امی! میرا ابھی تین چار سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں، اگر آپ تب تک اسے میرے انتظار میں بٹھا سکتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے اطمینان سے اپنا نقطہ نظر بیان کیا کیونکہ جانتا تھا کہ امی اتنا انتظار بہر حال نہیں کریں گی۔

''میرا دماغ خراب نہیں ہے جو ایسا کروں، ابھی وہ چھبیس کی ہے، تین سال بعد انتیس کی

ہو جائے گی اور پھر تم میں ایسے ہیرے بھی نہیں جڑے کہ تمہارے انتظار میں اسے بٹھائے رکھوں۔'' امی نے سر جھٹکتے ہوئے مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''ویسے سرمد کے رشتے میں کوئی برائی نہیں ہے۔'' کن اکھیوں سے ان کے تاثرات جانچے، کہیں پھر سے کوئی پھلجھڑی نہ چھوڑ دیں۔

''ہمم! دیکھتی ہوں۔'' انہوں نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا تو میری باچھیں پوری کی پوری پھیل گئیں۔

☆☆☆

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے ہادی بھائی!''

میں جو فائلز میں سر دیئے بیٹھا تھا، سرسری نظر اس پر ڈالی۔ اس گھر میں گزارے چھبیس سالوں میں میرے کمرے میں وہ بمشکل چھ بار آئی ہوگی۔ لیکن آج مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور میرے کمرے میں آئے گی اور وہ آ گئی تھی۔ یوں اس کی اتنے لمبے عرصے بعد میرے کمرے میں موجودگی اس کی شدید بے چینی کا پتا دے رہی تھی۔ اس کی بے چینی کا سوچ کر میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ میں خواہ مخواہ مسکرا دیا۔

''میں متوجہ ہوں!'' میں نے سر دوبارہ فائل پر جھکا دیا۔

''آپ خالہ امی کو اس رشتے سے انکار کر دیں۔'' وہ بلاتمہید بولی۔

''وجہ......؟'' اس کے نڈر انداز نے مجھے بری طرح چڑا دیا تھا۔ میں کرسی گھسیٹ کر اٹھا اور اس کے سامنے آن رکا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''وجہ آپ ہیں عبدالہادی سکندر!'' میں وجہ جان کر تفاخر سے مسکرایا۔

''بہرحال! اگر تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے تو خود جا کر امی سے کہو۔'' میں نے لاپروائی سے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ اس کی آنکھوں میں بس ایک پل کے لیے بے یقینی ٹھہری پھر وہ چلی گئی۔

میں نے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں، یہ احساس ہی کتنا فرحت آمیز تھا کہ میری وہ عجیب سی کزن مجھ پر بہت پہلے سے عاشق تھی، بس خواہ مخواہ نخرے دکھاتی تھی یا شاید توجہ حاصل کرنے کے بہانے۔

☆☆☆

اور پھر ام ہانی کو کوئی اعتراض نہیں رہا تھا۔ جب امی نے مجھے آ کر بتایا کہ وہ اس رشتے پر راضی ہے تو پہلے میں حیران ہوا تھا کہ وہ اتنی جلدی مان گئی۔ پھر مجھے شدید غصہ آ گیا کہ وہ مجھ سے کیسی دو آنے کی محبت کرتی تھی کہ فوراً ہی سرینڈر کر دیا، ذرا بھی اسٹینڈ نہیں لیا۔ میں مطمئن ہو گیا کہ بلا ٹلی۔

وہ خاموشی سے سرمد کے ساتھ رخصت ہو کر چلی گئی۔ جاتے وقت وہ امی کے گلے لگ کر رو رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف دیکھے گی بھی نہیں، اس لیے میں خود آگے بڑھا اسے امی سے الگ کر کے اپنے ساتھ لگایا پھر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا، گویا تسلی دی۔ پھر آہستہ سے سرگوشی کی۔

''سرمد بہت اچھا انسان ہے ام ہانی! تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی۔''

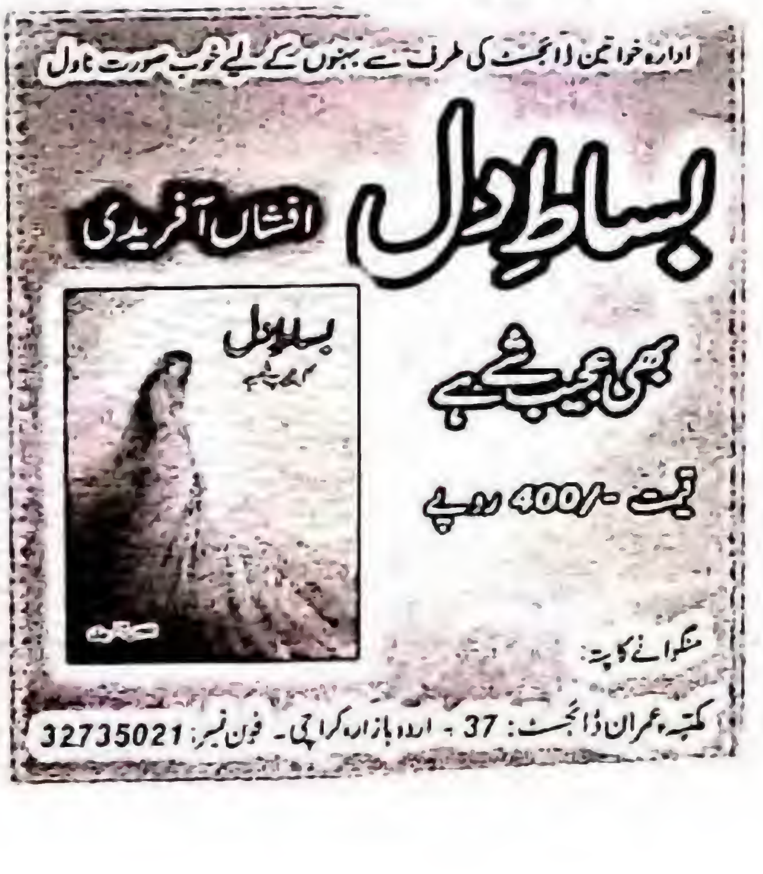

اس نے میری بات پر کتنے کان دھرے، میں نہیں جانتا البتہ وہ خاموشی سے چلی گئی۔ (وہ کان دھرنے والی لگتی تو نہیں تھی، خیر......!) اس کے جانے کے بعد امی بہت اداس ہو گئیں اور تھوڑا بہت اداس تو میں بھی ہو گیا تھا۔ بے شک وہ عجیب سی تھی اور مجھے زہر بھی بہت لگتی تھی اور بولنا تو اس نے بھی سیکھا ہی نہیں تھا۔

(کئی دفعہ تو مجھے شک گزرنے لگتا کہ وہ گونگی ہے) لیکن اس سب کے باوجود میں نے اس کے ساتھ اس گھر میں چھبیس سال گزارے تھے۔ اس لیے اس کے وجود کی عادت سی ہو گئی تھی اور عادتیں اتنی جلدی تھوڑی بدلتی ہیں، کچھ وقت تو لگتا ہے۔

☆☆☆

اس دن جب میں گھر آیا تو چوکھٹ پر قدم دھرتے ہی کسی کے فلک شگاف قہقہے نے میرے قدم روک دیے۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ امی اس طرح نہیں ہنستی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا تو میرے رشتہ داروں میں بھی کوئی اتنا اونچا اور بے ساختہ نہیں ہنستا تھا۔ ہنسی بے شک اونچی تھی لیکن نا خوش گوار ہرگز نہیں تھی، جیسے مندر کی گھنٹیاں بجتی ہیں نا بالکل ویسی یا شاید اس سے بھی زیادہ خوب صورت۔ میں خوش گوار حیرت میں گھر اندر آیا اور گویا پتھر ہو گیا، میری نظروں کے بالکل سامنے ام ہانی اپنے سرخ چہرے کے ساتھ ہنسی روکنے میں بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے اسے آج سے پہلے کبھی اس طرح ہنستے نہیں دیکھا تھا، بلکہ اس طرح تو کیا میں نے تو اسے مسکراتے بھی بہت کم دیکھا تھا اور جتنی دفعہ دیکھا تھا مجھے انگلیوں پر یاد ہے۔ تو کیا سرمد واقعی اتنا اچھا انسان تھا کہ اس نے ام ہانی کو ہنسنا سکھا دیا تھا؟

میں چند لمحے یونہی احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا اور پھر میری بھنویں تن گئیں۔

میرے تصور میں تو روتی بلکتی ام ہانی تھی جو مجھے دیکھتے ہی آہیں بھرنے لگتی لیکن یہاں تو سارا کا سارا معاملہ ہی الٹا پڑ گیا تھا اور تب ہی ام ہانی کی نظر مجھ پر پڑی، وہ ہنسنا بھول کر سنجیدہ ہو گئی۔ پھر اٹھ کر مجھ تک آئی اور پورے اعتماد سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا ہادی ''بھائی''! سرمد واقعی بہت اچھے انسان ہیں اور انہوں نے مجھے بہت خوش رکھا ہوا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اتنے پیارے انسان سے ملایا۔'' (بھائی؟) میرا میٹر گھوم گیا۔ وہ موٹا آلو اور چغد سرمد اسے پیارا انسان لگ رہا تھا اور میری دفعہ چھبیس سالوں تک آنکھوں پر پٹی بندھی رہی۔

''اور وہ تمہاری محبت کیا ہوئی جس کے دعوے کرتی تھیں؟'' میں نے بہت جلے بھنے انداز میں کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئی پھر بہت رسان سے بولی۔

''آپ غلط بیانی مت کریں ہادی بھائی! میں نے محبت کے دعوے کبھی بھی نہیں کیے تھے آپ کے ساتھ۔ ہاں! چھبیس سال آپ کے ساتھ گزارنے سے تھوڑی بہت انسیت ہو گئی تھی آپ سے۔ لیکن محبت تو مجھے صرف سرمد سے ہے۔'' آخر میں وہ شرمائی اور میرا بس نہیں چلا کہ اس ہنستی ہوئی چڑیل کی گردن ہی مروڑ ڈالتا۔ مجھ جیسے شاندار بندے پر ترجیح دی بھی تو اس موٹے آلو کو؟

مجھ سے انسیت اور اس گدھے سرمد سے محبت؟ مجھے نہیں چاہیے یہ انسیت، آئی بڑی وہاں سے...... ہونہہ! میری حالت اس وقت بالکل اس غبارے جیسی تھی جو بہت پھولا ہوا ہواؤں میں اڑتا پھر رہا ہو اور اچانک ہی کوئی اس میں سوئی مار کر ساری ہوا نکال دے۔ میں نے زور سے دانت پیسے، پیر پٹخے اور اندر آ گیا کہ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا، افسوس......!

مکمل ناول

میں اکثر سوچتا ہوں اگر پرنما نہ ہوتی تو میری زندگی کتنی مختلف، کتنی پرسکون ہوتی...... نہ صرف میری اپنے گھر میں زیادہ اہمیت ہوتی بلکہ یہ جو چار سالوں پہ محیط کشت میں نے کاٹا ہے وہ بھی نہ کاٹنا پڑتا بلکہ یہ جو آج میں ایئرپورٹ پہ لاوارثوں کی طرح ٹیکسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہ بھی اس کی بدولت ہے ورنہ یہاں سے وہاں دمکتے چہروں کے ساتھ میرا استقبال کرنے والوں کا ایک ہجوم ہوا کرتا تھا۔

میں تو دانستہ اپنے ماضی پہ مٹی ڈالے رہتا ہوں ابھی اگر ذرا سی گرد بھی جھاڑوں تو آج بھی کسی پارک کی بڑے بڑے دائروں کی شکل میں بنی سڑکوں پر بابا اس کا اسٹالر دھکیلتے چلے آئیں گے۔

اسے سائیکل چلانا سکھاتے، بیس بول کی پریکٹس کرواتے میرے بابا کو کبھی فکر بھی نہیں ہوئی کہ ان کا اپنا بیٹا کب کہاں سائیکل چلاتے کسی پتھر سے ٹکرا کر اپنی زخمی ہتھیلی لیے بیٹھا ہے۔ ان کے لیے سب کچھ پرنما ہی تھی حالانکہ اس سے چھوٹی عاشی بھی تھی لیکن ان کا سارا التفات پرنما سے شروع ہو کر پرنما ہی پر ختم ہو جایا کرتا تھا۔

"تایا ابو کی چچی۔" یہ میں نہیں اس کی اپنی بہنیں

ثمینہ فرحان

شہ رگ

اسے کہا کرتی تھیں جبکہ میرے خیال میں اس لڑکی میں چچوں والی بھی کوئی خصوصیت نہیں تھی نہ تو اس میں بھی کسی کی شکایت لگانے کی ہمت ہوئی نہ کسی سے جھگڑا کرنے کی۔

''ویسے اسے شوق کس چیز کا تھا؟''

اپنے بھاری سوٹ کیس کو ٹیکسی کی ڈگی میں فٹ کر کے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ کر دھیان سے سوچنے پر بھی مجھے اس کا ایک بھی شوق یاد نہ آیا دوسری لڑکیوں کی طرح نہ تو اسے باتیں کرنے کا جنون تھا نہ ہی شاپنگ کا جنون...... اسٹار گیٹ سے نکل کر گاڑی شارع فیصل پہ آ گئی۔

''کچھ بھی نہیں بدلا۔'' اپنے سامنے دھوپ سے چمکتی سڑک کے ایک طرف بنے چائے کے چھوٹے چھوٹے ہوٹل، دھلے کپڑوں سے لدی درمیانے درجے کے فلیٹوں کی بالکنیاں دیکھتے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''جو ملک کو بدل سکتے ہیں، وہ تو ملک چھوڑ جاتے ہیں۔''

ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور مجھے اپنی طرح زخم کھایا ہوا کوئی قسمت کا مارا لگا۔

''کتنے عرصے بعد آئے ہیں میاں؟'' انٹلیکچوئل قسم کے بڑے میاں نے شاید میری آنکھوں میں تیرتی تشنگی محسوس کر لی تھی۔

''چار سال بعد۔'' میں سیدھا ہو کے بیٹھ گیا میرے جواب پہ اس کی آنکھوں کے اطراف پہ کھنچی گہری موٹی جھریاں مزید نمایاں ہو گئیں مجھے اندازہ تھا، میرا جواب اسے مطمئن نہ کر سکے گا۔

میں اپنے موبائل سے یو کے کی سم نکال کے پاکستان کی ڈالنے لگا کاش زندگی کے کچھ سال بھی موبائل کی طرح نکال کے پھینکے جا سکتے۔ یا کم از کم ان کی ہسٹری ہی ڈیلیٹ کی جا سکتی۔ چار سال چار صدیاں اور نجانے کتنی زندگیاں اور سب کچھ اس بے وقوف لڑکی کی وجہ سے ہوا تھا۔

کوئی انسان بیک وقت ذہین اور بے وقوف کیسے ہو سکتا ہے؟

☆☆☆

سب لوگوں کو میرے بارے میں غلط فہمی تھی کہ میں بہت ذہین ہوں...... نہ میں ذہین تھی نہ جینئس میں صرف محنتی تھی، وہ بھی نہ ہوتی اگر اس دن بابا رپورٹ کارڈ پہ سائن کرنے سے انکار نہ کر دیتے۔

''جاؤ اپنے تایا ابو سے جا کے سائن کرواؤ۔'' مما کے اس قدر درشتی سے کہنے پر مجھے لگا کہ کہیں میں فیل تو نہیں ہو گئی؟

فیل جیسا مہلک لفظ تیسری جماعت کی بچی کے ذہن پہ بھی ویسی ہی کاری ضرب لگاتا ہے جو بڑے بڑے پروفیسروں پر......

''سائن تو کر دیے ہیں وقار نے۔''

تایا ابو کی بات پہ مجھے جھٹکا لگا تھا...... ہائے کہیں میں غلطی سے ردا کی رپورٹ کارڈ تو نہیں لے آئی...... پنجوں کے بل اچکتے رائیٹنگ ٹیبل پہ دھرے اپنے نامہ اعمال کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے جہاں تصدیق کے بعد تسلی ہونی چاہیے تھی وہیں پچیسویں پوزیشن پہ نگاہ پڑتے ہی اقبال جرم کی سی کیفیت لیے میرا منہ لٹک گیا۔

''کیا ہوا؟ تایا ابو نے میرے چہرے پہ نظر ڈال کر کہا پاس تو ہو گئی ہو۔''

''لیکن فرسٹ سیکنڈ تو نہیں آئی ناں۔''

''تو کیا ہوا۔'' تایا ابو رسانیت سے بولے۔ ''اصل چیز تو محنت ہوتی ہے جو تم نے کی اور جو نظر بھی آ رہی ہے۔ پینتالیس بچوں میں سے تم نے بیس بچوں سے بہتر پرفارم کیا ہے اس طرح محنت کرتی رہو گی تو اگلی مرتبہ اور اچھے نمبر آ جائیں گے۔''

بس اس دن محنت کرنے والی بات دل میں بیٹھ گئی بلکہ یہ سمجھ لیں کہ محنت کرنے کی تکنیک سمجھ میں آ گئی۔

محنت کرنا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے بس

اپنے آپ کو ایک شیڈیول کے مطابق مستقل مزاجی سے مکمل کرانا ہوتا ہے۔ پچیسویں پوزیشن سے اگلے ہی سال میں پانچویں پوزیشن پر پہنچ چکی تھی اور ایف ایس سی میں اے ون گریڈ لینے پر تو تایا ابو سمیت گھر کے تمام افراد میری تیسری کلاس کی پچیسویں پوزیشن یکسر بھلا چکے تھے۔

لیکن حقیقت کیا تھی اگر میں اپنے بارے میں سچ کہوں تو میں بہت ذہین نہیں تھی۔ مجھے دوسروں کی نسبت بات ذرا دیر سے سمجھ میں آتی تھی مثال کے طور بچے شرارت کو انجوائے بھی کرتے ہیں اور انہیں شرارت کرنے کا پتا بھی ہوتا ہے۔

اول تو مجھے لگتا تھا، مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ شرارت کیسے کی جاتی ہے اور جو کبھی کسی شرارت کا بھولے بسرے خیال آ بھی جاتا تو یہ جو دونوں گھروں میں میری معصومیت، شرافت اور لیاقت وغیرہ کے دن رات ڈنکے پیٹے جاتے تھے۔" وہ مجھے کوئی شرارت کرنے دیتے بھلا۔

اب سوچتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان دو خاندانوں نے مل کر میرے بچپن کا کتنا ستیاناس مار کے رکھ دیا تھا......

پری گندے بچوں میں نہیں کھیلتی۔

پری یہ تو پری وہ...... ارے یار میں بھی انسان تھی اس فرشتہ بنانے کی مہم میں نہ ہی میں کسی درخت پہ کبھی چڑھی...... چڑھتی کیا خاک، اس بچارے عالی کو ایک دفعہ درخت پر چڑھتے ہوئے گر کے اپنی کہنی زخمی کر لینے پہ تائی امی نے اتنا ڈانٹا کہ اس کا تو مجھے نہیں پتا البتہ میں کافی دیر تک تھر تھر کانپتی رہی تھی پھر میں نے خاک چڑھنا تھا درخت پر...... اس نام ونہاد اچھی بچی کے لیبل کو بچاتے کتنی آرزوؤں کا گلا گھونٹنا پڑا تھا مجھے...... نہ کبھی بارش میں نہائی نہ ہی کپڑے گندے ہوئے۔ مما فخر سے کہتیں۔

"پری کا یونیفارم کبھی گندا نہیں ہوتا نہ کوئی داغ نہ دھبہ...... اور یہ ردا کتنا گندا یونیفارم کر کے لاتی ہے۔"

میں کھیلتی تو یونیفارم گندہ ہوتا ناں۔ بریک میں کوئی بچہ مجھے اپنے ساتھ کھلاتا ہی نہیں تھا، اتنا برا جو کھیلتی تھی...... جس ٹیم میں شامل ہوتی۔ وہ ہار جاتی۔ پوری بریک لنچ باکس سنبھالے سیڑھیوں پہ بیٹھے دوسرے بچوں کو کھو کھو اور باسکٹ بال کھیلتا دیکھتی رہتی۔ میری دوستی بھی زندگی بھر اپنے ہی جیسے کتابی کیڑوں سے ہوتی رہی تھی۔

مجھے ابھی بھی یاد ہے جس وقت مما میری شاندار کامیابی کے اعزاز میں دیے جانے والے ڈنر کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ مجھے عازمہ کی فکر گھلائے دے رہی تھی۔

عازمہ، زارا آپی کی نند اور ستارہ پھوپھی کی لاڈلی اکلوتی بیٹی...... اس سے بڑا ارسل میرے ہی کالج میں پڑھتا تھا اگرچہ وہ عمر بھائی کی طرح لائق فائق تو نہیں تھا پر پھر بھی بغیر فیل ہوئے بی کام تک پہنچ ہی گیا تھا لیکن عازمہ۔ اس نے شاید تیسری مرتبہ

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

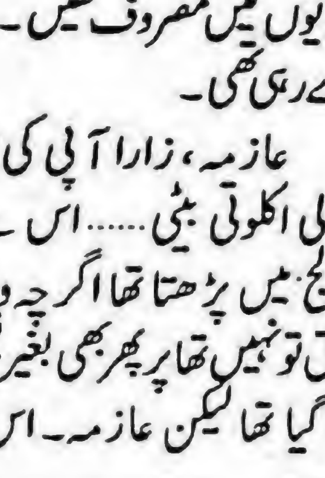

حنا
نادرہ خاتون

قیمت ---- 550/- روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔

اٹر کے پیپرز دیے تھے اور ان چار سالوں میں اس اللہ کی بندی نے مجال ہے جو کبھی بھولے سے ہی کوئی پاکستانی یا انڈین فلم چھوڑی ہو..... کوئی نیا گانا ہی ریلیز ہونے کے بعد اس کے ہیڈ فون سے محروم رہ گیا ہو۔ باقی رہ گئے انسٹاگرام فیس بک نیٹ چیٹنگ اور موبائل گیمز وغیرہ..... تو ان میں تو ویسے ہی ان کا اپنا ایک الگ مقام تھا۔

اتوار کو ڈنر تھا اور ہفتے کی شام عازمہ کو فل میک اپ جیولری سمیت ایک دم ٹپ ٹاپ دیکھ کر میں تو ہکا بکا ہی رہ گئی۔

سونے پہ سہاگہ یہ کہ وہ لاؤنج میں چوکڑی مارے ہر ایک کو یہ باور کرانے پہ تلی ہوئی تھی..... کہ بالکل بغیر پڑھے دیے تھے سارے پیپرز، ایک ورڈ بھی نہیں پڑھا تھا پھر بھی نجانے کیسے بی گریڈ آ گیا۔ تھوڑا سا اور پڑھ لیتی تو آرام سے ٹاپ کر لیتی۔

اس دن مجھے یقین ہو گیا کہ عالی شان بالکل صحیح کہتا ہے عازمہ کے بارے میں کہ، ایک تو بے وقوف اور اوپر سے اپنی بے وقوفیوں پہ نازاں، ان دنوں عالی بھی چھٹیوں پہ آیا ہوا تھا ویسے تو مجھ سے زیادہ ردا کی عازمہ سے دوستی تھی لیکن ردا صاحبہ کی کیوں کہ ڈیڑھ مہینے بعد شادی تھی تو اپنی شادی کے سلسلے کی شاپنگ وغیرہ کی گوناں گوں مصروفیات کے باعث انہیں جو بچا کھچا وقت میسر آتا۔ وہ حسن کی نگہداشت اور نکھار کے ٹوٹکوں پہ عمل پیرا ہوتے ہوئے صرف ہو جایا کرتا تھا۔

اور ایسے میں عازمہ کی اعلا درجے کی فضولیات مجھ ہی کو برداشت کرنا پڑتیں اور عازمہ صاحبہ تو عام حالات میں بھی پٹری پر چلنے کی قائل نہ تھیں مجھ جیسی صابر سامع کی موجودگی میں تو کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر ہو جایا کرتیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے لگتا کہ جامنی رنگ اسے بہت سوٹ کرتا ہے۔ یا فلانی لپ اسٹک کا شیڈ لگا کے تو وہ کیا سے کیا بن جاتی ہے اور اگر اس کی کوئی دوست اسے کسی سلیبرٹی کسی ایکٹریس سے ملا دیتی۔ پھر تو قیامت ہی آ جاتی..... میری تو یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے دماغ میں یہ نادر خیالات آتے کہاں سے ہیں۔

''اس دن تو حد ہی ہو گئی لان میں آئے ہمیں مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ اسے لگا کہ عالی شان اس کے چکر میں بار بار لان کا چکر لگا رہا ہے حالانکہ وہ بابا سے ردا کی مہندی کے فنکشن کی ارینجمنٹ وغیرہ ڈسکس کر رہا تھا۔''

''سنو، کل مووی کا پروگرام بنائیں..... عالی سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔''

مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ آناً فاناً مووی کا پروگرام اسی بندے کی وجہ سے بنایا جا رہا ہے جو بابا کے ساتھ میز کرسیوں کے معاملات میں الجھا ہوا ہے لیکن مزے کی بات یہ ہوئی کہ وہ گیا ہی نہیں۔ اجازت تو خیر مجھے بھی بڑی مشکل سے ملی تھی اور زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے ڈانٹ بھی پڑی یعنی کہ میں..... جسے کبھی کسی نے پھولوں کی چھڑی سے بھی نہ چھوا ہو اور تایا ابو جیسے لوگوں نے تو ویسے ہی مجھے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔

کتنی دیر تک تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ عالی شان نے ہی گیٹ کھولا تھا اسے دیکھ کر ارسل اور ان دونوں کا کزن ارحم جو ہمارے ساتھ ہی گیا تھا۔ گاڑی سے باہر نکل کے اس سے ملنے لگے۔ ان تینوں کو باتوں میں مصروف دیکھ کر میں عاشی اور فیضی کا ہاتھ پکڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

''ایک منٹ رکو تم لوگ۔''

روکا تو اس نے غالباً ہم سب کو تھا۔ لیکن عاشی اور فیضی مجھ سے کہیں چھوٹے ہونے کے باوجود نہ صرف اس کے لہجے سے جھلکتے غصہ کو بھانپ چکے تھے بلکہ میرا ہاتھ چھڑا کے اندر کی طرف دوڑ بھی لگا چکے تھے۔

''عازمہ تو خیر ہے ہی بے وقوف مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی..... بابا اور چچا جان نے اگر اجازت دے بھی دی تھی تو کیا تم خود بالکل ہی عقل سے پیدل

ہو جو یوں منہ اٹھائے آوارہ گردی کرنے چل دیں۔"
میں تو نہ جانے کب تک آنکھیں پھاڑے منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بڑے اہتمام سے اس کی بکواس سنتی رہتی کہ عازمہ نے کوئی دس منٹ بعد انٹری دے کے نہ صرف اس مفت کے گیان کا ڈراپ سین کیا۔ بلکہ اسے بھی خوب لتاڑا۔
"بس کرو بھئی۔ تم بھی نا بس بے بھاؤ کی سنانا شروع ہو جاتے ہو...... اب اگر وہ مروت کی ماری چپ ہے تو تم ہی بس کر دو۔"
وہ میرا بازو کھینچتے ہوئے آگے بڑھتی چلتے چلتے پھر مڑی۔
"اور ہاں ہم نے بہت انجوائے کیا۔ مووی کے بعد ہم سی ویو بھی گئے تھے...... اور دوبارہ بھی جائیں گے۔ تم کر لو جو کرنا ہے اونہہ......"
عازمہ تو اپنا غصہ اتار کے لاؤنج میں ہی ڈھیر ہو گئی جبکہ میں نے بھاگتے سیڑھیاں چڑھنے ہی میں عافیت جانی۔ ایک گھنٹے بعد نہا دھو کے نماز پڑھ کے جب میں نیچے آئی تو عازمہ اسی طرح کھلے پائنچوں والی جینز میں پاؤں پسارے کسی گرما گرم بحث میں الجھی ہوئی تھی۔
قصہ کچھ یوں تھا کہ ردا کی ساس اور نندوں کو شادی میں پہناؤنیوں کے طور پر جو مما نے کپڑے دینے تھے۔ وہ ردا صاحبہ کے اسٹینڈرڈ کے مطابق نہ آئے تھے۔
"تو کیا ہوا مما! آپ دوسرے کپڑے لے لیں۔" میں نے اپنی طرف سے مسئلے کا آسان ساحل پیش کیا۔
"ہاں۔ پیسے درختوں پر لگے ہیں ناں...... پینتالیس ہزار کے آئے ہیں یہ تین جوڑے......" مما نے صوفے پہ اپنے اور تائی امی کے بیچ رکھے کپڑوں کے ڈھیر پہ ہاتھ مارتے ہوئے جتایا۔
"تو میں کہہ تو رہی ہوں...... مما! یہ آپ کسی اور کو دے دیں ناں۔ عباد کی پھوپھی یا خالہ وغیرہ کو...... بہنوں اور امی کے لیے تو کسی اچھے برینڈ کے کپڑے ہی ہونے چاہئیں ناں۔"
"بس تم خرچا ہی کرانا۔" عالی شان نے ردا کو چھیڑا۔
جواباً اس نے بھی دانت پیستے ہوئے کچھ کہا جو مجھے سنائی نہ دیا۔ میرے سامنے ہی وہ دونوں صوفے کے برابر کارپٹ پہ گودوں میں کشنز لیے بیٹھے تھے۔
"مما! کیا عباد بھائی کی طرف سے ہمیں بھی شادی میں کپڑے ملیں گے؟"
میرے اشتیاق بھرے انداز پہ مما کا تو منہ بن گیا جب کہ تائی امی ہنس پڑیں۔
"ارے نہیں بھئی...... یہ لڑکی والوں کو ہی دینے ہوتے ہیں۔" زرق برق کپڑوں کو تہہ کرتے مما کا موڈ مزید آف ہو گیا۔
"کیوں...... وہ لوگ کیوں نہیں دیں گے ہمیں...... جب ہم انہیں دے رہے ہیں تو؟" میں نے صرف اپنی جنرل نالج کے لیے یہ سوال کیا تھا۔
"تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری دفعہ لڑکے والے بھی تم لوگوں کو کپڑے دیں گے۔"
"ہیں......؟" تائی امی کی بات پہ بغیر سوچے سمجھے جتنی بے ساختگی سے میرے منہ سے نکلا تھا اگلے ہی لمحے سب کے چہروں پہ امنڈتی شرارت آمیز مسکراہٹ مجھے شرمندگی میں جلا کر گئی۔
عجیب سی خجالت کا شکار ہوتے اپنے سامنے عالی شان کی پرشوق نظروں سے نگاہیں چراتے مجھے تھوڑی دیر پہلے والا اس کا غصہ بھی یاد آ گیا۔ اب پتا نہیں میرے ہی چہرے پہ کچھ ایسے تاثرات تھے یا ٹیلی پیتھی کی کوئی قسم کہ اسے بھی وہی یاد آیا۔
"چچی جان! آپ کو پتا ہے ان لوگوں نے فل آوارہ گردی کی ہے آج...... اور یہ لوگ سی ویو بھی گئے تھے؟" لیکن اس وقت وہ غصہ میں نہیں تھا۔
"ہاں ناں، اتنا مزا آیا...... لیکن دیکھو۔" عازمہ اٹھلاتے ہوئے اپنے بازو دیکھنے لگی۔ "ہم لوگ کتنے ٹین ہو گئے ہیں نا؟"

"یہ تو نہیں ہوئی۔" وہ میری طرف جملہ اچھال کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور آئندہ پرنما کو نہ لے کے جانا اپنے ساتھ۔" کہتے وہ ٹیبل پہ رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔

"کیوں......؟ پری تو ضرور جائے گی ہمارے ساتھ۔"

"خبردار۔" انگلی اٹھا کے تنبیہ کرتے اس نے گلاس منہ کو لگالیا۔

"ایک دفعہ نہیں ہزار ہزار بار جائے گی، ہے نا پری؟"

اب میں اس فضول سی بحث میں کس کا ساتھ دیتی۔

"مجھے نہیں پتا۔"

میں خود جھنجلا گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک جاندار سا قہقہہ گونجا۔ میں نے منہ اٹھا کے دیکھا تو وہ لاؤنج سے نکل رہا تھا۔

☆☆☆

ردا کی شادی پہ عازمہ کی تیاریاں اپنے عروج پہ تھیں۔ مہندی والے دن عازمہ اور عالی شان کا ایک ڈانس بھی تھا تو اندھا کیا چاہے دو آنکھیں والا حال تھا۔ مہندی پر میں نے کوثل اور علی کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ میرے بے چارے دوست بھی میری ہی طرح بور تھے۔ عازمہ اور دوسری کزنز کے ناچ گانے پہ بڑے بوڑھوں کی طرح کھڑے تالیاں بجاتے رہے۔ عازمہ کے خیال کے مطابق اس دن وہ شمع محفل قسم کی کوئی چیز لگ رہی تھی۔

دوسری مرتبہ مجھے اس سے ڈانٹ بی ایس سی میں ایڈمیشن لینے کے بعد ڈانٹ پڑی۔

"بی ایس سی ہی میں ایڈمیشن لینا تھا تو اتنی محنت کر کے اے ون گریڈ لانے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ غصہ سے بھڑک رہا تھا۔ "بڑا تیر مارلو گی نا تم بی ایس سی کر کے؟ اس کو شاید اسی دن خبر ملی تھی۔ میں نے شکر کیا کہ وہ پاکستان میں نہیں تھا۔"

"کیوں زارا آپی اور ردا نے بھی تو بی ایس سی کیا ہے۔" اپنے دفاع میں اب کچھ تو کہنا ہی تھا۔

"بے وقوف لڑکی! تم تو میڈیکل میں ایڈمیشن لے سکتی تھیں نا۔"

"میں نے تو لینا تھا میڈیکل میں ایڈمیشن لیکن سب نے کہا کہ اتنی مشکل فیلڈ ہے۔"

"یہ مشکل وشکل کیا ہوتا ہے بھئی، یہ سب چیلنجز انسانوں کے لیے ہی ہوتے ہیں۔" اسے غصے کے ساتھ ساتھ میری سوچ پہ بھی شاید افسوس ہوا تھا۔

"تو پہلے بتاتے نا تو میں انٹری ٹیسٹ ہی دے دیتی۔" ایسی شدید عزت افزائی کے بعد میں پچھتاوے کے سمندر میں غوطے کھانے لگی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ دھاڑا "تم نے انٹری ٹیسٹ ہی نہیں دیا؟ حد ہے تم سے بڑی بے وقوف میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ کچھ اپنے بارے میں سوچا بھی ہے تم نے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ کیا کرو گی بی ایس سی کر کے۔"

"ایم ایس سی یا جو بھی تایا ابو کہیں۔" میری مری مری سی آواز نکلی۔

"کیوں؟" اس نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "زارا آپی اور ردا کی طرح شادی نہیں کرو گی؟"

میرا دل چاہا۔ میں اس کا سر پھاڑ دوں۔

☆☆☆

میرا خیال ہے۔ دوسری مرتبہ وہ اپنے فائنل سمسٹر سے فارغ ہو کر ہی آیا تھا ان دنوں ردا بھی شادی کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان آئی ہوئی تھی اور اس کی بے تحاشا شاپنگ دیکھ دیکھ کر وہ اکثر اسے چھیڑتا کہ دو سال پہلے والے کپڑے کیا ہوئے...... کبھی کہتا۔ تم چچا چچی سے ملنے نہیں صرف شاپنگ کرنے پاکستان آئی ہو لیکن سب سے زیادہ کام بھی ردا کے وہی آ رہا تھا۔

ایک دن جب وہ لوگ کسی شاپنگ مال وغیرہ سے واپسی پہ سامان سے لدے پھندے واپس آئے تو عازمہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ ردا تو آتے کے ساتھ ہی اپنے چھوٹو کے پیمپر اور فیڈر کے جھنجٹ میں

مصروف ہو گئی اور عازمہ میرے ساتھ اوپر آ گئی۔

''عالی کتنا چینج ہو گیا ہے نا؟'' وہ بڑے اچھے موڈ میں میں بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔

''اچھا!'' میں چونکہ پورا دن نوٹس بناتی رہی تھی تو بیڈ پہ کتابیں اور نوٹ بکس آ پھیلی پڑی تھیں میں انہیں سمیٹنے میں لگ گئی۔

''ذرا اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا ناں پہلے۔ اصل میں وہاں انگلینڈ میں پھیکی شلجم جیسی لڑکیاں دیکھ دیکھ کر اب اسے قدر آئی ہے مشرقی حسن کی۔''

یاالٰہی میں تو سنانے میں آ گئی۔

اور کیا؟'' وہ نجانے کس زعم میں بہنے لگی۔'' وہ گوریاں ہماری طرح اتنی پرکشش تو نہیں ہوتیں۔

ایک ادا سے اپنے تراشیدہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے مجھے تو خیر وہ مضحکہ خیز ہی لگی۔ فاؤنڈیشن کی موٹی تہوں سے لپے عام سے دبے دبے نقوش۔ پسینے اور تھکن کے باعث اصل رنگت کی چغلیاں کھاتے جگہ جگہ پڑتے شگاف ...... عازمہ تو اس پر دل و جان سے فدا تھی لیکن میرا نہیں خیال کہ عالی شان اسے کچھ خاص پسند بھی کرتا تھا۔ میری نظر عازمہ کے چہرے سے ہوتی اس کے پیچھے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پہ پڑی بے داغ اجلی، دمکتی رنگت بیچ کی مانگ نکالے کمر تک آتے ریشمی چمکیلے بال...... آف وائٹ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آپ مجھے اپنا آپ کسی شہزادی سے کم نہ لگا...... پتا نہیں کیوں مجھے خیال آیا کہ جس طرح وہ عازمہ کو اگنور کرتا ہے۔ کیا مجھے بھی اگنور کر سکتا ہے۔

☆☆☆

اس سے اگلے دن کی بات ہے میں اور عازمہ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب عازمہ نے مجھے اشارہ کیا کہ ہیرو آ رہا ہے۔

''تمہارے تایا ابو جان فرما رہے ہیں کہ جاؤ دیکھو، کہیں ہماری پری ہوا میں تو نہیں اڑ گئی...... اسے پکڑ کر لاؤ۔''

بڑے اچھے موڈ میں کہتے ہوئے وہ کرسی گھسیٹ کر ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ عازمہ تو اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی۔

''یار اتنا بور ہو رہے ہیں۔ چلو کہیں باہر نکلتے ہیں۔ کافی پی کر آتے ہیں۔''

''کہاں جانا ہے؟'' میری طرف دیکھتے اس نے پوچھا۔

''آپ لوگ جائیں۔ میں ذرا تایا ابو کے پاس سے ہو آؤں۔''

''بیٹھ جاؤ لڑکی! ابھی تو بابا آفس سے بھی نہیں آئے۔''

اس نے مجھ سے کہا اور پھر وہ جب تک بیٹھا رہا مجھے لگا جیسے مجھ ہی سے باتیں کرتا رہا تھا۔ مغرب کی اذان پہ جب میں اٹھی تو وہ پھر بولا۔

''بیٹھو نا، تم کہاں جا رہی ہو۔''

''نہیں، وہ نماز کا ٹائم نہ نکل جائے۔'' میں دوپٹا دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔

''چلو، پھر ہم بھی نماز پڑھ لیتے ہیں۔'' کہتا ہوا وہ بھی اٹھ گیا۔

☆☆☆

عازمہ تقریباً ایک ہفتہ رہی تھی ہمارے گھر ...... جس دن عازمہ نے جانا تھا۔ اس دن تایا ابو کے کمرے کا دروازہ بند کرتے مجھے وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

''چلو جلدی سے نیچے آ جاؤ۔ عازمہ کو چھوڑنے جانا ہے۔'' وہ مجھ سے کہتا تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ میں فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ جلدی جلدی بالوں میں برش کیا اور سیڑھیاں پھلانگتے نیچے اتر رہی تھی کہ آخری سیڑھی پہ پڑتا پاؤں ہوا میں معلق ہی رہ گیا...... ردا کسی تھانے دار کی طرح راستہ روکے کھڑی تھی۔

''یہ اتنی تیار شیار ہو کر کہاں جا رہی ہو۔'' اس کی عقابی نگاہوں سے میری لائٹ پنک کلر کی لپ اسٹک بھی نہ چھپ سکی تھی۔

''عازمہ کو چھوڑنے میرے ساتھ جا رہی ہے۔

چلو پرنما جلدی......" وہ عجلت بھرے انداز میں کہہ کر باہر نکلنے لگا۔

"تو عازمہ کو چھوڑنے تم جاؤ......اس کا کیا کام۔ ویسے بھی مجھے پری سے کچھ کام ہے۔"

"صوفے پہ پڑے شاپنگ بیگز کو بڑے مصروف سے انداز میں الٹ پلٹ کرتے اس نے کہا۔

"اتنے دنوں سے تو تمہیں اس سے کوئی کام نہیں پڑا۔ آج اچانک کون سا کام یاد آ گیا؟ چلو پری۔ آدھے گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔"

"تم اوپر چلو۔ تمہیں مما بلا رہی ہیں۔"

ردا نے مجھے گھورا اور عالی شان نے ردا کو...... اس کو یوں غصے میں جھنجلاتے دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی جسے میں مشکل سے کنٹرول کر رہی تھی۔

"تمہیں بڑی ہنسی آ رہی ہے۔" اس کو نہ جانے کس بات پہ اتنا غصہ آیا اور میں ویسے ہی ہنستی ...... بھاگتی ہوئی اوپر آ گئی۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں بلکہ شاید پڑھ چکی تھیں میں عادتاً ان کی جائے نماز کے پاس بیٹھ کے آگے کو جھک گئی جس وقت مما مجھ پر پھونک رہی تھیں۔ دھڑ سے دروازہ کھول کے ردا اندر آئی۔

"مما! یہ جو بڑی معصوم بنی پھرتی ہے نا بڑی گھنی میسنی ہے یہ......آپ آرام سے بلکہ اطمینان سے تائی امی کو ہاں کر دیں۔"

اور میرے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ کوئی اس قسم کی بات چل رہی ہے، مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ وہ جتنا خودسر اور خود پسند ہے۔ اپنے لیے بھی ایسی ہی لڑکی پسند کرے گا یا شاید پسند بھی کر چکا ہوگا ویسے تو انکار کی کوئی وجہ بھی نہ تھی لیکن اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا یہ میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔

اول تو مجھے فضول میں ادائیں دکھانے والی لڑکیاں ویسے ہی توجہ کی ماری لگتی تھیں۔

جس طرح سے سلسلہ چل رہا تھا بات پکی ہونے کے بعد بھی اسی طرح چلتا رہا البتہ کبھی کبھی کوئی اڑتی پڑتی خبر مجھ تک پہنچ جاتی جیسے کہ عالی شان کہتا ہے منگنی لان کے بجائے کسی ہوٹل میں ہونی چاہیے یا منگنی کے بجائے ڈائریکٹ نکاح ہونا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ردا تو ویسے ہی آئی ہوئی تھی اور منگنی میں شرکت کے لیے زارا آپی بھی اس دن شام کی فلائٹ سے اسلام آباد سے پہنچ رہی تھیں۔

میں لان میں ہرگز قدم نہ رکھتی اگر مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ صاحب یہاں موجود ہیں...... گیٹ کی جانب نپے تلے قدموں سے بڑھتے شخص کو دیکھ کر میرا دل چاہا، میں بھاگ کر جاؤں اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اس کے گرد گول گول بچوں کی طرح گھوم کر اسے چونکا دوں۔ اپنی ہی سوچوں پہ ہنستے، نئے نویلے جذبوں کا لطیف سا بوجھ اٹھائے میں لان کے پچھلی طرف نکل گئی۔

پتلی سی گیلری کے سرے پہ رشیدہ بوا کپڑے دھونے کے بعد گیلے کپڑے سے واشنگ مشین کو چمکا رہی تھیں، میں ادھر ہی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ ابھی تک عازمہ سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اتنی جلدی یہ سب ہوا تھا کہ مجھے اپنے اور عالی شان کے بارے میں ہی سوچنے کا وقت نہ ملا تھا۔ میں عازمہ کے بارے میں کیا سوچتی شاید عازمہ جیسے لوگوں کی قسمت میں ایسے ہی حقیقت کا آئینہ دیکھنا لکھا ہوتا ہے

سیڑھیوں کے ساتھ بنی کیاری کی گھاس توڑتے میرے سوچوں پر عازمہ سوار ہو گئی ویسے تو اس کو خود اپنے بارے میں اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ اب اگر وہ عالی شان کی کھلم کھلا برہمی کو بھی محبوب کی ادا سمجھے تو اس میں میرا کیا قصور......اور ویسے بھی میں کہہ دوں گی، تائی امی نے رشتہ مانگا۔ مجھے تو خود بعد میں پتا چلا۔

"پرنما!" کیاری کی ساری گھاس اکھیڑتے پہلے میرے ہاتھ جھٹکے سے رکے پھر میں ہڑبڑا کے کھڑی ہوئی۔

"کوئی پریشانی ہے تمہیں؟" وہ بہت سنجیدگی

سے پوچھ رہا تھا جسے میں نے ابھی ایک منٹ پہلے خود اپنی آنکھوں سے اپنی نئی گاڑی میں گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا تھا، کہیں مجھے ہر جگہ عالی تو نہیں نظر آنے لگ گیا۔"

"کیا ہوا؟" اس نے پریشان ہوتے میری پھٹی آنکھوں والی ہونق شکل کو دیکھا۔

"کک، کچھ نہیں۔"

"چلو پھر زارا آپی کو ایئرپورٹ لینے جا رہا ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔"

اتنے سرسری سے انداز میں اپنے ساتھ لے جانے کی فراخ دلانہ پیش کش پہ میں اگر کسی ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوتی ڈھیروں شرم پہ قابو پا بھی لیتی تو ردا کے طعنوں سے پھر بھی ماری جاتی۔

"اصل میں مجھے، مجھے کافی کام ہے گھر پہ......"

دفعتاً اس کی نگاہوں کی زد میں میرے مٹی سے بھرے دونوں ہاتھ آ گئے جنہیں میں مارے خفت کے جھاڑ بھی نہ سکی اور پھر کچھ کہے سنے بغیر ہمیشہ کی طرح ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے اندر لاؤنج کی سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھام کر ہی میں نے دم لیا کچھ مزید منٹ دل کے دھڑ دھڑاتے شور کے کم ہونے میں لگے تب کہیں میں سیڑھیاں چڑھنے کے قابل ہوئی اور بے شمار پچھتاوں کی فہرست میں جو یاسیت کا دورہ پڑنے پہ کوڑے مارنے آ جاتے ہیں۔ اس دن کا انکار بھی شامل ہے۔

☆☆☆

جب امی جان نے پرنما کے بارے میں پوچھا تو نہ جانے کتنے دن تو میرا سر چکراتا رہا تھا...... اتنا مشکل فیصلہ تو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرے ذہن میں اپنے لیے ہمیشہ ایک سلجھی ہوئی، پراعتماد اور میچور لڑکی کا خاکہ ابھرتا تھا جو مشکل پڑنے پہ رونے دھونے کے بجائے دوستوں کی طرح مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ جس کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا نہ چلے کچھ ڈسکس کرو تو مزہ آ جائے...... صم بکم قسم کی لڑکیاں ہو سکتا ہے اور مردوں کو اپیل کرتی ہوں مجھے نہیں۔

مجھے پتا تھا۔ میں پرنما کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤں گا جس لڑکی کے پاس دو باتوں کے بعد کوئی تیسری بات نہ ہو کرنے کے لیے...... پتا نہیں اتنی کتابیں جو وہ پڑھتی تھی، دماغ کے بجائے شاید اس کی آنتوں میں چلی جاتی تھیں؟

لیکن سب سے منحوس بات یہ ہوئی کہ...... مجھ سے انکار ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور اس سے بھی گھٹیا یہ بات کہ میں چھچھوروں کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرنے لگا تھا۔ شاید صارم ٹھیک ہی کہتا تھا کہ خوب صورتی اور بے وقوفی ایک جان لیوا امتزاج ہے۔ معصومیت حسن کو دو آتشہ کر دیتی ہے...... اس پہ طرہ یہ کہ اس کی لاتعلقی اور بیگانگی میں رتی برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔

جس شان نیازی سے وہ بابا کے بیڈ پہ چڑھ کے کوئی کتاب پڑھتی یا لوڈو وغیرہ کھیلتی تھی، وہ سب اسی طرح جاری وساری تھا۔

ایک دن تو ردا نے اسے ٹوک بھی دیا۔ میں اور ردا بابا سے کچھ پوچھنے ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ بابا آئی پیڈ پہ خبریں کھولے بیڈ پہ بیٹھے تھے اور وہ سامنے کی دیوار پہ لگی بک شیلف میں سے شاید کوئی کتاب ڈھونڈ رہی تھی۔ جب ردا نے اس سے کہا۔

"اب تم کم کم یہاں آیا کرو کیوں کہ کچھ عرصے بعد تو تمہیں ہمیشہ کے لیے ہی یہاں آ جانا ہے۔"

اس بات پر بجائے شرمانے یا کچھ کہنے کے وہ کتابیں اٹھائے بالکنی میں نکل گئی۔

بابا کی طرح بابا کے کمرے کی بالکنی بھی اس کی پراپرٹی میں شامل تھی اور نجانے کیوں اس وقت مجھے اس کی وہ لاتعلقی اور ڈھونس مجھے بری نہ لگی۔

میں جانتا تھا کہ وہ بالکنی میں موجود اپنی مخصوص جگہ پہ کرسی پہ دونوں پاؤں رکھے کتابیں کھنگالے گی۔

کیا اب بھی وہ اتنی ہی ڈھونس سے ہمارے پورشن میں آتی ہوگی۔ ٹیکسی سفید گیٹ کے آگے رک چکی تھی اور گیٹ کے اوپر سے نظر آتی بابا کے کمرے کی

وہی بالکنی میری نظروں کے سامنے تھی۔
میرے پاس آنے پہ جو سرپرائز ملنا تھا وہ چار مہینے پہلے میرے آنے پہ سب کو مل چکا تھا۔ مما دیر تک گلے لگائے روتی رہیں۔ چچا جی تو پہلے بھی ناراض نہیں تھے۔ ہلکی سی اجنبیت جو مجھے ملتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔ وہ لمحوں میں ہوا ہو گئی۔ ناراض تو صرف عاشی تھی۔ جو مجھے ہزار مرتبہ سنا بھی چکی تھی کہ میں آپ سے کبھی بات نہیں کروں گی اور سب سے زیادہ باتیں بھی وہی کر رہی تھی۔
جب تک میں بابا کے پاس بیٹھا رہا۔ چائے، کافی، سینڈوچ، کچھ نہ کچھ بنا کر لاتی رہی۔ بابا سو چکے تھے۔ میں بھی آرام کرنے کی غرض سے اٹھ گیا کمرے سے نکلنے سے پہلے کھڑکیوں کے پردے برابر کرتے میری نظر گیٹ سے داخل ہوتی بلیک ہنڈا سٹی پہ پڑی۔ کچھ چیزیں قسمت میں شامل ہوتے ہوئے بھی ساتھ نہیں نبھاتیں۔
جس طرح بابا باپ ہوتے ہوئے بھی میرا ساتھ نہ دے سکے تھے۔ ان کی دی ہوئی گاڑی بھی میرے استعمال میں نہیں آ سکی تھی ویسے تو آج تک مجھے یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ بابا نے گاڑی مجھے کیمبرج سے کمپیوٹر انجینئرنگ کی ڈگری لینے پر دی تھی یا...... پرنما کے لیے رضامند ہونے پر......؟
کیونکہ میرے پاس ہونے سے زیادہ تو وہ اپنی بھتیجی کے لیے میرے رضامند ہونے پر خوش ہوئے تھے۔ اپنی گیلی آنکھوں کو صاف کرتے مجھے بار بار گلے لگاتے۔
''بابا! آپ ایسے ہی اتنا خوش ہو رہے ہیں۔ پہلے چچا جان سے تو پوچھ لیں کیا پتا وہ ہی انکار نہ کر دیں۔'' اس ایموشنل فیز سے نکالنے کی خاطر میں نے انہیں چھیڑا۔
''ارے اس احمق کو کیا پتا۔ میری بیٹی تمہارے ساتھ کتنا خوش رہے گی۔''
''صحیح کہہ رہے ہیں تمہارے ابا۔ وقار بھائی سے زیادہ تو وہ تمہارے بابا کی بیٹی ہے۔''
''اسی بات کا ہے تو ڈر ہے ڈیئر مام! شادی کر کے میں اپنے ہی گھر میں گھر داماد نہ بن جاؤں......''
کمرے کی دیواریں جیسے چیخ چیخ کر اگلنے لگی تھیں۔ گاڑی سے نکلتی پرنما پر نظر پڑتے ہی جیسے دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ اس بے وقوف لڑکی نے میری زندگی تو برباد کی ہی تھی۔ اپنی زندگی کو بھی تماشا بنایا ہوا تھا۔ میرے جانے کے بعد یہ اس کی تیسری جگہ بات چل رہی تھی اور ابھی تک شادی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔
چار سال پہلے میں اپنی اسی چمچماتی نئی گاڑی میں زارا آپی کو ایئر پورٹ لینے گیا تھا۔ ان کو لے کر گھر آ رہا تھا کہ آدھے راستے میں انہیں پہلے اپنے سسرال جانے کا خیال آیا۔ وہاں ستارہ پھپھو کے گھر جا کے پتا چلا۔ ارسل بھی دبئی سے رات ہی پہنچا ہے۔ زارا آپی تو ڈرائنگ روم ہی میں اپنے تحفے تحائف کھول کر بیٹھ گئیں۔ میں چائے کا کپ اٹھائے ارسل کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا۔
''خوش ہو......؟'' ارسل نے مجھ سے پوچھا۔
''ظاہر ہے۔'' میں ہنسا۔
''اور پرنما......؟''
''پہلے کسی کو اس کی سمجھ آئی ہے جو اب آئے گی؟'' بات مذاق میں اڑاتے میں نے راکنگ چیئر پہ جھولنا شروع کر دیا۔
''تم پرنما کو پسند کرتے ہو؟''
''ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔'' میں جھولتا رہا۔
''اور وہ...... کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے؟''
''کر لے گی۔'' ان دنوں میں بات بات پہ ہنستا تھا۔
''تم سے ایک بات کروں، تم انگلینڈ سے پڑھ کے آئے ہو روشن خیال ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں شاید کبھی یہ بات نہ کرتا۔ تمہیں معلوم ہے نا۔ پرنما نے میرے ہی کالج سے پڑھا ہے۔ اس کی اپنی کلاس

کے ایک لڑکے سے دوستی تھی بلکہ شاید ابھی بھی ہو۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" راکنگ چیئر رک گئی۔

"ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو...... لیکن ایک ایسی لڑکی جو کسی سے بھی زیادہ فری نہ ہو اتنی ریزروڈ سی ہو...... میں اس کا کزن تھا اور چار سالوں میں اس نے پورے چار جملے تک مجھ سے نہ بولے تھے۔ ایسی لڑکی کا کسی لڑکے سے فری ہونا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ دوستی بھی اتنی کہ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو جانے کے بعد بھی وہ پرنما سے ملنے ہمارے کالج آتا تھا۔"

"ایسی بات تھی تو وہ راضی کیوں ہوئی؟" میں غصہ ضبط کرتا کھڑا ہو گیا۔

راضی تو وہ بڑے ماموں کے کہنے پر بی ایس سی میں ایڈمیشن لینے پر بھی ہو گئی تھی۔

تم زارا بھابھی سے پوچھو پھر بعد میں کتنے مہینوں تک پچھتاتی رہی تھی لیکن یہ میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں عالی...... پوری زندگی کا مسئلہ ہے۔"

"تو تم کیا چاہتے ہو۔" میرا دماغ گھوم گیا تھا۔

"میں نے اسی لیے تم سے یہ بات شیئر کی ہے عالی! تم خود پرنما سے بات کرو۔ دوستوں کی طرح وہ بہت معصوم لڑکی ہے۔ اسے ایک موقع دو اپنا ہم سفر منتخب کرنے کا۔ کیا پتا وہ بڑے ماموں کے احترام میں کچھ بول ہی نہ سکی ہو...... تمہیں پتا ہے، بڑے ماموں کسی کی نہیں سنتے۔ ہر ایک پر اپنی مرضی ٹھونس دیتے ہیں۔ زارا بھابھی اور عمر بھائی کی دفعہ انہوں نے امی اور وقار چاچا سے رائے نہیں لی تھی۔ انہیں حکم دیا تھا۔ بڑی ممانی تو امی سے یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اگر عالی پرنما سے شادی سے انکار کر دیتا تو قیامت آ جاتی...... اصل میں بڑے ماموں، وقار ماموں کی ساری بیٹیوں کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور اوپر سے یہ بھی چاہتے ہیں کہ پورا خاندان جڑ کر رہے۔"

پانچ یا دس منٹ کی بات چیت میرا سارا سکون غارت کر چکی تھی۔ ابھی شاید پچھلے مہینے کی بات تھی جب بابا نے مجھ سے کہا کہ پرنما کو ڈاؤ میڈیکل کالج چھوڑ آؤ اس کو کوئی سیمینار اٹینڈ کرنا ہے۔

ایک دفعہ عاشی نے بھی بتایا تھا کہ آپی نے کالج کی چھٹیوں میں سول ہسپتال کے کسی فری کیمپ میں بطور والنٹیئر کام کیا ہے۔ میں اور میری سوچیں نجانے کتنے گھنٹے سڑکوں پہ ماری ماری پھرتی رہیں۔

اگلے دن بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو اس سے بات کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ بابا ٹیبل پہ کمپیوٹر کھولے اپنے آفس کا کوئی کوئی کام کر رہے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی کافی کا مگ ہاتھ میں پکڑے بابا کو بڑے جوش وخروش سے کچھ سناتے سناتے وہ ایک دم سے چپ ہوئی۔

"آپ کی لاڈلی سے کچھ بات کر سکتا ہوں۔"

میری اتنی سنجیدہ سی بات پر بابا کے چہرے پہ بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں بھئی۔ کوئی ڈیل کرو۔ تب ہماری بیٹی کے چند قیمتی لمحے مل سکیں گے۔ بتاؤ آج پی سی میں ڈنر کراتے ہو؟"

میں نے شاذونادر ہی بابا کو اتنی ترنگ میں دیکھا تھا۔ بابا کا وہ شرارتی سا موڈ میرے ضمیر پہ کسی پہاڑ جتنا وزن ڈالے آج بھی مجھے بے چین کر دیتا ہے۔

ان چند لمحوں کی گفتگو میں وہ جو بیڈ پہ چڑھ کے بیٹھی تھی اور شاید کسی فیصلے کی منتظر بھی تھی۔ اس نے بابا کو حیرت سے تکنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔

"جاؤ گڑیا، دیکھو کیا کہہ رہا ہے۔ پی سی سے کم پہ راضی نہ ہونا۔"

اور حکم ملتے ہی کسی چابی سے چلنے والی گڑیا کی مانند وہ کافی کا مگ ہاتھ میں تھامے بیڈ سے اتر کے میرے ساتھ چلنے لگی۔

"بیٹھو، مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

مجھے خود اپنی آواز عجیب سی لگی۔ میرے اور اس کے درمیان جو ہمیشہ سے ایک اجنبیت تھی۔ وہ مجھے پہلی مرتبہ کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔ اپنا کپ میز پہ

رکھ کے وہ ٹو سیٹر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"پرنما! تم مجھ سے شادی کے لیے خود اپنی خوشی سے راضی ہوئی ہو یا بابا کے کہنے پر تم نے ہاں کی ہے؟"

کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے بڑے نپے تلے انداز میں کسی تمہید کے بغیر میں نے اس سے سوال کیا۔

"آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میرے سوال پہ شاید وہ پریشان ہوئی تھی۔

"اس لیے پرنما کہ نہ تمہیں لڑکوں کی کمی ہے نہ مجھے لڑکیوں کی اور میرا خیال ہے کہ اگر تمہاری رضا مندی اس رشتے میں شامل نہیں ہے اور تم نے کسی پریشر میں آ کر ہاں کی ہے تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں میرے لیے اس رشتے کو ختم کر دینا نبھانے سے زیادہ آسان ہے۔"

"آپ نے اس رشتے کے لیے کیوں ہاں کی......؟ میں بھی تو کہہ سکتی ہوں کہ آپ تایا ابو کی خوشی کی خاطر رضامند ہوئے ہیں۔ تو پھر......؟"

لہجے میں مجھے ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی۔

"ہاں، تو اس میں غلط کچھ بھی نہیں ہے میں بابا کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے لیے بابا نے تمہیں پسند کیا۔ اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن مجھے یہ جاننے کا بھی حق ہے کہ کہیں میرے ہونے والی بیوی کسی اور کو تو پسند نہیں کرتی اور اگر ایسا ہے تو میں فوراً اس رشتے کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ میری بات کیوں کر رہے ہیں...... اگر آپ کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا تو آپ نے تایا ابو کی خاطر کیوں ہاں کی؟" وہ غصے میں کھڑی ہو گی۔

"میں تو برداشت کر لوں گی۔ کیا تایا، ابو، مما، بابا...... وہ لوگ برداشت کر پائیں گے۔ آپ کو یہ بات پہلے کرنی چاہیے تھی۔"

"کیوں اب کیوں نہیں یہ بات کر سکتا۔ ابھی صرف بات طے ہوئی ہے کوئی شادی تو نہیں ہوئی۔"

"کیا چاہتے ہیں آپ، آپ چاہتے ہیں کہ میں اس رشتے سے انکار کر دوں اور آپ کا راستہ آسان ہو جائے اور آپ اپنی پسند کی شادی کر لیں۔ آپ خود تایا ابو کو انکار نہیں سکے۔ کیونکہ انکار میں کروں یا آپ۔ دکھ تو تایا ابو کو ہی ہوگا ناں۔"

وہ روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایک سیدھی اور صحیح بات پہ ملکہ جذبات بن کے رونے لگ جائے گی بابا کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بالکل چھوئی موئی بنا کے رکھ دیا تھا اس میں نہ اپنے لیے فیصلہ کرنے کی ہمت تھی نہ دماغ۔

وہ صرف خوب صورت تھی اپنے نام کی طرح...... بغیر ذہانت کے خوب صورتی جیسے پھول بغیر خوشبو کے۔ اتنے لو آئی کیو کی لڑکی کے ساتھ میرا گزارا ویسے بھی نہیں ہو سکتا تھا اور ٹھیک دس منٹ بعد میں مما کو بیٹھا منا رہا تھا۔

"امی میں نے بہت سوچا ہے پرنما اور میں...... ہم دونوں بہت ڈفرنٹ ہیں...... بہت الگ ہیں ایک دوسرے سے، میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، آپ پلیز بابا سے بات کریں۔ بات سنبھال لیں۔" میرے منہ میں جو آیا میں بولتا چلا گیا۔

بابا نے ہمیشہ کی طرح نہ مجھ سے کچھ کہا نہ مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع دیا...... اس کے بعد کے دو دن پورے گھر نے سوگ کے عالم میں اور میں نے مجرموں کی طرح کاٹے تھے۔ انگلینڈ میں سیٹل ہونا میرے لیے مسئلہ نہ تھا۔ جاب کی آفرز تو مجھے لاسٹ سمسٹر میں ہی آنا شروع ہو گئی تھیں۔ مجھے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ بابا نے مجھے ایک مرتبہ بھی نہیں روکا...... ڈپارچر لاؤنج میں بیٹھا میں اپنی قسمت کو رو رہا تھا تو ارسل کی کال آئی۔

"یار! تم عجیب انسان ہو میں نے تمہیں پرنما سے بات کرنے کے لیے کہا تھا نہ کہ رشتے ہی سے انکار کرنے کے لیے۔"

اس کے یوں خواہ مخواہ برسنے پر میں شاید فون ہی کاٹ دیتا لیکن اس کی اگلی بات سن کر کہ بابا نے ستارہ پھوپھو سے اب پرنما کے لیے اس کی بات کی

ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔

"میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ بڑے ماموں وقار ماموں کی ان چاروں صاحبزادیوں کو اپنی ہی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ اوپر سے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ چاروں لڑکیاں خاندان ہی میں کہیں فٹ ہو جائیں میں تو پہلے ہی ردا سے بال بال بچا تھا کہ وہ آٹھ مہینے بڑی تھی۔ ان کا تو بس نہیں چلتا ورنہ وہ تو شاید آٹھ سال چھوٹی عاشی سے میری بات پکی کر دیں۔ اوپر سے تم نے انکار کر کے ان کے حساب سے پرنما کو تو پرفیکٹ میچ ہی بنا دیا...... یار ایک تو میں فی الحال شادی کرنا نہیں چاہتا اور میں، میں آل ریڈی کمیٹڈ ہوں یار! مجھے پھنسا کے خود تو تم مزے سے اس جنجال پورہ سے نکل گئے۔"

"دیکھو ارسل! میں نے جو صحیح سمجھا وہ کیا۔ تمہیں جو ٹھیک لگے۔ تم وہ کرو۔"

اس کی کہیں اور بات طے ہوئی اور ایک سال کے اندر اندر ختم بھی ہو گئی پھر دو ڈھائی سال تک مکمل خاموش رہی۔ سننے میں آیا کہ اس نے دوبارہ سے پڑھائی شروع کر دی ہے۔

تین سال بعد جب اس کی دوسری جگہ بھی بات نہ بن پائی اور امی نے مجھے دوبارہ سے پرنما کے لیے راضی کرنا چاہا تو میں صحیح معنوں میں غصے سے پاگل ہو گیا اور مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ جب تک پرنما زندہ ہے یا کسی ٹھکانے پہ لگ نہیں جاتی میرے لیے پاکستان جانا خطرے سے خالی نہیں۔

لیکن نہ تو قسمت کے آگے کسی کی چلی ہے اور نہ ہی خونی رشتوں میں ناراضیاں تاحیات رہتی ہیں۔

اس بات کے دو ہفتے بعد ہی بابا کے ہارٹ اٹیک کی خبر سن کے میں بھاگم بھاگ پاکستان پہنچا۔ ان کے بستر کی پٹی سے لگا بیٹھا خود کو ملامت کر رہا تھا۔ میں جو سمجھتا تھا کہ اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر صرف میں ہی خسارے میں رہا ہوں کیونکہ وہ اولاد جو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہوتی ہے وہ تو ان کے پاس تھی لیکن بابا کو دیکھ کر میرا دل کٹ کے رہ گیا۔

وہ برسوں کے بیمار اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔ ہاسپٹل سے گھر آ کر بھی شاید دوائیوں کے زیر اثر تھے یا کمزوری کا اتنا غلبہ تھا کہ بغیر سہارے کے بیٹھنا بھی ان کے لیے ناممکن تھا میرے اتنے ایکٹیو، اتنے ہینڈسم بابا وقت سے پہلے ڈھل چکے تھے۔

صرف چار سالوں میں ان کا وہ رعب، وہ دم خم سب ختم ہو گیا تھا۔ تب ہی میں نے مستقل طور پہ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تو مجھ میں بابا کی کوئی بات رد کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی بلکہ شاید ان کے کہنے سے پہلے ہی میں پرنما کے لیے خود ہی راضی بھی ہو جاتا اگر جو اس دن اس کی وہ فضول بکواس نہ سن لیتا۔

میں باتھ روم سے نکل رہا تھا جب مجھے لگا پرنما بابا کے پاس بیٹھی ہے۔ اسے شاید میرے وہاں ہونے کا علم نہیں تھا۔

"بابا! میری بات ہوئی ہے عالی شان سے...... وہ دوبارہ سے مجھ سے رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔"

یاالٰہی میں سناٹے میں آ گیا۔

"لیکن اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد مجھے نہیں لگتا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو وہ عزت وہ مقام دے سکیں گے، ہمیں بہت ٹائم لگے گا ایڈجسٹ کرنے میں، میں اگر اس رشتے کے لیے ہاں کروں گی تو صرف آپ کی خاطر۔"

کس قسم کی لڑکی تھی، جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہی تھی۔ میرا دل چاہا باتھ روم سے نکل کے اس کا گلا دبا دوں۔

"بابا! آپ عالی شان سے پلیز میرے بارے میں کوئی بات نہیں کیجیے گا۔ میں عالی شان کے ساتھ خوش نہیں رہ پاؤں گی۔"

کاش یہ سب کہنے سے پہلے وہ مجھ سے ڈائریکٹ بات کرنے کی ہمت پیدا کر لیتی۔ میرا دل چاہا کہ اس لڑکی کو سمجھاؤں کہ جھوٹ کے پتھروں پہ

قدم رکھ کے منزل تک نہیں پہنچا جاتا...... اپنے اوپر بھروسا کرو۔ یو سلی ڈمپ گرل۔

کوفت زدہ ہوتے ہوئے کھڑکی کے پردے برابر کر کے میں پلٹا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔

''السلام وعلیکم...... کیسے ہیں آپ؟'' اس نے مشینی انداز میں ہاتھ میں پکڑا دوائیوں والا لفافہ سائڈ ٹیبل کے دراز میں رکھا اور ٹیبل پہ موجود گل دان میں اپنے ساتھ لائے ہوئے ٹیوب روز لگانے لگی۔

☆☆☆

مجھے غم نہیں شاک لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے قدرت نے مجھے آزمایا ہو اور میں بری طرح فیل ہو گئی ہوں۔ جیسے وہ عازمہ کو اگنور کرتا ہے کیا وہ مجھے اگنور کر سکتا ہے؟ اگنور؟ اس نے ٹھوکر مار کے مجھے نیچے گرا دیا تھا دھڑام سے......

منگنی سے صرف دو دن پہلے وہ مجھے ریجیکٹ کر کے جا چکا تھا اسی شام عازمہ بھی آ گئی تھی۔

''تم خود ہی تو کہتی ہو کہ اللہ میاں جو کرتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔'' میرا ہاتھ پکڑے میرے برابر سیڑھیوں پہ بیٹھے۔ اسی کیاری کے پاس جس میں میرے ہاتھوں کا اکھیڑا ہوا زرد سوکھی گھاس کا ڈھیر ابھی تک پڑا ہوا تھا، میری سوچوں کا گواہ...... ''ہی لوز می اور نوٹ'' کی ٹینشن میں توڑی ہوئی پھولوں کی پتیاں سیڑھیوں پہ بکھری ہوئی تھیں۔

''چلو اٹھو یہاں سے اندھیرا ہو رہا ہے۔ ممانی جان بتا رہی تھیں تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا...... اور تم اتنا دل پر کیوں لے رہی ہو یار......؟

مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتے تیز تیز چلتے وہ جھٹکے سے رکی۔

''سچ کہوں تو وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا۔ تم اتنی سویٹ اتنی معصوم ہو اور وہ، بس ذرا شکل ہی ڈھنگ کی تھی جس پہ وہ اتنا اتراتا تھا۔ ورنہ تو تمہیں معلوم ہے وہ کس قدر بددماغ انسان ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں تمہاری اور اس کی جوڑی بالکل پری اور جن کی جوڑی لگتی......''

اور پہلی مرتبہ عازمہ کی مبالغہ آرائی مجھے بری نہ لگی۔

''دیکھنا اللہ میاں تمہارے لیے کتنا اچھا کریں گے۔''

مجھے تسلیاں دینا بھی اللہ نے اس کی قسمت میں رکھا تھا جسے کل تک میں حقیقت کا آئینہ دکھانے سے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

گھپ اندھیرے میں عازمہ کی پرسکون گہری نیند میں ایک تسلسل سے چلتی سانسوں کی موسیقی تھی اور انچوں کے فاصلے پہ میری بے چین تڑپتی سوچوں کا شور۔

''اسے اپنی شکل کا کچھ تو اندازہ ہونا چاہیے۔ عالی پاگل ہے جو اسے لفٹ کرائے۔''

لیکن میں نے تو یہ سب صرف دل میں سوچا تھا۔ میں نے تو عازمہ کو کبھی اس کی معمولی شکل کا طعنہ تک نہ دیا تھا۔ صرف دل میں سوچنے سے بھی؟ تو اللہ کو تو پتا چل گیا تھا نا۔ وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے میں ڈر گئی آدھی رات کو اٹھ کے بیٹھ گئی، جیسے اللہ میاں یہیں کہیں میرے آس پاس ہوں۔

میری ایک ایک حرکت کو نوٹ کرتے مجھے اللہ سے بہت شدید ڈر لگا...... کیا اللہ میاں نے مجھے سزا دی ہے۔ کیا صرف سوچ کی بھی سزا ہوتی ہے۔ ایسی غلط سوچ تو نہیں تھی میری ہاں...... لیکن میں نے کسی کو کمتر سمجھا تھا۔ اپنے سے کمتر، حالانکہ وہ تھی بھی پھر بھی اللہ کو برا لگا کیوں؟ کیونکہ اللہ اپنے بندوں سے بہت پیار کرتا ہے...... چاہے وہ قابل ہوں نہ ہوں۔ چاہے وہ خوب صورت ہوں نہ ہوں۔ چاہے وہ نیک ہوں نہ ہوں۔ تین دن بعد میں روئی تھی دھاڑیں مار مار کے عالی شان کے لیے نہیں اللہ کی ناراضی سے ڈر کے......

میرا دل یا تو عبادت میں لگتا یا فضول بے تکی سوچوں میں گم رہتی۔ میں نے بہت معافیاں مانگی تھیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اللہ میاں نے مجھے

معاف کر دیا ہے کہ نہیں ...... کیا اب اللہ میاں مجھ سے راضی ہو گئے ہیں؟ میں دن رات سوچتی رہتی۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو ہمیشہ کی طرح تایا ابو کے پاس دوڑی۔ ”ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ اللہ میاں ہم سے ناراض نہیں؟“

”تمہیں انسانوں کا کیسے معلوم ہوتا ہے۔ کیا میں، تمہاری امی، تمہارے بابا تمہیں روز بتاتے ہیں کہ وہ تم سے خوش ہیں کہ ناراض؟ اگر تم ہمارا کہنا مانو گی تو ظاہر ہے، ہم کیسے تم سے ناراض رہ سکتے ہیں ...... اچھا وہ لے کر آؤ۔“

انہوں نے بک شیلف میں رکھے قرآن مجید کی طرف اشارہ کیا۔

”اس میں اللہ میاں نے وہ سب کام بتا دیے ہیں جو وہ ہم سے چاہتے ہیں جو اپنے رب کا کہا مانے گا، اس سے وہ مہربان رب کیوں ناراض ہوگا۔“

میرے ہاتھوں میں موجود قرآن پاک پہ انہوں نے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

میں جو روز امی اور تائی امی کی طرح صبح فجر کے بعد دل کے سکون کے لیے سورہ یاسین اور عشاء کی نماز کے بعد سورہ ملک پڑھ کے سوتی تھی۔

قرآن پاک کو ترجمہ سے پڑھ کے اپنے ذمے کے کام سمجھنے لگی۔

وقت گزرتا گیا لیکن زندگی کے دھوبی پٹخے ابھی باقی تھے۔ عالی شان کے جانے کے تین ماہ بعد میری ایک جگہ رشتے کی بات چلی۔ مجھے لگا جیسے وقت سفر کرنے لگا ہے لیکن میں وہیں کہیں پیچھے رہ گئی ہوں۔ وہیں لان کے کسی کونے میں الجھنوں میں گھری گھاس توڑتی ...... لیکن پورا سال کاٹ کے نکاح سے دو ہفتے پہلے جب میری بات ختم ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ وقت بھی قسمت کے زور پہ ہی چلتا ہے۔

مجھے تو خیر خوشی اور غم کے جھنجھٹوں سے آزاد ہوئے ایک زمانہ ہو چکا تھا لیکن باقی اہل خانہ کے انداز و اطوار میں بھی کوئی خاص فرق نہ آیا۔

تائی امی کی عام طور پر بے تاثر نگاہوں میں پہلے کی طرح کبھی کبھی ہمدردی بھر جاتی تو کبھی شکوہ ابھر آتا۔

ادھر ادھر مما کے ساتھ دو چار باتیں کرتے یا سبزیاں کاٹتے کوئی فضول سا ڈراما بھی گزر جاتا، تایا ابو اور بابا کی وہی آفس سے گھر اور گھر میں ملکی اور غیر ملکی خبروں کی روٹین ...... فیضان اور عائشہ موبائل اور لیپ ٹاپ کی بدولت اپنے اپنے کمروں میں بند کسی اور ہی دنیا میں کھوئے ہوتے کبھی اتفاق سے ہی گھر کے سارے افراد کھانے پہ اکٹھے ہو پاتے۔ زارا آپی سال بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی کا ایک چکر لگایا کرتی تھیں۔ اس مرتبہ تو وہ بھی روا کے پاس دبئی چلی گئیں۔

عرصہ ہوا چائے کافی کی رونقیں ختم، محفلیں برخاست ...... ہیلتھ سائنسز میں ماسٹرز کرتے ہوئے بھی میرے معمولات زندگی وہی رہے تھے۔ اپنی پڑھائی اور تایا ابو کے کمرے کے دو چار چکر ...... یا بدروحوں کی طرح راہداریوں اور لان میں بھٹکتے رہنا۔ اس دن بھی میں کسی لاوارث چارجر کی تلاش میں سارے کمروں میں تاکتی جھانکتی پھر رہی تھی۔ کبھی کبھی فیضی، عالی شان کے کمرے میں رات گئے تک جاگ کے پڑھتا تھا۔ شاید ڈیڑھ سال بعد میں نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ شیشے کی الماریوں میں بے نیازی سے گردن اکڑائے کھڑی ٹرافیوں پہ گرد جم چکی تھی۔

اسی کمرے کی درازوں میں سے کبھی سال بھر پرانا کوئی سرٹیفکیٹ تایا ابو کے اچانک ہاتھ لگ جایا کرتا تھا۔ یہ کب ملا تھا؟ کب حصہ لیا تھا؟ وہ پوچھتے رہ جاتے۔ کبھی کسی تقریری مقابلے کے سرٹیفکیٹ کے نقل سے عنوان پہ نظر پڑتے ہی تایا ابو جھنجلا اٹھتے۔

”مجھے بتاتے، مجھ سے مدد لیتے۔“ اور پھر پہلی پوزیشن پر نظر پڑتے ہی ان کی بات کہیں منہ ہی میں گم ہو جاتی اور سینہ پھول جاتا۔ وہ ایسا ہی تھا بے نیاز۔

کبھی ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ کب کہاں کس کالج میں، کس مقابلے میں کیا جیت کے آیا، کیا ساتھ لایا۔

سرٹیفکیٹس، ٹرافیاں، کپ...... اعزازات ہاتھ باندھے اس کی راہ تکتے اور تمغے اس کے گلے کا ہار بننے کو بے تاب......

حد تو یہ ہے کہ کبھی کسی نے اسے کسی مقابلے کے لیے پریکٹس کرتے دیکھنا تو درکنار...... کبھی بھولے سے اس کے منہ سے اپنی کسی کامیابی کا تذکرہ تک نہ سنا تھا۔

دراز میں بکھری الم غلم چیزوں پر ہاتھ مارتے ایک نرم سا بنڈل میرے ہاتھ میں آ گیا۔ شاپنگ بیگ کے اندر بہت احتیاط سے ٹشو پیپرز میں لپیٹ کر رکھے دس پندرہ سگریٹ...... یا خدایا۔ میرا ہاتھ کپکپا گیا۔ عالی کو کبھی سگریٹ پیتے نہ دیکھا تھا اور وہ بھی ایسے چھپا کے اور فیضان...... فیضی تو نویں جماعت کا معصوم سا، چھوٹا سا بچہ تھا...... لیکن یہاں رات گئے تک وہی پڑھتا تھا۔

اف میرے اللہ...... میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنک جانا چاہیے تھا، جب تائی امی نے اس کے اسکول سے موصول ہوتی شکایتوں سے پریشان ہو کے کہا تھا کہ اب تو اسکول بدلنا ہی واحد حل رہ گیا ہے، پچھلے مہینے والے منتھلی ٹیسٹ میں بھی وہ فیل تھا۔

وہ تایا ابو جنہیں میری نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں انتہائی دلچسپی رہا کرتی تھی، اپنے بیٹے کی دفعہ وقت سے پہلے بوڑھے ہو چکے تھے یا شاید وہ اس قابل ہی نہیں رہے تھے۔ ابھی چند ماہ پہلے علی ہی کے ہاتھوں تایا ابو کے ڈپریشن کے مرض کی تشخیص ہوئی تھی، جب سے اس کا سائیکاٹرسٹ سے علاج چل رہا تھا۔ ویسے بھی تایا ابو میں اب وہ پہلے والی ہمت نہیں رہی تھی یا شاید وہ فیضان کو عالی شان سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ عالی شاہ جس کا اچانک کوئی سرٹیفکیٹ ہاتھ لگ کے خوشی سے ہم کنار کر دیا کرتا تھا۔ وہ ایسے ہی چونکایا کرتا تھا اور وہ اس کے چونکانے کے منتظر رہتے۔

چونکایا تو فیضی نے بھی تھا......

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کس کی مدد لوں۔ بابا کا ایک تو غصہ بہت تیز تھا۔ دوسرا ان کے پاس کسی مسئلے کو سمجھنے یا سمجھانے کا کبھی وقت ہی نہیں رہا تھا۔ امی اور تائی امی پریشان ہونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ کچھ دن پہلے میرے سامنے عاشی کو بھی آدھی آدھی رات تک جاگ کے چیٹنگ کرنے پہ مما سے ٹھیک ٹھاک ڈانٹ پڑی تھی۔ انہیں شک تھا کہ کہیں کسی لڑکے کا چکر نہ ہو۔

میں سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ گھنٹہ بھر جی بھر کے پریشان ہونے کے بعد میں نے وہی کیا جس کی عادت تھی۔ شیڈول مرتب کیا، گھنٹوں، دنوں، ہفتوں کے حساب سے اور ہاں اس سے پہلے رشیدہ بوا کی بہو کے ساتھ مل کر صفائی کروائی۔ چادریں بدلوائیں۔ درازوں کو پاک کیا۔ کمرے کی صفائی کے ساتھ ساتھ دماغ کی صفائی کا بھی وقت آ گیا تھا۔ اول تو جالے لگنے ہی نہیں دینے چاہیے تھے۔

پہلا ہفتہ توقع کے مطابق بہت دشوار گزرا۔ فیضی صبح فجر پہ اٹھائے جانے پہ بہت واویلا مچاتا۔ کبھی کبھی تو انتہائی زہریلا ہو جاتا۔ عاشی اتوار کے دن خواہ مخواہ ہی حلوہ پوری بنانے کی مہم پہ گھسیٹے جانے پہ بدک بدک جاتی۔ دونوں میں سے کوئی بھی بستر چھوڑنے کو تیار نہ ہوتا۔

دوسرا مرحلہ بڑے بوڑھوں کو پکڑ پکڑ کر لانے کا تھا کیونکہ کوئی صرف چائے ہی پہ گزارا کرتا تھا تو کوئی صرف خبروں پہ...... اور تائی امی لاڈلے بیٹے کے فون پہ...... کیا پکنا ہے...... کیا نہیں۔ ان کی بلا جانے۔ وہ پردیس میں بیٹھے بیٹے سے چکن بریانی کو دم لگوا کر ہی دم لیتیں۔

ایسے میں کبھی اس کا وہاں ہاتھ جل جاتا تو یہاں ان کا کلیجہ منہ کو آ جاتا۔ تین گھنٹے کی مشقت کے بعد اس کی بھیجی ہوئی تصویروں سے ادھر ان کا پیٹ بھی بھر جاتا۔

روزانہ پانچ بجے ٹن ٹن کر کے نازل ہوتا چائے کا وقت کمپیوٹر اور موبائل میں جتے لوگوں کو اپنا دشمن ہی لگتا۔ میں ناگواریاں سہتی، آلو کاٹنے لگ جاتی۔ رفتہ

رفتہ فرنچ فرائز کی خوشبو کی اور چائے کے ساتھ پکوڑوں کی عادت پڑتی گئی۔

عالی شان کے کمرے میں ایک اور میز لگائی گئی۔ اب عاشی اور فیضی کو لازمی تین گھنٹے ادھر ہی پڑھنا تھا۔ میں بیڈ پہ اپنی کتابیں لے کے بیٹھ جاتی۔ بیچ میں وقفہ بھی لیا جاتا۔ کبھی چائے سے، کبھی باتوں سے تو کبھی قصے کہانیوں سے...... کسی فرشتے نے آسمان سے نہیں اترنا تھا، نہ ہی کسی پری نے جادو کی کوئی چھڑی گھمانی تھی۔ جالوں کو صاف کرنے والا بانس مجھے ہی پکڑنا تھا اور اتنی مہلت ہی نہیں دینی تھی کہ کہیں زنگ لگے یا جالے چمٹیں۔ ہمیں خوش گواریت کے ساتھ زندہ رہنے کی آرزو نہیں، ضرورت تھی۔

کومل صحیح کہتی تھی...... بس پہلا قدم ہی مشکل ہوتا ہے، انسان آہستہ آہستہ چلتا کب دوڑ پڑے، پتا ہی نہیں چلتا۔ اس دن کتنے عرصے بعد میں کومل اور علی سے ملی تھی۔

سول ہسپتال کے کھچا کھچ بھرے کیفے ٹیریا میں دو گھنٹے جھک مارنے کے بعد دنیا کے سارے معزز مخصوص ہائی اسکوپ والے پروفیشنلز کو چھوڑ کے جب میں نے علی کے ہاسپٹل میں نرسنگ مینجر کی ویکینٹ پوزیشن کے حوالے سے سنجیدگی ظاہر کی تو علی اور کومل تو خیر اپنے ہی تھے۔ مما اور بابا تو کرتے کرتے ہی بچے تھے۔ تایا ابو کو تو ویسے ہی اب کوئی چیز چونکایا نہیں کرتی تھی۔ سوانہوں نے سہولت سے میرے حق میں فیصلہ دے دیا اور میں جو پورے راستے ایک لمبی چوڑی تقریر جوڑتے توڑتے ریہرسل کرتی ہوئی آئی تھی، وہ دھری کی دھری رہ گئی۔ میں نے سوچا تھا کہ...... کہوں گی، یہ کیا تایا ابو آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہر پیشہ قابل احترام ہے اگر پوری دیانت داری سے نبھایا جائے اور یہ کہ کام کرنا عبادت ہے اور ساتھ ہی میں نے آج صبح ہی علی کی دی ہوئی معلومات کی پیوندکاری کا بھی خوب سوچ رکھا تھا۔

”آپ کو پتا ہے ہسپتال کے وارڈ کا سارا نظام نرسیں ہی چلاتی ہیں۔“

لیکن کہتے ہیں نا کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، وہ ساری تقریر اگلے دن فون پہ زارا آپی اور ردا کے حصے میں آئی۔

اپنے آپ سے بولتے بولتے مجھے پتا ہی نہ چلا، میں کب دوسروں سے بولنے بلکہ سنانے لگ گئی۔ ایسے میں سب سے زیادہ شامت عائشہ اور فیضان کی آیا کرتی، وہی بے چارے تختہ مشق بنتے تھے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تھے مجھے قرآن پاک کو سمجھ کے پڑھتے ہوئے کہ میں نے ان کے ٹائم ٹیبل میں قرآن پاک کو ترجمہ سے پڑھنے کے لیے آدھے گھنٹے کا اضافہ کردیا۔ امی اور تائی امی جو صدیوں سے سو سو تسبیح اور گنی چنی سورتیں پڑھ کے اپنا فرض پورا کرتی چلی آرہی تھیں۔ اس آدھے گھنٹے کی کلاس کی ایکٹیو ممبر بن گئیں۔

مجھے نرسوں سے میٹنگ کرنا، مریضوں سے باتیں کرنا، سب اچھا لگتا تھا، گو کہ میرا اپنا الگ ایک آفس تھا لیکن اگر نہ بھی ہوتا تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا مقصد کام کرنا تھا جس کے لیے مجھے گدی نہیں، اپنی سروس دیکھنی تھی اور ایمان داری سے فراہم بھی کرنی تھی اور اب جب حالات تھوڑے قابو میں آنے لگے اور زندگی بوجھ کے علاوہ بھی کوئی معنی رکھنے لگی تو تایا ابو کو انجائنا کا اٹیک ہوگیا۔

اس وقت تک میرے تین جگہ رشتے جڑ کے ٹوٹ چکے تھے جس میں سے دو تو باقاعدہ طور پر کی گئیں منگنیاں تھیں اور ایک بے قاعدہ...... کیونکہ عالی صاحب تو منگنی سے پہلے ہی رفو چکر ہو گئے تھے۔ بچپن میں بابا کے منہ سے سنی ہوئی ایک کہاوت مجھے اکثر یاد آتی، دراصل بیٹیوں کی اس قدر فراوانی کے باعث بابا کے محاورے اور کہاوتیں بھی بیٹیوں کی بہتات یا ان کی شادی کے گرد ہی گھومتے تھے۔ بابا کہا کرتے تھے کہ بادشاہ کی بیٹی کی شادی فقیر کی بیٹی کی شادی سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

مجھے لگتا تھا میں اس بادشاہ کی بیٹی بن چکی

ہوں۔ پائلٹ اور نرسنگ منیجر کی جوڑی جتنی سننے میں مضحکہ خیز لگتی ہے، حقیقت میں بھی کچھ خاص نہیں جچتی لیکن اب تک قسمت نے جتنے بھی تیر چلائے تھے، وہ کون سا نشانے پہ لگے تھے؟ تو...... ''مینوں کی فرق پیندا اے'' کے تحت جس خانہ پری کے لیے اہل خانہ کو ''ہاں'' درکار تھی وہ میں کر چکی تھی۔ بصورت دیگر گھر کے چار بوڑھوں کی نیند کی گولی کو اضافی ڈوز کے ساتھ جاری رکھوانے کا نہ میرا حوصلہ تھا نہ میرے پروفیشن کا تقاضا۔ ویسے بھی میری طرف سے تو آج تک کسی رشتے میں نہ ہوئی ہی نہیں تھی۔

یہ تو پائلٹ صاحب نے ہی عقل مندی دکھائی۔ یا ہوسکتا ہے میری منگنیوں کے ٹوٹنے کی اتنی عظیم الشان ہسٹری نے ہی ان کو کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہو۔ بہرحال ان کو کچھ مہلت درکار تھی۔ یوں تو پائلٹ صاحب اکثر ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہوتے تھے لیکن میرے سامنے پر بھی نہیں مار سکتے تھے۔ مصطفیٰ اور مجھ میں بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بات بھی مشترک تھی کہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پچھتاتے تھے کہ کاش ہم چار پانچ سال پہلے ملے ہوتے۔

بیتے زمانوں کے رنگ دونوں ہی پہ چڑھے ہوئے تھے۔ کورے کاغذ جیسا من ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ بات کی تفصیل میں جانے سے پہلے گھر آچکا تھا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ آج خیر سے لوٹ کے بدھو گھر کو آرہے تھے لیکن گھر آتے کے ساتھ ہی ان سے ٹکراؤ ہوجائے گا۔ اس کا اندازہ نہ تھا اور اس بات کی تو بالکل بھی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی بے مروتی سے اپنی گاڑی کا مطالبہ بھی کردے گا۔ عین اس وقت جب میں اسے گاڑی کی چابی پکڑا رہی تھی، مجھے خیال آیا کہ میری ڈائری ڈیش بورڈ میں پڑی رہ گئی ہے، شٹ......

☆☆☆

سنو! پھر ساتھ چلتے ہیں
سنو! پھر لوٹ آتے ہیں
اندھیرے راستوں میں
تم میرا ہاتھ تھام کے رکھنا
میں اکثر ڈر جو جاتی ہوں
ان پتھروں پہ چلنے کی میری ہمت نہیں رہی
میں اب ڈگمگاتی ہوں
سنو! پھر ساتھ چلتے ہیں
سنو! پھر لوٹ آتے ہیں
انہی پتھروں پہ جن کے نیچے پانی بہتا تھا
انہی پتھروں پہ دو گھڑی ہم بیٹھ جاتے ہیں
پرنما...... وقار

اف ...... مجھ سے مزید پڑھا نہ گیا۔ اتنی بے زار، مایوس کن، منہ بسورتی شاعری اسی کی ہوسکتی تھی۔

''فیضی اٹھو، فجر کا ٹائم ہوگیا۔ جلدی اٹھو...... وضو کرو۔''

''یا خدایا! یہ آدھی رات کے وقت کیوں چیخ رہی ہے یہاں۔ ایک تو پہلے ان لوگوں نے میرے کمرے کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ دو دو بڑی بڑی ٹیبلز اور دو دو کتابوں کی الماریاں...... بیڈ روم نہ ہو کوئی لائبریری ہو جیسے۔ فیضی نجانے کب تک جاگ کے پڑھتا رہا پھر عاشی بھی آگئی۔ میں تنگ آ کے فیضی کے کمرے میں آ کے لیٹ گیا۔ اب یہ مصیبت یہاں آ گئی۔

''ارے ابھی تک نہیں اٹھے۔''

الٰہی میں کہاں پھنس گیا۔ دو منٹ بعد وہ دوبارہ میرے سر پہ کھڑی چیخ رہی تھی۔

''فجر کا ٹائم نکل رہا ہے فیضی! اٹھو، جلدی کرو۔ میں نے کافی رکھ دی ہے ٹیبل پہ...... پی لینا اچھا...... اور دوبارہ سونا نہیں۔ بیٹھ کے پڑھائی کرنا اچھا؟ اور سنو! وہ میری ڈائری نا...... عالی شان کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رہ گئی ہے۔ تم نکال کے اپنے پاس رکھ لینا ٹھیک ہے؟''

میں نے ایک ہاتھ سے سینے سے چپکی ڈائری دبوچی اور دوسرے سے کمبل جسے وہ کھینچ رہی تھی۔ اس دن کے بعد میں نے کبھی فیضی کے کمرے میں

سونے کی غلطی نہیں، وہ گھنٹہ گھنٹہ بیٹھ کر کمپیوٹر پہ کام کرتا رہتا اور میں الوؤں کی طرح کرسی پر ٹنگا رہتا۔ اپنی جگہ چھوڑنے کا ہمیشہ نقصان ہی ہوتا ہے، جیسے بچپن سے میری چھوڑی ہوئی جگہ پہ پرنما نے آج تک قبضہ جمایا ہوا تھا لیکن اب مجھے اپنی جگہ پہ دوبارہ آنا تھا۔ جس کے لیے مجھے اپنے اور بابا کے درمیان اس خلا کو پر کرنے کی ضرورت تھی۔ حالانکہ پاکستان آنے سے پہلے ہی میں نے ایک دوست کے ساتھ پارٹنرشپ پہ سافٹ ویئر ہاؤس کھولنے کا سوچ رکھا تھا لیکن ابھی فی الحال میں کسی بھی بزنس کی ٹینشن کو اپنے اوپر سوار کرنے کے بجائے اپنے گھر والوں کو ٹائم دینا چاہتا تھا، خاص طور پر بابا کو۔

خونی رشتوں کے بیچ جتنے بھی فاصلے آجائیں، پل میں سمٹ جاتے ہیں یا شاید میرا گھرانا ہی ایسا تھا، میں جب چچی جان کو امی کے ساتھ مل کے اپنی شادی کے سلسلے میں دیکھی گئی لڑکیوں کے بارے میں ڈسکس کرتے دیکھتا تو دل پہ عجیب سا بوجھ پڑ جاتا۔

عازمہ کی شادی چچی جان کی کویت میں مقیم کزن کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ عازمہ کی نند یہاں کراچی میں ایک پرائیوٹ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی یا شاید پڑھنے کے بعد ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ امی چاہتی تھیں کہ کسی دن اس کو بلالیں تاکہ میں دیکھ لوں۔ پاکستان آؤ تو لگتا ہے زندگی کا واحد مقصد صرف شادی ہی رہ گیا ہے۔ عاشی جس کا ابھی بی اے تک مکمل نہ ہوا تھا، اس کا بھی رشتہ طے ہو چکا تھا۔

دونوں گھروں کا مشترکہ کچن تو نیچے ہی تھا۔ اوپری منزل پہ ٹیرس کے پاس چھوٹا سا کچن میرے لیے نئی دریافت تھی۔ موسم اچھا تھا تو میں چائے بنا کر ٹیرس پہ آ گیا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش کے پھر آثار نظر آ رہے تھے۔ کہاں تو کراچی میں لوگ بارش کو ترس جاتے تھے اور اب یہ حال تھا کہ جب سے میں آیا تھا، اس پورے مہینے نجانے کتنی مرتبہ ساون کی جھڑی لگ چکی تھی۔

”فزکس کے ٹیسٹ کی تیاری ہو گئی؟ پاس پیپرز کر لیے تم نے؟“

کچن کے جالی والے دروازے سے براہ راست آتی اس کی تیز کاٹ دار آواز سن کے مجھے اندازہ ہو گیا کہ پڑھائی کے معاملے میں فیفی صحیح ڈرتا ہے پرنما سے۔

”تیاری تو کر رہا ہوں وہ..... عالی بھائی کہہ رہے تھے کہ اگر پورا چیپٹر اچھی طرح کر لوں تو پاس پیپرز کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ان سے کہنا، اپنے مفید مشورے اپنے پاس ہی رکھیں۔“ برتنوں کی کھٹر پٹر سے اندازہ ہوا، وہ بھی شاید چائے بنا رہی تھی۔ ”اور تم ان کی طرح اتنے جینئس نہیں ہو جو خالی چیپٹر پڑھ کے پاس ہو جاؤ گے، سمجھے؟“

”ہاں یہ بات تو ہے۔ عالی بھائی ہیں تو جینئس......اور کتنے ہینڈسم بھی، ہیں ناں؟“

ٹیرس میں چائے پیتے میرے بھی کان کھڑے ہو گئے بلکہ میں خود بھی کھڑا ہو گیا۔

”تم نے سر جمال سے اہم سوالات پر نشان لگوا لیے۔“ اف یہ رٹو طوطی میرے بھائی کا بھی بیڑہ غرق کرے گی۔

”سینٹر تو گیا ہی نہیں ناں۔ اصل میں آج بھائی نے پک کیا تھا اسکول سے۔ پھر ہم میک ڈونلڈز چلے گئے پری آپی! آپ کو کیا بتاؤں۔ بازل اور رومان تو عالی بھائی کو دیکھ کے حیران رہ گئے۔ آپ نے بھی عالی بھائی کو انگلش بولتے دیکھا ہے۔ بالکل انگریزوں کی طرح بولتے ہیں۔“

”کچھ اندازہ ہے تمہیں کتنی مہنگی فیس ہے تمہارے سینٹر کی۔ ایک ایک لیکچر کے حساب سے پیسے لیتے ہیں وہ لوگ۔“ اس کا غصے میں یوں بھڑکنا اور جتانا مجھے بہت برا لگا۔ دل تو چاہا جا کے دماغ درست کر دوں۔

”ویسے سچ بتاؤں تو سینٹر جانے کا کوئی فائدہ ہے بھی نہیں۔ سر جمال سے تو اچھا آپ سمجھا دیتی

ہیں۔ میں تو سوچ رہا ہوں، آپ ہی سے پڑھ لیا کروں۔"

"کیوں؟ وہ تمہارے انگریز بھائی جان کیا صرف بستر توڑنے کے لیے تشریف لائے ہیں، ان سے پڑھو نا۔"

بہت ہی بددماغ اور بدتمیز ہو چکی تھی پرنما۔ میں جا کے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا لیکن یہ اس کی اتنی لمبی زبان میرے پیٹھ پیچھے ہی چلا کرتی تھی۔ میرے سامنے تو وہ ابھی بھی بھیگی بلی بن کے ادھر ادھر ہو جایا کرتی تھی۔

☆☆☆

اس دن جمعہ کا دن تھا شاید...... میں ذرا جلدی اٹھ گیا تو سوچا سب گھر والوں کے ساتھ ناشتا کرلوں، میز پر صرف تین خواتین موجود تھیں۔ چچا جان اور فیضی ناشتا کر کے نکل چکے تھے غالباً، میں اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں سیڑھیوں سے دھم دھم کر کے بھاگتی دوڑتی عاشی آ پہنچی۔

"آپی! شکر ہے، آپ ہاسپٹل نہیں گئیں۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

پھولی سانسوں کے درمیان تیز تیز بولتے ہوئے وہ میرے برابر بیٹھ کر اپنی پلیٹ بھرنے لگی۔

"ارے بیٹا آج نمرہ سے بھی ضرور بات کر لینا۔" امی کو بھی اچانک یاد آیا۔

"اوہ تائی امی! میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ میری کل بات ہو گئی تھی نمرہ سے۔" قابل رشک اسپیڈ سے منہ میں نوالے ٹھونستی ہوئی وہ بولی۔

"وہ اس جمعرات کو میرے ساتھ ہی آ جائے گی۔ اصل میں اگلے پورے ہفتے اس کی چھٹی ہے نا۔ تو اچھا ہے وہ یہاں ہمارے ساتھ ہی پورا ہفتہ گزار لے گی۔"

"یہ تو تم نے بیٹا بہت ہی اچھا کام کیا۔" جس وقت امی اس کی اتنی ممنون ہو رہی تھیں، مجھے اچانک سے جھٹکا لگا۔ یہ تو وہ بھی، عازمہ کی نند۔

"ہاں بھئی جو بھی کام وقت پہ ہو جائے وہی اچھا۔" چچی جان کے پرخلوص مشورے پہ میرا دل چاہا اپنا سر پیٹ لوں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے نقصانات کھل کے سامنے آ رہے تھے، یعنی کہ جس کے مرضی سامنے تبصرہ کرلو جس سے مرضی چاہے، جس بھی قسم کی خدمات حاصل کرلو۔ پرائیویسی، ذاتیات، شرم، لحاظ جیسی چیزوں کا نہ کوئی وجود تھا نہ تصور اور نہ ہی کوئی عمل دخل یا مجھ ہی کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا جا چکا تھا۔

"میری بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔" میرے سامنے رکھے آٹھ دس پراٹھوں میں سے عاشی کو اپنے لیے سب سے نیچے والا گرم پراٹھا چاہیے تھا۔

"آپی! آج ارسلان آئے گا، آپ کے آفس کچھ ڈسکس کرنے۔"

عاشی اور فیضی کے لیے تو موبائل کھانے کی میز پر لانے تک یہ پابندی تھی اور خود محترمہ کی پلیٹ سے زیادہ موبائل پہ نظر تھی۔

"میری فون پہ بات ہو گئی ہے ارسلان سے۔" وہ موبائل پہ کچھ ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ لوگ مہندی کا فنکشن اپنے ماموں کے گھر کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس کے ماموں کا گھر کے لان کافی بڑا ہے شاید اس لیے۔"

"تو آپ کیوں مانیں، آپ نے کہنا تھا نا کہ کوئی ہال بک کرائیں۔ لوگ مہندی کے لیے بھی تو ہال بک کراتے ہیں۔"

"تو جب ان کے پاس سہولت موجود ہے تو ہال پہ پیسہ ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔" اس نے تعجب سے عاشی کو دیکھا۔

"اور جو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ پتا نہیں لڑکے کا گھر کتنا چھوٹا ہے جو ماموں کے گھر مہندی رکھی ہے وہ؟"

"لڑکے کا صرف گھر ہی نہیں چھوٹا بلکہ......" وہ موبائل بند کر کے بیگ میں ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ "اس کی ہونے والی بیوی کا دماغ بھی بہت چھوٹا ہے۔"

"آپی......!" عاشی نے پاؤں زمین پہ مارے۔ "ابھی ایک سال پڑا ہے شادی میں، ابھی سے کیوں ٹینشن لے رہی ہو۔ اوکے اللہ حافظ۔"

وہ چھوٹی بہن کو ٹینشن دے کر خود ہنستی مسکراتی بیگ کاندھے سے لٹکائے باہر نکل گئی۔ عاشی کا یوں اترا ہوا منہ دیکھ کر مجھے اس پر بہت ہی ترس آیا لیکن یہاں تو سب ہی پرنما کے حامی تھے اور مجھ اکیلے کے سرپردہ بے چاری اپنی بات کیا منواتی۔

ایک تو مجھے چچا، چچی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنھوں نے سارے اختیارات اس کو سونپ دیے تھے جو آج تک اپنے لیے کوئی ڈھنگ کا فیصلہ کرنہ سکی۔

"دیکھیں ذرا آپی کو، ان لوگوں کے خرچے کی کتنی فکر ہے اور جو مما آپ ان کے پورے خاندان کو جوڑے دے رہی ہیں، کیا ہم خرچا نہیں کررہے، ہونہہ......" عاشی کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔

"جوڑے کیا...... ان لوگوں میں تو ساس کو سونے کے کڑے بھی ڈالے جاتے ہیں۔" چچی جان نے ایک اور خرچا گنوادیا۔

"کپڑوں کی تو فکر نہیں کرنا شائستہ! میرے پاس آٹھ دس جوڑے رکھے ہیں، تم دیکھ لینا اگر پہنانیوں کے طور پر ارسلان کے گھر والوں کو دینا چاہو تو، آخر کو جہاں کا جو دستور ہے وہ تو کرنا ہی پڑے گا ناں۔ دیکھا نہیں تھا ستارہ نے عازمہ کی ساس کو سونے کا پورا سیٹ ڈالا تھا۔"

"ہاں مما......!" عاشی کو پھر سے جوش آیا۔ "نمرہ کو بھی ستارہ پھپھو نے پینڈینٹ سیٹ دیا تھا عازمہ کی شادی پہ۔"

عورتوں کی خالص گھریلو سی گفتگو شروع ہو چکی تھی، میں اپنی چائے لے کے صوفے پہ آ گیا۔

"ستارہ کی تو ایک اکلوتی بیٹی تھی اور نند بھی ایک ہی اکلوتی نمرہ......اب چار چار بیٹیوں کی ساسوں کو تو میں سونے کے سیٹ نہیں ڈال سکتی اور ادھر تو ارسلان کی بہنیں بھی تین ہیں۔ میں تو بس جوڑے ہی دوں گی۔"

"تو آپ سے کس نے کہا ہے کہ آپ سونے کے سیٹ دیں؟ ہمارے گھر میں تو خوشی کے موقع پر بھی مصیبت ہی پڑ جاتی ہے۔"

برتن پٹخنے کی آواز کے ساتھ عاشی کی غصے میں جھلاتی ہوئی آواز پہ میرا دل برا ہو گیا۔ کتنی خوش خوش چہکتی ہوئی آئی تھی ناشتا کرنے۔ چچی جان کو یوں اپنی فکروں کا تذکرہ کر کے اس کا دل نہیں توڑنا چاہیے تھا۔ اس وقت تو میں کچھ نہیں بولا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ میں امی سے اکیلے میں بات کروں گا کہ وہ میری طرف چچی سے بات کریں کہ عاشی کی ساس یا نندوں کو جو بھی دینا دلانا ہے، اس میں خرچے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ عزت کا مسئلہ ہے تو اس میں کسی بھی قسم کی کوئی کسر نہیں ہونی چاہیے۔

"امی! آپ نے پرنما سے کیوں کہا کہ وہ نمرہ کو گھر لے کر آئے۔"

صبح سے کیڑے کی طرح کاٹتے اس خیال کا میں نے کچن کا دروازہ پکڑے بے حد برا مانتے ہوئے اظہار کیا۔

"لو تو اور کس سے کہتی؟ تم سے تو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ جاؤ اس کے ہاسپٹل یا ہاسٹل جا کے اس سے مل لو۔ پرنما کے ہاسپٹل میں ہی ہاؤس جاب کر رہی ہے، پہلے اکثر پرنما ہی کے ساتھ آتی جاتی رہی ہے۔ اب آجائے گی تو کون سی نئی بات ہو گی؟" کہہ کے امی دوبارہ سے اپنی ہانڈیوں کا معائنہ کرنے لگ گئیں۔

"پرنما کو پتا ہے کہ آپ اس سے میری شادی کا سوچ رہی ہیں۔"

دروازے کے ہینڈل کو گھما گھما کے بغور معائنہ کرتے میں نے اصل بات پوچھی۔

"تمہیں مری سے کیا لینا دینا؟ جہاں بھی تمہاری شادی ہو گی کیا اسے پتا نہیں چلے گا۔ ویسے بھی وہ بہت کھلے ذہن کی لڑکی ہے۔ اب کیا تم اس کے ڈر سے شادی ہی نہیں کرو گے؟"

"لاحول ولاقوۃ میں کیوں اس سے ڈرنے

☆☆☆

اب پتا نہیں کہ امی کے اس دن کے لیکچر کا اثر تھا یا نمرہ کی اپنی شخصیت ہی آج کل کی عام لڑکیوں سے ذرا مختلف تھی کہ مجھے اس سے بات چیت کرنا مسئلہ نہیں لگا۔ ویسے بھی عاشی کی موجودگی میں ہمارے گھر کے اہم ترین موضوعات ارسلان، ارسلان کے ابا، ارسلان کے ماموں اور شادی مایوں مہندی کے گرد ہی گھومتے تھے۔

نمرہ فطرتاً بہت ایکٹو اور پریکٹیکل لڑکی تھی۔ ادھر عاشی صرف نام لیتی تو وہ لسٹ تیار کرنے لگ جاتی۔ مجھ سے کسی سیاسی شخصیت پہ تبصرہ کرتے وہ عاشی کی پسند کے عین مطابق ڈیزائن بھی منٹوں میں کیٹلاگ سے برآمد کردیتی اور عاشی کو ہفتوں سر کھپانے کے بعد اس کا چٹکیوں میں ڈھونڈا ہوا ڈیزائن ہی گوہر مقصود لگتا۔ بقول عاشی کے نمرہ میں دماغ کی جگہ کمپیوٹر فٹ تھا۔ ادھر سوال ڈالو، ادھر جواب حاضر۔ چچی جان کو مایوں والے دن میلاد ضرور کروانا تھا۔ امی کو میلاد سے زیادہ درس میں دلچسپی تھی جبکہ عاشی کی خواہش تھی کہ اس کا نکاح شہر کی سب سے بڑی مسجد میں ہو۔

نمرہ نے منٹوں سیکنڈوں میں ایک ہی دن میں ایک ٹائمنگ سیٹ کر کے دیے کہ سب خوش ہوگئے۔ سب سے پہلے نکاح پھر گھر آ کے ریفریشمنٹ اس کے بعد میلاد اور پھر ایک گھنٹے کا درس، اس کے بعد مایوں کی رسمیں اور پھر ڈنر اور اگلے دن مہندی......

اور اب وہ آج کا پورا دن بازاروں میں پھرنے کے بعد بھی ہشاش بشاش سی عاشی کے ساتھ سر جوڑے مہندی کے فنکشن میں ڈانس وغیرہ کے لیے کوئی پرانے زمانے کی تھیم کے مطابق پرانے گانے منتخب کر رہی تھیں۔

آج صبح آفس جاتے ہوئے میں اپنا کریڈٹ کارڈ امی کو دے گیا تھا کہ جو بھی زیورات وغیرہ کی شاپنگ کرنی ہے۔ وہ آرام سے کرلیں۔

☆☆☆

''سیکسٹیز کے پرانے فیشن کے کپڑے کہاں سے آئیں گے۔''

یوٹیوب کھولے انیس سو ساٹھ کی فلموں کے مشہور گانوں کو سلیکٹ کرتے نمرہ کو اچانک خیال آیا۔

''سب ہوجائے گا عاشی! ڈونٹ وری۔ تمہیں معلوم ہے، کرائے پہ بھی کپڑے ملتے ہیں، ان پرانے فیشن کے کپڑوں پہ پیسہ ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس لڑکی کے دماغ میں واقعی میں کمپیوٹر کی کوئی سرچنگ سائٹ فٹ تھی۔ ان کے سامنے والے صوفے پہ شاپنگ لسٹ کے آئٹمز پہ نظریں دوڑاتے میں نے سوچا۔

امی اور چچی بھی ادھر ہی لاؤنج ہی میں تھیں اور عرصے بعد خاندان کی کسی شادی میں میری دلچسپی دیکھ کے دونوں ہی بہت خوش تھیں۔ خوشی کی ایک وجہ آج کے خریدے گئے زیورات بھی تھے، جن کے سرخ مخملی ڈبوں کو کھولتے بند کرتے، ساتھ ساتھ تبصرے بھی جاری تھے۔

''اور پری آپی سے بھی تو پوچھنا ہے، وہی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کردیں۔'' عاشی کو ایک اور خیال نے ستایا۔

''ارے بیٹا! تمہاری منگنی کے سارے انتظامات اس نے کیے تھے۔ وہ کیوں کوئی مسئلہ کھڑا کرے گی بھلا، میں تو کہہ رہی ہوں۔'' امی نے کسی زیور کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ جو عاشی کی ساس کے لیے جڑاؤ کنگن لیے ہیں، پری کو بھی دکھادو اگر اسے پسند آجائیں تو اسی ڈیزائن کے پری کے لیے بھی بنوا لیتے ہیں۔''

''تمہیں ٹینشن لینے کی یا کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم جیسے چاہو گی ویسے ہی ہوگا۔'' عاشی کے ہراساں سے چہرے کو دیکھتے میں نے اسے تسلی دی۔

عاشی مجھے بہنوں کی طرح عزیز تھی اور اگر اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ چاہتی تھی کہ اس کی شادی بھی دھوم دھام سے ہو تو اس میں برائی کیا تھی۔ اپنے سے چھوٹوں پہ خواہ مخواہ کی دہشت پھیلا کے پرنما پتا نہیں اپنی کون سی محرومیوں کا بدلہ لے رہی تھی یا یہ سب سے اس ڈھیل کا نتیجہ تھا جو میری غیر موجودگی میں اس نے کچھ زیادہ ہی کھینچ لی تھی۔

خیر اب میں واپس آ چکا تھا اور چوہوں کو اپنے بل میں واپسی کا رستہ دیکھنا تھا۔ اسی وقت میرا فون آیا تو میں شاپنگ لسٹ جیب میں ڈالتا ڈرائنگ روم میں آ کے فون سننے لگا۔ فون سننے کے بعد واپس لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے مجھے لگا پرنما ہاسپٹل سے آ چکی ہے۔

''ویسے میں سچ کہوں تو یہ شادی پہ لڑکی والوں کی طرف سے ساس نندوں اور لڑکے کے دوسرے رشتے داروں کو کپڑے اور زیور وغیرہ دینا ہی غلط ہے۔''

''مجھے تو پہلے ہی پتا تھا، یہ ضرور کوئی رخنہ ڈالے گی۔''

''ارے بیٹا ان سب سے لڑکی کی ذرا سسرال میں عزت بن جاتی ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، چچی اسے سمجھانے لگیں۔

''امی! عزت صرف اللہ کے ہاتھوں میں ہے، اگر ان چیزوں سے لڑکی کی سسرال میں عزت ہوتی تو ہمارا رب ہمیں اس کام کا ضرور حکم دیتا۔''

اس کی بات پہ میرے لاؤنج کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔ میرے سامنے اس کی پشت تھی وہ اسی صوفے پر بیٹھی تھی جس پر کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! لیکن ہمارے پاس کوئی کمی نہیں، جب ہم دے سکتے ہیں تو......؟''

''یہی تو مسئلہ ہے تائی امی! ان رواجوں کی لپیٹ میں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی پھر سب ہی آ جاتے ہیں، جن کے پاس پیسا ہے، ان کے لیے خرچا کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ جن کے پاس پیسا نہیں ہے اپنی عزت کی خاطر وہ بھی ان رسموں کو پورا کرتے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ یہ سب نہیں دے سکتے۔ چاہے انہیں قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ہماری ان ہی رسموں اور رواجوں نے بیٹیوں کو بوجھ بنا دیا ہے ورنہ ہمارے رب نے تو انہیں رحمت بنا کے بھیجا ہے اور مما! یہ جو آپ لوگ برکت کے لیے میلاد اور درس قرآن کرا رہے ہیں، اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں گے تو ہر کام میں برکت ہوگی۔ اول تو مجھے اس پروگرام ہی کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' وہ نمرہ کا بنایا ہوا مایوں کے فنکشن کے پرفیکٹ ٹائمنگ والا صفحہ ہاتھ میں پکڑے بولی۔

''پہلے آپ لوگ میلاد اور درس میں مرد اور عورتوں کا الگ الگ انتظام رکھ رہے ہیں، پھر اگلے دن اسی جگہ مہندی میں کمبائن گیدرنگ ہوگی۔ خود سوچیں، مطلب جب تمیز سے خواتین دوپٹہ اوڑھے درس سن رہی ہوں گی تب تو مرد عورتوں کا الگ الگ انتظام ہوگا اور مہندی کے دن ڈانس کرتی، اچھلتی کودتی لڑکیوں کو جو مرضی دیکھے...... عاشی اگر تمہاری دوستوں کا ڈانس کرنا اتنا ہی ضروری ہے تو کم از کم مرد اور عورتوں کا الگ الگ انتظام تو ہونا چاہیے۔''

''لیکن پری...... مہندی میں تو کمبائن گیدرنگ ہی ہوتی ہے۔ سب لوگ ایسے ہی کرتے ہیں۔''

اس کی باتوں سے نمرہ تو بالکل ہی پریشان ہوگئی۔

''ضروری تو نہیں جو سب کریں، وہ ٹھیک بھی ہو نمرہ!'' کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اور ویسے بھی ابھی تو پورا سال پڑا ہے شادی میں اور میرے خیال میں یہ ساری باتیں بابا اور تایا ابو سے بھی ڈسکس کر لینی چاہئیں۔''

وہ جیسے ہی مڑی، میں جو اس کے صوفے کے عین پیچھے دم بخود کھڑا تھا، کھڑا کا کھڑا ہی رہ گیا اور مجھے لگا جیسے میرے چہرے پہ عجیب ہونق قسم کے

تاثرات تھے۔ جب وہ ایک نظر مجھ پہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھی اور اس ایک سیکنڈ کی نظر میں بھی ایسی کاٹ تھی جیسے کہ اس سب میں سارا قصور میرا ہی ہو۔

"ویسے کہہ تو وہ صحیح رہی ہے۔ ہم لوگوں نے بھی شادی کو بالکل فینسی ڈریس شو ہی بنا دیا ہے۔"

سیڑھیاں چڑھتے میں نے اپنی پیچھے سے نمرہ کی آواز سنی۔ عاشی کا اس بارے میں کیا خیال تھا، یہ مجھے نہیں پتا چلا۔

☆☆☆

اگلے ویک اینڈ پہ پکنک کا پروگرام غالباً عاشی نے نمرہ سے پوچھ کر یا مشورہ کر کے ہی رکھا تھا۔ آفس سے گھر پہنچا تو مجھے آرام تک کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

"کل چھٹی تھی، تم لوگ کل صبح چلے جاتے۔ اب تو شام ہو رہی ہے۔ تایا ابو کو بہت جلدی ٹھنڈ لگ جاتی ہے۔" پانی کی بوتلیں، چائے کا سامان بھاگتے دوڑتے گاڑی میں رکھتی عاشی کو وہ مین ڈور پہ روک کے کھڑی تھی۔

"صبح کون جاتا ہے یار! اور ویسے بھی ہم لوگ سن سیٹ دیکھنے جا رہے ہیں۔"

راہداری کے شیشے میں تیاریوں کے آخری مرحلے سے نمٹتے ہوئے نمرہ نے ہیئر برش عاشی سے لے کر دو عدد منرل واٹر کی بوتلیں بھی اپنے ہینڈ بیگ میں ٹھونسیں۔

"تو بابا نہ جائیں پھر...... ہم لوگ دو گھنٹے تک آ ہی جائیں گے۔" بابا کی بیماری کا رسک لینا بھی ٹھیک نہ تھا۔ اس لیے مجھے بیچ میں بولنا پڑا۔

"لو...... اتنا خوش ہو جاتے ہیں تایا ابو سی ویو جا کے۔" میرے بجائے عاشی کو دیکھتے ہوئے اس نے میری بات کا جواب دیا۔

"چلو دیکھتی ہوں، چلو......" کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

ایک تو یہ لڑکی نہ کسی سے اجازت لیتی ہے، نہ خود اپنا دماغ استعمال کرتی ہے۔

دو گھنٹوں کی انجوائے منٹ کے چکر میں اگلے دن بابا کی کھانسی کافی بڑھ گئی تھی۔ دل تو چاہا جا کے اس کو کھری کھری سناؤں۔ مجھے بابا کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کے وہ بھاپ والی مشین کا سوئچ آن کر کے باہر نکل گئی۔ بابا کو نیبولائز کروا کے آدھے گھنٹے بعد جب میں نیچے آیا تو وہ لاؤنج میں سینٹرل ٹیبل پہ لیپ ٹاپ کھولے اپنا کوئی کام کر رہی تھی۔

"ویسے بابا کے لیے اچھا نہیں ہوا۔ کھانسی بڑھ گئی ہے ان کی۔ اس سے اچھا تھا نہ ہی جاتے۔" سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے میں نے اسے احساس دلایا۔

"نیبولائز کروا کے بہتر ہو جائیں گے۔" مجھے دیکھے بغیر بڑے منہمک انداز میں ٹائپ کرتے اس نے ایسے کہا جیسے بابا کو لے جانے میں اس کا کوئی قصور ہی نہ ہو۔

میں حیرت سے اس کی ڈھٹائی دیکھتا رہ گیا۔ میں نے پہلی دفعہ نوٹ کیا کہ وہ اب گھر میں بھی ہر وقت سر پر دوپٹا اوڑھے رکھتی تھی۔ کل جب ہم سی ویو گئے تب بھی اس نے سرمئی رنگ کا کوئی کوٹ یا عبایا ٹائپ کچھ پہنا ہوا تھا۔

میری نظروں کے سامنے آسمانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھے مسکراتے ہوئے پیپر کپ سے چائے پیتے اس کا کل والا روپ آ گیا۔

یہ بدلاؤ اس میں اب آیا تھا، پہلے تو یہ ایسی نہیں تھی۔

کچھ دن پہلے میں آفس کے کام کے سلسلے میں دو تین دن کے لیے اسلام آباد گیا تھا۔ زارا آپی تو ویسے ہی تھیں۔ اسٹائلش اور اسمارٹ سی، ان میں تو کوئی چینج نہیں آیا تھا۔ پھر یہ کیوں اتنی بدل گئی ہے۔ دوپٹے کی اوٹ نے اس کا صرف آدھے سے تھوڑا زیادہ چہرہ نظر آ رہا تھا۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جھکی پیشانی اور وہی مڑی ہوئی پلکیں۔

"آنٹی بتا رہی تھیں کہ تم نے ایف ایس سی میں کالج میں ٹاپ کیا تھا تو یار تم اتنی ذہین تھیں تو تم ڈاکٹر

بنتی ناں۔"

نمرہ کی آواز پر میں چونکا۔

"ذہین لوگوں کی تو ہر شعبے میں ضرورت ہوتی ہے۔" اگر کچھ نہیں بدلا تھا اتنے سالوں میں تو وہ اس کی بے نیازی تھی۔

"چلو ویسے یہ نرسنگ منیجر کی جاب بھی اچھی ہے۔ باہر کے ملکوں میں تو پیرا میڈیکل اسٹاف کی بہت ڈیمانڈ ہے۔"

"وہاں ڈیمانڈ ہے لیکن ضرورت یہاں ہے۔" وہ آہستہ سے کہہ کے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"لگتا ہے تمہیں امریکا، کینیڈا وغیرہ جانے کا کوئی خاص شوق نہیں۔ اصل میں تم نے تو اتنے پاپڑ نہیں بیلے نا ہماری طرح۔ بس ماسٹرز کر کے جاب شروع کردی۔ تمہیں پتا ہے ہم لوگ ڈبل فیس دیتے ہیں، لوکل اسٹوڈنٹس کے مقابلے میں اور وہ بھی لاکھوں میں۔ ہمارے لیے تو یہی اچھا ہے کہ بعد میں امریکا، کینیڈا یا انگلینڈ چلے جائیں، کسی باہر کے ملک میں تو ڈالرز میں کما کر ہی ہمارا حساب پورا ہوسکتا ہے۔ اصل میں پاکستان میں پیسے تو شاید بن جائیں لیکن کوالٹی آف لائف نہیں ہے یہاں؟

اپنی بات کے اختتام پر نمرہ نے میری طرف تائیدی انداز میں دیکھا۔

"اصل مسئلہ سسٹم کا ہے یہاں...... ویسے تو اب اویئرنیس آرہی ہے لوگوں میں۔" میری بات پہ اس کے سپاٹ تاثرات میں کوئی فرق نہ آیا۔

"کم از کم ہم اپنی زندگی میں تو یہاں کا سسٹم بہتر ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔" نمرہ نے سرد آہ بھرتے کہا۔ "ایسا نہیں ہے کہ میں اپنے لوگوں کی مدد نہیں کرنا چاہتی، میرے بھائی امریکا میں کارڈیولوجسٹ ہیں۔ وہ ہر سال رمضان میں ساری زکوٰۃ یہیں پر بھیجتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہاں پر دھکے کھانے سے بہتر ہے، آپ باہر جائیں۔ ڈالرز میں کمائیں، اپنی بھی لائف انجوائے کریں اور اپنے ملک میں پیسے بھیج کر غریبوں کی بھی مدد کریں۔"

"ہاں لیکن سسٹم پیسوں سے ٹھیک نہیں ہوتا ناں۔" بڑے لاپرواسے انداز میں لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "پڑھے لکھے لوگوں اور ان کی سوچوں سے سسٹم بنتے ہیں۔"

"تم طنز کر رہی ہو؟"

وہ ہنسی۔ "نہیں...... اپنی سی کوشش کر رہی ہوں کہ ایک قابل ڈاکٹر کو گھیر لوں کہ وہ ملک چھوڑ کے نہ جائے۔"

مجھے پتا نہیں کیوں اس کی پھیکی سی ہنسی اپنے دل پہ محسوس ہوئی۔

"ویسے باہر کے ملکوں میں رہنے کا ایک نقصان بھی ہے، وہاں ینگ جنریشن بے راہ روی کا شکار ہوجاتی ہے۔" ڈسکشن ہو ہی رہی تھی تو میں نے بھی اپنا ملک چھوڑ کے باہر جانے کا ایک نقصان گنوادیا۔

"صحیح کہہ رہے ہیں عالی شان!" نمرہ میری بات پر فوراً متفق ہوگئی۔ "ہم لوگ تو پھر بھی مڈل ایسٹ سے آئے ہیں۔ ہمارے رشتے داروں کے جو بچے امریکا، کینیڈا میں رہتے ہیں، ان کا تو وہ حال ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ ویسے میرے خیال میں بیسٹ یہ ہے کہ جب بچے چھوٹے ہوں تو اپنے ہی ملک میں رہا جائے۔ بچوں کو تھوڑا مذہب کے بارے میں پتا چل جائے، تب انسان کہیں موو کرے، کیا خیال ہے۔"

"ناٹ آ بیڈ آئیڈیا۔" میں نے کہا۔

"اکثر لوگ اب یہی کرتے ہیں، بچوں کی پرورش ایسے کرنی چاہیے کہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں جائیں، اپنے مذہب اپنی ویلیوز کو نہ بھولیں بلکہ اصل امتحان تو آزمائش میں ہے۔ ایسے سوچنا کہ اس عمر میں ادھر آجائیں، بچے ذرا بڑے ہوجائیں تو واپس چلے جائیں کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہیں، خطرے صرف ایمان کی مضبوطی سے ٹلا کرتے ہیں جگہوں کے بدلنے سے نہیں۔"

کہتے ہوئے اس نے لیپ ٹاپ بند کردیا۔

"ابھی تو تم خود کہہ رہی تھیں کہ پاکستان میں

رہنا چاہیے۔" نمرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں لیکن یہ بتانا بھول گئی تھی کہ ہر کام، ہر فیصلے کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے...... اگر اللہ نے موقع دے ہی دیا ہے، باہر جانے کا تو وہاں رہ کر اسلامی تعلیمات پہ عمل کرنا ہی اصل چیلنج ہے۔ اس کو بھی قبول کروتا کہ تمہارے ذریعے لوگوں کو اسلام کے بارے میں پتا چلے اور تمہارے اچھے عمل سے وہاں اسلام کا نام روشن ہو، بہت زیادہ آسانیاں ڈھونڈنا۔"
"ارے دیکھو کڑی بنی رکھی ہے، کسی ڈبے میں ڈال دو نمرہ کے لیے اور کباب بھی نکال کے تل دو۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی تم لوگوں کی۔"
چچی نے اون میں گتھم گتھا سلائیاں روک کے، اصل میں اپنی دختر عزیز کے بے دریغ فلسفے کو روکا تھا کہ کہیں مستقبل کی بہو کو کوئی بات گراں نہ گزر جائے۔

☆☆☆

میرا خیال تھا نمرہ صبح پرنما کے ساتھ اپنے ہاسپٹل جا چکی ہوگی۔
آفس سے آیا تو وہ اپنا سامان تیار کیے میرے ساتھ ہاسپٹل جانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔
"آج اسٹرائیک ہے۔ مجھے بھی عاشی نے بتایا، ورنہ میں خود ہی چلی جاتی۔"
وہ ٹیبل پہ رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے کھڑی ہوگئی۔
"مجھے تو پری آپی کی فکر ہو رہی ہے، کیسے آئیں گی وہ۔ آج گاڑی نہیں لے کر گئیں نا...... عالی بھائی آپ واپسی پر آپی کو لے آئیے گا نا؟"
پریشانی کے عالم میں عاشی ہمارے پیچھے چلتی پورچ تک آ گئی۔
"اس کو فون کر کے کہہ دو کہ دس منٹ میں گیٹ تک آ جائے، میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔"
بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کے نمرہ کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولتے میں نے پاس کھڑی اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹخاتی عاشی سے کہا۔
"عجیب لڑکی ہے۔ گاڑی خراب تھی تو کسی کو بولتی، ٹھیک کرا آئے۔ مجھے آج تک یہ سمجھ میں نہیں آئے گی۔" عاشی کا اس سے کانٹیکٹ نہیں ہو رہا تھا۔
"اب کیا کریں۔" ہاسپٹل کے گیٹ پر کھڑی نمرہ سے میں کہہ رہا تھا، پھر نمرہ کے ہی کہنے پر میں فرسٹ فلور اور اس کے آفس تک بھی گیا کہ محترمہ کو واپس لے جاؤں، وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ تو کافی پہلے نکل چکی ہیں۔ نمرہ بھی چلی گئی، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔
دوبارہ عاشی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔ اب میں کیا کروں۔ عجیب کوفت سوار ہوگئی، تنگ آ کے میں نے عاشی سے نمبر لے کر خود فون کرنا شروع کر دیے۔ پہلے بیل جاتی رہی پھر فون بند ہو گیا۔
آفس سے تھکا ہارا نمرہ کو چھوڑنے آیا۔ اب پرنما کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ ادھر سے عاشی بار بار فون کے دماغ الگ خراب کرنے لگی۔ اس کا اس پاگل سے کوئی کانٹیکٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔
"آج سے پہلے بھی اتنی لیٹ ہوئی ہے؟" میں بار بار یہی سوال پوچھتا۔
دس چکر اس کے آفس اور پارکنگ کے لگا لگا کے حشر الگ خراب ہو گیا۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہی۔ پتا نہیں ہسپتال کے کن راستوں سے گزر رہا تھا کہ نمرہ نے مجھے دیکھ لیا۔
"ارے عالی شان! آپ ابھی تک ہیں یہاں؟" وہ تیز تیز قدم اٹھاتی نزدیک آ گئی۔
"پرنما کا پتا ہی نہیں چل رہا، فون ہی نہیں اٹھا رہی۔ میں نے سوچا ادھر ہی دیکھوں، شاید کہیں نظر آ جائے...... اور کیا کروں۔ اتنی دیر ہو گئی۔"
میرے یوں بے تکا بولتے چلے جانے پر نمرہ نے بریک لگا دیا۔
"سر! یہ عالی شان ہیں، پرنما کے کزن۔ احسن انکل کے بیٹے۔"
"اوہ...... کب آئے انگلینڈ سے؟ پرنما نے بتایا

ہی نہیں، آپ کے آنے کا۔ کیسے ہیں آپ؟''
سفید کوٹ پہنے گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکائے ڈاکٹر کا اس قدر پرجوش انداز مجھے کچھ عجیب سا لگا تھا، وہ بھی اس وقت جب میں خود پرنما کی وجہ سے پریشان اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔
''پرنما کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ تو اسٹاف وین سے گھر کے لیے نکل چکی ہے، میرے سامنے ہی اسٹاف وین میں بیٹھی تھی، آپ بےفکر رہیں۔''
اسی وقت میرا دماغ گھوما۔ ردا کی مہندی کی موووی میں اس ڈاکٹر کو سو بار دیکھ چکا تھا۔ مجھے نہیں پتا، میں نے کیا کہہ کے...... کیا بنا کر رخصت لی۔ ''وہ لڑکا ڈی ایم سی میں پڑھتا ہے۔ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہونے کے بعد بھی پرنما سے ملنے کالج آتا ہے۔'' ارسل کا سالوں پہلے والا شکی سا لہجہ ''یہ ڈاکٹر علی ہیں اور سر یہ پرنما کے کزن۔''
آج میں کیسے اس کے لیے پریشان ہوا تھا، وہ نہیں ملے گی تو جیسے دم نکل جائے گا۔ اس کی پریشانی میں ہسپتال میں مارے مارے پھرتے اپنے وجود پر مجھے رونا آرہا تھا...... اور اس وقت وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ بیٹھی گپیں لگا رہی تھی' میں گھر پہنچا تو وہ آچکی تھی۔ پھر میں ہفتوں اس کی شکل نہ دیکھتا۔ بات تو پہلے بھی اس سے نہیں کرتا تھا۔ تب بھی وہ میرے اعصاب پر سوار رہتی۔ تنگ آکر میں نے امی سے نمرہ کے لیے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

''کاش کہ تمہیں پہلے پتا چل جاتا پرنما......!''
''کس بات کا؟'' گرم گرم چائے کپوں میں انڈیلتے میں نے اس پاگل سے پوچھا تو فریج کھولے چائے سے پہلے آلو بخارے سے اپنے دانت کھٹے کررہی تھی۔
''بسکٹ نکالوں؟'' سامنے کیبنٹ میں جھانکتے میں نے اس سے پوچھا۔
''نہیں۔'' اس نے آلو بخارے کی گٹھلی منہ سے نکال کے ڈسٹ بن میں پھینکی۔

''کاش کہ تمہیں پہلے پتا چل جاتا نا؟''
''کس بات کا کومل؟'' چائے کی ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے میں نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا اور اسے سامنے ٹیرس کے جالی کے دروازے کو کھولنے کا اشارہ کیا۔
''یہی کہ تمہیں......'' اس نے دوسرا آلو بخارا منہ میں ڈالا۔ ''کہ تمہیں عالی شان سے محبت تھی۔''
''کومل! دیوانی تو نہیں ہوگئی ہو؟'' میں نے بوکھلاتے ہوئے تیزی سے ادھر اُدھر احتیاطاً دیکھا۔
''پاگل ہوگئی ہو، یوں ہی منہ کھول کے اس کا نام لے رہی ہو۔'' شکر تھا کہ کپوں سے چائے نہیں چھلکی تھی۔
''تو کیا اب میں نام لینے سے پہلے اس کی شان میں قصیدہ گوئی کروں۔''
''اچھا بس اب چپ ہوجاؤ، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔'' میں نے چائے کی ٹرے ٹیرس کی چھوٹی سی میز پہ رکھتے اسے ذرا سختی سے ڈپٹا۔
''کان ہی ہوتے ہیں منہ تو نہیں، جو یہ بکواس کرسکیں۔ آلو بخارے کھاؤ گی؟''
چڑ کرکہتے اس نے میرے سامنے سیاہ آلو بخاروں سے بھرا باؤل کیا۔
''مجھے نہیں شوق چائے سے پہلے دانت کھٹے کرنے کا۔'' میں نے اس سے بھی زیادہ چڑ کے کہا۔
''ہاں بس تم انسانوں ہی سے دل کھٹا کیا کرو''
''کب کی فلائٹ ہے تمہاری؟'' میں نے موضوع بدلنے کی خاطر اس سے پوچھا، ویسے بھی اس سے زیادہ میں، اس پر غصہ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ پہلے ہی وہ تین مہینے بعد لاہور سے آئی تھی اور اگلے ہفتے اس نے پھر سال بھر کے لیے آسٹریلیا چلے جانے تھا، کسی ریسرچ پروگرام کے سلسلے میں۔
''ویسے تم کچھ دن ریسٹ کرلیتیں، ابھی تو آئی تھیں لاہور سے۔ ابھی تو کورس کی تھکن بھی نہیں اتری ہوگی۔''
''تھکن اتار کے کرنا بھی کیا ہے۔ اچھا ہے نا

کام کا مومنٹم برقرار رہے۔"
وہ ایسی ہی تھی، عجیب وغریب سی۔ آلو بخاروں کے بعد اب مزے سے چائے پی رہی تھی۔
"تمہاری گاڑی کہاں ہے؟" واپسی پہ گیراج میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے اس نے مجھ سے پوچھا۔
"وہ میری گاڑی ہی کب تھی۔"
"ہیں...... پھر...... کس کی گاڑی تھی...... اور تم پہ یہ بلاوجہ کی اداسی کا دورہ کیوں پڑ گیا۔" مجھے تعجب سے دیکھتے اس کی نظر گہری ہو گئی۔
"کومل...... ادھر آس پاس اینٹ یا پتھر بھی نہیں ہیں۔ میں نے ہیلمٹ بھی نہیں پہنا ہوا لیکن پھر بھی تم اپنے دونوں ہاتھ مجھے پکڑا دو۔ وہ اصل میں نا وہ آیا ہوا ہے آج کل۔"
"کون...... مصطفیٰ؟" اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔
"نہیں وہ جسے تم الو کہتی تھیں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھامے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"الو کون...... آ آ...... الو...... عالی...... عالی شان......" وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔
"کب...... کب...... آیا وہ؟" تجسس کے ساتھ ساتھ میرے ہاتھوں پہ اس کی گرفت بھی سخت ہو گئی۔
"یہی دو تین مہینے ہوئے ہیں۔" میں نے شرمندگی سے جیسے کسی جرم کا اعتراف کیا۔
"اور تم مجھے اب بتا رہی ہو۔" اس نے غصے سے میرے دونوں ہاتھ جھٹکے۔
"تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ تم اسے چاہتی تھیں۔"
"اور تمہاری ان ہی حرکتوں کی وجہ سے میں تمہیں کچھ نہیں بتاتی...... اچھا سنو تو......" میں اس کے پیچھے بھاگی۔ "کل تو آ رہی ہو نا ہاسپٹل۔ تایا ابو سے ملنے؟"
اسے روٹھے روٹھے گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھ کر میں نے رسانیت سے پوچھا۔
"اچھا اب بھی...... کل اس کے سامنے کہیں تمہارا پول نہ کھل جائے اس لیے آج تین مہینوں بعد...... اب بتایا جا رہا ہے؟" اسٹیرنگ پر کہنی ٹکا کے اس نے تیکھی نظروں سے مجھے گھورا۔
"افوہ کومل! تم تو ایسے غصہ کر رہی ہو جیسے اس کے آنے پہ نجانے تم نے کون سا گجرے اور پھولوں کے ہار اسے پہنانے تھے۔"
"پھولوں کے تو نہیں، البتہ آرڈر پر جوتوں کے ہار ضرور بنوانے تھے۔" اس نے گاڑی ریورس کرتے ہوئے شیشہ اوپر چڑھایا اور میں اس کی غصیلی نظروں کے جواب میں اپنی مسکراہٹ دبائے اسے ہاتھ ہلانے لگی۔
اسے رخصت کر کے نے بھی ایک منٹ ضائع کیے بغیر دوبارہ اپنے لیے ایک اسٹرانگ سی چائے بنائی۔ کل میری ڈیپارٹمنٹل میٹنگ تھی اور انفیکشن کنٹرول ٹیم کی پریزیڈنٹ ہونے کے ناتے مجھے کل کی میٹنگ میں ڈسکس کیے جانے والے اہم پوائنٹس آج ہر صورت میں دوسرے ممبرز کو ای میل کرنا تھے، دراصل کچھ دنوں سے اتنی زیادہ مصروفیت رہی تھی کہ اس کام کو آج کل پر ٹالتے ہوئے یہ دن آ پہنچا تھا۔
لیپ ٹاپ اور رجسٹر بغل میں دبائے چائے کا کپ اٹھائے، میں نے فیضی کو لاؤنج میں پلے اسٹیشن لگائے کھیلتے دیکھا تو اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر کے وہیں لاؤنج کی سنٹرل ٹیبل پہ لیپ ٹاپ کھول کے نیچے قالین پہ بیٹھ گئی۔
کومل کو تو میں نے چپ کرا دیا تھا لیکن اپنی سوچوں پہ کون سے تالے لگاتی، کون سے بند باندھتی جو پتا ہی نہ چلتا۔ کب گھوم پھر کے اس شخص کے گرد جال بننا شروع کر دیتیں اور نہ ہی مجھے اس شخص کی کبھی سمجھ میں آئی تھی، جس نے پتا نہیں اتنے ایوارڈز، تمغے اور یہ ڈگریاں کس بل بوتے پہ حاصل کی تھیں؟ عقل تو نام کو نہیں تھی۔
پہلے تو تین مہینے خواہ مخواہ ہی اداسی اور بے

چارگی کی تصویر بنے پھرتا رہا، جیسے میں نے ہی اسے اس کے گھر سے دھکے دے کر نکالا ہو اور اب تقریباً پچھلے دو تین ہفتوں سے عجیب سی خوں خوار نظروں سے گھورتا نجانے کس کو دہلانے کی اوور ایکٹنگ کیے جا رہا تھا۔

ارے بھئی ایسی کیا قیامت آ گئی آپ پر؟ مجھ سے تو خیر ہمیشہ ہی پردہ داری رہی ہے، میں تو کبھی اس قابل ہی نہ سمجھی گئی کہ کبھی منہ سے دو بول ہی پھوٹ دیے جائیں لیکن آپ لاوارث تو نہیں......
آپ پہ جان چھڑکتی آپ کی اماں ہیں۔ آپ کا دم بھرتی، آپ کی چہیتی عاشی ہے۔ آپ کے ناز اٹھاتی آپ کی اکلوتی چچی جان ہیں۔ کسی سے تو بات کرو، یہ منہ بنائے بھرم کس کو دکھا رہے ہو؟ اور کچھ نہیں تو جن کے لیے وہاں کی رنگینیاں چھوڑ کے آئے ہو۔ کم از کم ان ہی کا کچھ خیال کر لو...... بس چار دن کی چاندنی تھی۔ پہلے تو رات دن جب دیکھو صاحب زادے ابا کے بستر کی پٹی سے لگے بیٹھے نظر آتے تھے پھر وہ وقت بھی آیا کہ آفس ہی کے ہو کے رہ گئے۔

ماں باپ کا موڈ کے حساب سے تو خیال نہیں رکھا جاتا۔ تایا ابو کی طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے کھانسی ہوئی پھر بخار نے آ لیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ ہاسپٹل کے لیے نکلنے سے پہلے میں ان کو ایک نظر دیکھنے ان کے کمرے میں چلی گئی۔ اب کیا سانس اکھڑتی دیکھ کر میں پہلے ان صاحب سے اجازت نامہ سائن کراتی پھر انہیں ہسپتال لے کر جاتی اور گزشتہ سالوں سے میں یہی تو کرتی آ رہی ہوں۔

افسوس تو مجھے اس شرمندگی کا ہے جو مجھے علی کی موجودگی میں اٹھانی پڑی۔ ایک تو وہ بے چارا اپنا مارننگ راؤنڈ چھوڑ کے تایا ابو کو دیکھنے ایمرجنسی میں آیا۔ بعد میں شاید اس نے اپنے کنسلٹنٹ سے جھاڑ بھی سنی ہو گی اور یہ شخص بجائے اس کا شکر گزار ہونے کے اسے ایسے ایٹی ٹیوڈ دکھا رہا تھا، جیسے علی ہسپتال کا ڈاکٹر نہیں۔ اس کے باپ کا نوکر ہو۔

بس تائی امی سے غلطی ہو گئی جو انہوں نے اس جاہل کو بتایا کہ میں اور علی ایف ایس سی میں کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ اصل میں اسے علی سے نہیں اسے مجھ سے دشمنی ہے، تب ہی علی سے اتنی خار کھاتا ہے۔

کل مصطفیٰ بھی تایا ابو کو دیکھنے ہاسپٹل آیا تھا اس سے تو بالکل ٹھیک طرح سے بات کر رہا تھا۔ علی بے چارے کو پتا نہیں کیا سمجھ کے اتنا بھرم دکھاتا ہے۔ یہ گھٹیا انسان،

ایک تو میں اس علی سے بھی تنگ آ گئی ہوں اسے کس نے کہا ہے کہ دن میں دس دس چکر تایا ابو کے کمرے کے لگائے؟ ٹھیک ہے تم ان کی بہت عزت کرتے ہو لیکن جب ان کے صاحبزادے تمہیں ذرا بھی گھاس نہیں ڈالتے تو الٹی کھوپڑی کے آدمی تم ہی کچھ عقل کر لو۔ عزت نفس بھی کوئی چیز ہوتی ہے کہ نہیں......؟

اتنا تو میکے والے بھی نک چڑھے دامادوں کو برداشت نہیں کرتے جتنا تم اس کے آگے پیچھے پھرتے ہو۔ اچھا ہے میں تو کہتی ہوں اچھا ہے۔ اس علی کی بھی ذرا عقل ٹھکانے لگے جو بلاوجہ اس کی وکالت کرتا رہتا تھا اچھا ہے خود ہی اپنی آنکھوں سے کا اس کا اصل چہرہ دیکھ لے۔

تایا ابو کی معمولی سی کھانسی چیسٹ انفیکشن کی صورت میں سامنے آئی تھی۔ ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ان کو ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوئے۔ اس دوران میرا ایک پاؤں ہاسپٹل میں تو دوسرا بھی ہاسپٹل ہی میں رہا۔

آج بڑی مشکل سے چھٹی لے کر آئی تھی جس میں سے آدھی تو کومل کی غیر متوقع آمد کی نذر ہو گئی اور اب میں آدھے گھنٹے سے میٹنگ میں ڈسکس ہونے والے اہم نکات کے بجائے کس غیر اہم شخص کے گھٹیا اوصاف پہ مغز ماری کر رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی کے مخصوص ہارن کی آواز پہ میں شیطان کا نام لو شیطان حاضر۔ کے تحت اپنی چیزیں سنبھالتی اٹھنے کے لیے پر تولنے لگی تھی کہ کسی چاق و چوبند جنگلی فوجی کی پوزیشن سنبھالے دشمن پہ تابڑ توڑ حملے کرتے فیضی نے پلے اسٹیشن کو پوز کر کے مجھے دیکھا۔

''عالی بھائی آ گئے۔'' اور خبردار کرنے کا انداز ہی نہیں پلے اسٹیشن کا ریموٹ دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ گردن موڑے میرے اٹھنے کا بھی منتظر تھا یعنی کہ اب کل کے بچے بھی میرے چوہوں کی طرح بل میں جانے کا نوٹس لینے لگے تھے۔ میں نے چارجر دوبارہ سے لیپ ٹاپ اسے منسلک کر دیا۔

''یار تم کھیل کھیل کے بور نہیں ہو جاتے......؟''

ویسے تو مجھے ایک فیصد بھی اس کے یہاں بیٹھنے کی امید نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں ٹک گیا تھا اپنی نظروں کو کوشش کے باوجود بھی میں اپنے سے انچوں کے فاصلے پر چمکتے کالے جوتوں پر پڑنے سے روک نہ سکی۔

''تو اور ہے ہی کیا کو میرے پاس کرنے کے لیے..... آپ کو پتا ہے میری کلاس کے لڑکے آج ترکی گئے ہیں ٹرپ پہ۔

کوئی دوسرا گیم ڈاؤن لوڈ کرتے فیضی صاحب کے اس درجہ حسرت سے کہنے میں اصل میں یہ راز پنہاں تھا کہ پلے اسٹیشن کے دورانیے کے اعتبار سے ان سے کسی بھی قسم کی باز پرس نہ کی جائے وہ پہلے ہی قسمت کے مارے ہوئے ہیں۔

''تمہارے اسکول والوں نے ارینج کیا تھا ٹرپ......؟''

''تم بھی چلے جاتے؟'' یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ پوچھنے والے بھی ان ہی کے بڑے بھائی تھے۔''

''پر ہیڈ ڈیڑھ لاکھ روپے دینے تھے۔''

''تو اس میں کون سی بڑی بات تھی۔ تم بھی دے دیتے۔''

''کیسے جاتا پری آپی نے پرمشن ہی نہیں دی۔'' میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''کیوں؟'' سوال میرے بارے میں تھا لیکن کڑے تیوروں کے ساتھ جواب فیضی سے طلب کیا جا رہا تھا۔ میری تو سمجھ میں ہی نہ آیا۔ کہ کیا کروں؟ رجسٹر پہ اللہ جانے کیا کیڑے مکوڑے جیسی چائنیز ٹائپ کی رائٹنگ ہو چکی تھی۔

''پری آپی نے کہا کہ بہت زیادہ پیسے ہیں۔ اتنے میں تو پورے مہینے کی گروسری آ جاتی ہے۔'' دو مختلف موقعوں پر کہی ہوئی باتیں فیضی بہت غلط جگہ ملا کے بتا رہا تھا۔

''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' میرے خیال میں یہ کہتے ہوئے اس نے غصہ سے میری طرف بھی دیکھا تھا۔ کیڑے مکوڑے بناتے میرا دل دھڑک دھڑک کے بے قابو ہونے لگا۔ مجھے تو ویسے ہی اس سے ڈر لگتا تھا اور اس وقت تو وہ اپنے جاہ و جلال کے عروج پہ تھا۔

''آج گئے ہیں وہ لوگ؟ تم معلوم کرو وہ کس ہوٹل میں ٹھہرے، ہیں تم ابھی بھی جا سکتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں آج یا کل کی کوئی ترکی کی فلائٹ بک کرتا ہوں تمہاری۔''

وہ موبائل پر کچھ سرچ کرتا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اس کے پیچھے فیضی اور میکانکی انداز میں فیضی کے پیچھے میں۔

''میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ...... کہ......ہم گھر پہ رہ کے بہت فن کریں گے فیضی...... اور دو دریا بھی تو جائیں گے۔''

میں نے اپنے آگے کان بند کیے سیڑھیاں چڑھتے فیضی کو آہستہ آواز میں جھنجوڑتے ہوئے یاد دلایا۔

''پوری کلاس ٹرپ پہ جاتی تو میں بھی پیسے دے دیتی۔''

ان دونوں کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے بالآخر مجھے اسی کو مخاطب کرنا پڑا فیضی تو شاید مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیتا۔

''ہاں پری باجی نے کہا تھا کہ یہ تو اچھی بات نہیں کہ جن کے پاس پیسہ ہے وہ انجوائے کریں اور باقی منہ دیکھیں۔''

''تو اب جو تم ان کا منہ دیکھ رہے ہو وہ......؟''

ایسی عجیب صورت حال کا تو کبھی سوچا نہ تھا۔
"ہم انجوائے کریں گے نا..... آج چلتے ہیں نا..... دو دریا..... ہم ان سے زیادہ انجوائے کریں گے۔"
"تم جاؤ یار..... معلوم کرو وہ لوگ کس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں اور جا کے اپنی بکنگ کرو۔"
مجھ پر ایک بیزاری نظر ڈالتے ہوئے اس نے سیڑھیوں کی ریلنگ سے ٹیک لگائے مظلومیت کی تصویر بنے فیضی کو اس کے کمرے میں بھیجا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے سے پہلے قہر آلود نظروں سے مجھے دوبارہ دیکھا۔
"وہ سولہ سال کا لڑکا ہے۔ بچہ نہیں جو تمہارے بہلاوے میں آجائے۔ ایسی باتوں سے بچے بہلتے ہیں یا وہ لوگ جن کے پاس پیسہ نہیں ہوتا اور میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ میرے بھائی کو کسی محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"
"اپنے چار پیسوں کی چمک دمک اپنے بیوی بچوں کو دکھانا۔ ہمیں نہیں۔ اور فیضی کے معاملے سے اپنے آپ کو دور رکھو۔ سمجھے..... وہ تر کی نہیں جائے گا۔"
پتا نہیں مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ زور سے دروازہ دھکیلتے میں اندر اس کے مدمقابل کھڑی ہو گئی۔
"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ جو منہ میں آرہا ہے بکے چلی جارہی ہو۔ چار چیپٹر پڑھا کے تم کیا سمجھتی ہو۔ اس کی زندگی کے سارے فیصلے تم کرنے لگ جاؤ گی وہ میرا بھائی ہے اور میں جو بہتر......"
"تمہارا بھائی......؟ جب تمہارا بھائی اسموکنگ کرتا تھا۔ نشہ کرتا تھا۔ تب تم کہاں تھے؟ جب وہ کلاسیں بنک کر کے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا تھا۔ تب تم کہاں تھے؟ جب اس کو سال ریپیٹ کرنا پڑا تو تم کہاں تھے عالی شان؟ جب اس گھر کو تمہاری ضرورت تھی۔ تب تم کہیں نہیں تھے..... کیونکہ تم ناراض ہو کے سوگ منا رہے تھے۔ سوگ ہم بھی منانا چاہتے تھے تمہارے جانے کا..... لیکن ہم افورڈ نہیں کر سکتے تھے..... پوری کلاس ٹرپ پر جا رہی تو میں خود اسے پیسے دیتی جانے کے..... پہلے ٹرپ اسکول والوں نے ارینج کیا تھا..... جب زیادہ تر بچوں کو اپنے گھروں سے ٹرپ پہ جانے کی اجازت نہیں ملی تو ٹرپ کینسل ہو گیا۔ اب صرف پانچ لڑکے اپنے طور پر جا رہے ہیں اور یہ وہی لڑکے ہیں جن سے میں اسے بچانا چاہتی ہوں..... کوئی ٹیچر ان کے ساتھ نہیں جا رہا۔ پیسہ خرچ کرنے سے پہلے پوری بات معلوم کر لیا کرو۔ جہالت اور تکبر سے خرچ کیا ہوا پیسہ بعض اوقات ہلاکت کا سبب بن جایا کرتا ہے۔"
میں برف کے تودے کی طرح ڈھے گیا۔
"جب سے پری آپی نے پڑھانا شروع کیا ہے یہ تو تب سے سدھرا ہے۔" عاشی کی مذاق مذاق میں کہی ہوئی بات
پہلے تو چار چار جیکلس میں فیل ہوتا تھا..... میں تو سوچ رہی تھی کہ یہ اسکول ہی چھڑا دوں..... یہ تو پری کی ہمت ہے۔"
مما کا تشکر آمیز لہجہ......
وہ جو پری نے دوائیوں کے اوقات والا صفحہ لگایا تھا وہ صفائی کرتے ہوئے پھٹ گیا..... اس سے پوچھنا کہ اس ہفتے سے آدھی گولی کرنی ہے؟
اور کتنے دنوں بعد میں وہی ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔ بابا کا ڈینٹسٹ کا اپوائنٹمنٹ ، تایا ابو کا سائیکاٹرسٹ کا اپوائنٹمنٹ، ردا کے بچوں کے عید کے کپڑے ڈی ایچ ایل کرنے ہیں۔ سنڈے کو اوپر کے کچن کے لیے پلمبر کو بلانا ہے..... پوری ڈائری دنوں ہفتوں مہینوں کے اوقات کار کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی تین سو صفحوں میں سے وہ نظم صرف ایک صفحہ پر لکھی تھی اور میں نے اس دن صرف وہی پڑھی تھی......
اسی طرح ہماری نظروں کے سامنے بھی کسی انسان کا اتفاق سے کوئی ایک روپ سامنے آجاتا ہے اور ہم اسی پر ایمان لے آتے ہیں۔ جس طرح اس کی

ڈائری میرے لیے انکشافات کا باعث بنی تھی۔ اسی طرح اس کی شخصیت بھی تھی۔ یا شاید میں ہی سطحی سوچ رکھتا تھا۔

میں کافی دیر بعد نیچے آیا تھا۔

"یہ برگر میں دیکھنا شاید میں چیز کا سلائس رکھنا بھول گئی۔ تم اور فیضی تو برگر کھاؤ گے نا۔ باقی لوکی گوشت تو ہے ہی اور یہ دلیہ ہاسپٹل کے لیے..... ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو کسی ڈبے میں ڈال دینا۔"

"آپ نے اپنے لیے برگر نہیں بنایا۔" فریج کھولتے ہوئے عاشی نے اس سے پوچھا۔

"نہیں میں بس چائے پیوں گی۔"

وہ کیتلی میں چائے کا پانی بھرنے لگی۔

"آپی! ہاسپٹل سے ڈاکٹر علی کا فون آیا ہے۔" اس کے پلٹنے سے پہلے میں نے فیضی کے ہاتھ سے کارڈلیس لے لیا۔

"اپنی آپی سے کہنا کہ میرے لیے بھی ایک کپ چائے بنا دیں۔" علی کو ہولڈ کراتے میں نے فیضی سے کہا اور دس دنوں میں پہلی مرتبہ علی سے انسان کا بچہ بن کے بات کی۔

☆☆☆

یہ شاید اس کے دوسرے یا تیسرے دن کی بات ہے۔ بابا کی طبیعت کافی بہتر ہو چکی تھی۔ ایک دو دن میں ڈاکٹر نے ڈسچارج کا کہا تھا۔ وہ شاید ہاسپٹل کے لیے نکل رہی تھی۔

"میں بھی ہاسپٹل جا رہا ہوں تم میرے ساتھ ہی آجاؤ۔" اسے بابا کی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں نے کہا۔

"نہیں میں اپنی ہی گاڑی لے جاؤں تو اچھا ہے۔ میں تو ایک دو گھنٹے میں واپس آجاؤں گی۔ تم تو شاید رکو گے۔"

"تم بابا کی گاڑی رہنے دو۔" اس کو اتنے دھڑلے سے بابا کی گاڑی کو اپنی کہتے میں بڑی مشکل سے مسکراہٹ روکی۔

"ابھی تھوڑی دیر میں چچا جان بھی آفس سے ہاسپٹل پہنچیں تو ان کے ساتھ واپس آجانا۔" حیرت انگیز طور پہ وہ مان بھی گئی۔

"تمہاری پے کتنی ہے پرنما؟" بیک ویو مرر میں دیکھتے گاڑی ریورس کرتے میں نے اس سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ایسے ہی...... سوچ رہا تھا تم اپنے لیے ایک اچھی سی گاڑی کیوں نہیں لے لیتیں؟"

"میرے لیے گاڑی موجود ہے اور تمہیں میرے بارے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

کہہ کے وہ گاڑی سے باہر دیکھنے لگی اور پھر پورا راستہ باہر ہی دیکھتی رہی۔ اس لڑکی سے بے تکلف ہونے کے لیے کم از کم یہ والی زندگی تو ناکافی تھی۔ پتا نہیں علی کی اس سے کیسے دوستی تھی، حالانکہ وہ تو اچھا خاصا باتونی تھا۔ اور کس طرح کی دوستی تھی؟ اور مصطفیٰ کیا چاہتا تھا؟ اس تکون میں کون سے دو لوگ ایک دوسرے سے مخلص تھے؟

آج میں اس گتھی کو سلجھانے کا ہی سوچ کے آیا تھا۔ میں اور پرنما آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے بابا کے پاس علی بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کے پتا چلا کہ امی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وقار چچا کے ساتھ گھر کے لیے روانہ ہوئی ہیں۔

"کھانا کھایا آپ نے؟" علی کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے بابا سے پوچھا۔ پرنما گھر سے لایا سامان دیوار کے اندر بنی الماری میں رکھنے لگی۔

"لڑکی، تم میری بیوی کو ورغلاؤ نہیں۔" علی نے الماری کی طرف منہ کر کے کہا۔

"ورغلانے کی میری عادت نہیں اور اچھی بات کی میں صرف حوصلہ افزائی کرتی ہوں۔" خشک دودھ ڈبے میں بھرتے ہوئے اس نے علی کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ سا جواب دیا۔

"انکل آپ کو پتا ہے۔" وہ پرنما کو چھوڑ کے بابا کی طرف گھوم گیا۔ "میں اپنے گاؤں میں ایک چھوٹا سا ہاسپٹل بنانا چاہتا ہوں، جس میں کم از کم گائنی میں

اور فیملی میڈیسن تو ہو۔ اور اس سب میں مجھے دو سے تین سال تو ضرور لگ جائیں گے۔ اسٹاف ہائر کرنا عمارت کھڑی کرنا یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اور اب ایک نئی خبر سنیں...... میری بیگم صاحبہ کو بھی اسی عرصے میں ایک عدد اسکول کھولنے کی دھن سوار ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم دونوں دو چار سال تک ابھی صرف ہاسپٹل والے پروجیکٹ پر ہی فوکس کریں۔''

''جو لوگ اپنے مفاد کے لیے بات کو توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہیں وہ مجھے زہر لگتے ہیں۔''

''تم سیدھا سادا ہی کہہ دیتیں کہ میں تمہیں زہر لگتا ہوں۔ اتنا وسیع زہریلا دائرہ کھینچنے کی کیا ضرورت تھی یا اس زہریلے دائرے کے زمرے میں کچھ اور بھی لوگ آتے ہیں اور تم ان ڈائریکلی ان کو بھی بتانا چاہتی ہو کہ وہ بھی تمہیں زہر......''

علی کی پٹڑی سے اترتی بے تکان بکواس...... الماری کے دروازے سے نمودار ہوتی کاٹ دار نظروں سے دم توڑ گئی۔

''تایا ابو!'' وہ خالی شاپنگ بیگز بیڈ کے نیچے رکھے ڈسٹ بن میں ڈال کر، بابا کے پاس بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ نگہت اسکول نہیں کھول رہی، وہ بے چاری چاہتی ہے کہ اپنے گھر ہی کے دو کمروں میں ٹیوشن سینٹر کھول لے، جس میں لڑکیوں کو کم از کم میٹرک انٹر اور بی اے کی تیاری کروا سکے۔ تاکہ چند سالوں میں۔''

''جی جی جناب چند سالوں میں قابل ٹیچروں کی ایک فوج تیار ہو جائے جو ناصر آباد کے گلی کوچوں میں علم کی شمعیں روشن کرتی پھرے۔ ایسے نہیں ہوتا آپا جی۔ پہلے تو اسپتال کھولنا ہی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ زمین اور جذبے کے علاوہ ہمارے پاس ہی کیا؟

''تو وہ مصطفیٰ تمہیں سپورٹ تو کرنا چاہتا ہے۔ تم خود ہی نہیں مانتے۔ تایا ابو دیکھیں، اس نے کون سا وہ پیسے اپنے بیوی بچوں پر لگانے ہیں۔ خدمت خلق میں اگر وہ بھی اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے تو اس میں حرج کیا ہے؟''

''چلو ٹھیک ہے میں مصطفیٰ کی ہیلپ لے لوں گا...... لیکن تمہاری شادی کے بعد......''

''میرا خیال ہے علی ٹھیک کہہ رہا ہے دیکھو بیٹا! وہ تمہارے حوالے سے ہی علی کو جانتا ہے...... تو اچھا ہے...... پہلے......''

''تایا ابو! آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں؟ اس کو کسی کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے، رات دن یہ اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اپنے ہاسٹل سے زیادہ تو یہ اس کے اپارٹمنٹ میں پایا جاتا ہے......'' وہ دوبارہ سے الماری ٹھیک کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

''وہ تو میں اس پر نظر رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہوں تاکہ پتا چلے وہ کہاں جا رہا ہے کس کس سے ملتا ہے...... دیکھو نا......'' وہ میری طرف مڑا...... ''ہماری برنما بے چاری سادہ سی ہے کہ فیشن کی سمجھ بوجھ نہ اسٹائل کا اتا پتا۔ ایک شکل اللہ نے اچھی دی تھی۔ جل کڑھ کے اس کا بھی بیڑا غرق کر لیا...... اور مصطفیٰ ایک تو وہ پائلٹ ہے۔ اوپر سے اتنا ہینڈسم اور آج کل کے زمانے کا تمہیں پتا ہے۔ اور یہ ایئر ہوسٹس تو رہتی ہی اس تاک میں ہیں کہ کسی طرح۔''

''اور دوسری مرتبہ برنما کی آنکھوں سے شعلے ٹپکتے دیکھ کر میں نے علی کو خود کہنی مار کے چپ کرایا۔''

☆☆☆

برنما صحیح کہہ رہی تھی۔ مصطفیٰ اور علی کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ دو دن بعد جب بابا ڈسچارج ہو کے گھر آ گئے تو وہ دونوں بابا کی خیریت معلوم کرنے ساتھ ہی آئے تھے۔ آج بہت دنوں بعد گھر کی فضا خوش گوار اور ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بابا کو بھی وہیل چیئر پر سب کے بیچ لے آیا۔

ایک پائلٹ اور ڈاکٹر کی موجودگی میں فیضی کے لیے مستقبل کی فیلڈ منتخب کرنا مشکل مرحلہ بن چکا تھا۔ کبھی اس پہ اڑان بھرنے کا جنون سوار ہوتا تو کبھی دکھی انسانیت کی خدمت کا جذبہ جگا اٹھتا۔

علی بھائی یہ ڈاکٹر بن ہی نہیں سکتا۔ آپ نے کبھی اس کی ڈرائنگ دیکھی ہے، اتنی بری ڈرائنگ ہے اس کی...... اور میڈیسن میں تو میں نے سنا ہے بہت ڈائی گرامز بنانے ہوتے ہیں...... ہے ناں؟"

سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے جائے کی ٹرالی لے کر آتی عاشی نے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی......

عاشی جا کے امی اور چچی جان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور فیضی اٹھ کے سب کو چائے سرو کرنے لگا۔ مجھے فیضی نے بتایا تھا کہ پرنما نے عاشی کو غیر آدمی کو چائے وغیرہ پیش کرنے سے منع کیا ہے۔ پہلے ہمارے گھر کا ماحول اتنا مذہبی قسم کا نہیں تھا۔ ردا اور زارا نے شاید ہی کبھی سر پہ دوپٹہ اوڑھا ہو ان چار پانچ سالوں میں کافی فرق آ چکا تھا۔

"تو اس میں مشکل ہی کیا ہے، تم اپنی ڈرائنگ پہ محنت کرو تو وہ بھی اچھی ہو جائے گی؟"

"ابھی بھی ڈرائنگ اچھی ہو سکتی ہے؟"

فیضی نے مصطفیٰ کو چائے پکڑاتے ہوئے حیرت سے علی سے پوچھا۔

"مستقل محنت سے ہر چیز بہتر ہو سکتی ہے تم نے سنا نہیں۔ سخت محنت قابلیت کو مات دے سکتی ہے۔" چلو میں تمہیں ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سناتا ہوں۔" علی سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ "ہمارے گاؤں میں ایک لڑکے نے میٹرک کے بورڈ میں سیکنڈ پوزیشن لی تھی لیکن جب وہ کالج میں پڑھنے شہر آیا تو اس کے چھکے چھوٹ گئے کیوں کہ اس سے کچھ پڑھا ہی نہیں گیا۔ میٹرک تک اس نے سوائے انگلش کے سارے سبجیکٹس اردو کے پڑھے تھے اور شہر میں سارے سبجیکٹس انگلش میں تھے۔ ایک دن بائیولوجی کی کلاس میں ٹیچر نے ایک کوئسچن کیا پوری کلاس میں سے کسی کو اس کوئسچن کا جواب نہ آیا۔ تب وہ لڑکا کھڑا ہوا اور اس نے ٹیچر سے کہا کہ سر اگر آپ یہ سوال اردو میں پوچھیں تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کا جواب دے سکوں گا...... جب سر نے وہی سوال اردو میں کیا تو اس بچے نے صحیح صحیح جواب دے دیا۔"

"اوہ......" سب کے منہ سے بے اختیار نکلا اور ساتھ ہی اشتیاق بھی بڑھ گیا کہ اب دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ "تو پھر ہوا یوں کہ کلاس میں کچھ ایسے بھی لڑکے تھے جنہوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا...... وہ کیا کہتے ہیں Bully کیا۔ اور پھر ایسا اکثر ہونے لگا۔ وہ لڑکا جب بھی کسی ٹیچر سے کوئی بات اردو میں پوچھنے کی کوشش کرتا۔ دوسرے لڑکوں کے مذاق کا نشانہ بنتا، اس سے پہلے کہ وہ لڑکا دل برداشتہ ہو کے کالج چھوڑ دیتا اور واپس اپنے گاؤں چلا جاتا ایک دن اسی کی کلاس کی دو لڑکیاں اس لڑکے کے پاس آئیں اور اسے مشورہ دینے لگیں کہ وہ اپنی انگریزی پہ محنت کرے۔ صرف اسی طرح وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں ان میں سے ایک لڑکی اسے ایک ٹیچر کے پاس بھی لے گئی اور پھر وہ ہر ہفتے دو سے تین مرتبہ اس ٹیچر کے گھر انگریزی پڑھنے جاتا رہا اور پھر ایسا ہوا کہ دو مہینے کے اندر اندر وہ لڑکا نہ صرف انگریزی میں کیے گئے سوال سمجھنے لگا بلکہ ان کے جواب بھی انگریزی ہی میں لوٹانے لگا اور اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ عظیم ٹیچر جنہوں نے اس لڑکے کی حوصلہ افزائی کی اور اسے پڑھا کے ایک قابل انسان بنایا۔ وہ آپ کے سامنے ہیں۔"

اس نے بابا کی طرف اشارہ کیا اور اس وقت میں نے دیکھا کہ جانے کب سے بابا کی آنکھوں میں آنسو اٹکے ہوئے تھے۔ علی نے جھک کے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"اوہ بابا!" مجھ سے بھی رہا نہ گیا میں نے آگے بڑھ کے بابا کے کمزور وجود کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" اسی وقت وقار چچا پرنما کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

ڈرائنگ روم کا ماحول کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ویل چیئر پر بیٹھے بابا کو میں اپنے ساتھ لگائے پیار کر رہا تھا۔ ان کے قدموں میں بیٹھا۔ علی ان کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ اور پرنما اپنے کھلے منہ پہ ہاتھ رکھے اس

جذباتی منظر کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

کبھی کبھی انسانوں کے اوپر چڑھے انا کے یہ سخت خول ایسے ہی ایموشنل سینز سے چٹختے ہیں۔ احساسات کی بھرمار ہی ان کا توڑ ہے۔ احساس اور اظہار کی نشوونما بغیر...... خاص طور پر باپ بیٹے کا پیار عمر بھر اظہار کے بغیر انا کی قید میں مقید کیسے گھٹا گھٹا سا رہتا ہے...... بابا سے بڑھ کر میرے لیے تو شاید کوئی ہو سکے لیکن ان کے لیے مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس بات کو سمجھنے میں مجھے پوری عمر لگ گئی۔

''آئی لو یو بابا'' جو کبھی میں اکیلے میں نہ کہہ سکا آج بھری محفل میں سب کے سامنے بابا کا ماتھا چوم رہا تھا۔

☆☆☆

چیزیں اتنی مشکل نہیں ہوتیں جتنا ہم انہیں بنا دیتے ہیں میری پرنما سے شادی کی بات چلنے سے بھی پہلے علی کا اپنی کزن سے نکاح ہو چکا تھا...... یہی نہیں اس کی بیوی نے جواب تک مختلف شہروں اور ہاسٹلوں میں رہ کر تعلیمی مدارج طے کیے تھے۔ وہ علی کی محبت اور اس کے مکمل تعاون کے بغیر ناممکن تھے۔

میں نے بہت دیر سے جانا کہ محبت صرف نخرے دکھائے۔ دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچانے کا نام نہیں بلکہ اپنے چاہنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا۔ ان کی راہوں سے کانٹے چننا بھی پیار ہے۔

جتنا بابا نے پرنما کو چاہا تھا، اس سے کہیں زیادہ اس نے لوٹایا تھا۔ مشکل وقت میں میرے بجائے وہ بابا کے ساتھ فیضی کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔ از خود اخذ کیے نتائج اور بدگمانیاں انسان کو دیمک کی طرح کھا جاتی ہیں اور پھر سب کچھ بگڑ جاتا ہے اور اب ان بگڑے حالات کو سدھارنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ پرنما تو میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہتی تھی لیکن کہتے ہیں نا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور جائز نہ بھی ہوتا تو جس طرح گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے تھوڑی ڈرامہ بازی کی ضرورت مجھے بھی پڑ ہی گئی۔

جتنے مگن انداز میں وہ بیگ کاندھے پر لٹکائے اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی مجھے بیٹھا دیکھ کے اس نے جھٹکا کھا کے گرنا اور پھر بھڑکنا ہی تھا۔

''اس بدتمیزی کا مطلب؟'' اپنے آپ کو سنبھالتے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ غصے سے پھنکاری۔

''بیٹھو...... تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ سب کے سامنے نہیں کر سکتا تھا۔''

اور میری بات سن کے اس کے چھکے تو چھوٹنے ہی تھے وہ آپے سے بھی باہر ہو گئی۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے......؟''

''کیوں پہلے بھی تو میری اور تمہاری شادی ہو رہی تھی۔''

''شٹ اپ...... تم ہو کن ہواؤں میں؟''

''ہواؤں میں؟'' میں ہنسا۔ ''میں زمینی مخلوق ہوں ہواؤں میں تو وہ صاحب ہیں جو آپ کے سات پچھلے چھ مہینوں سے ہاں اور ناں کے بیچ پنڈولم کی طرح جھول رہے ہیں۔ تم راضی نہیں ہو تو میں بابا کو بتا دیتا ہوں کہ آپ کی لاڈلی جس شخص سے شادی کرنے جا رہی وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔''

''شٹ اپ تم سے یہ بکواس کس نے کی......؟ علی نے؟''

''بالکل نہیں۔''

''پھر؟ مصطفیٰ نے؟ کومل نے؟''

''اوہ تو گویا یہ اتنے سارے لوگوں کی ملی بھگت ہے اور دھوکا کسے دیا جا رہا ہے جنھوں نے تمہیں پالا پوسا۔ جو تم پہ اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ یہ صلہ دے رہی ہو تم ان کی محبت کا؟ بتاؤ کیا یہ جھوٹ ہے کہ مصطفیٰ نے ایمریٹس ایئر لائنز کی ایئر ہوسٹس سے خفیہ شادی کی ہوئی ہے اور اسی وہ لیے آئے دن دبئی پہنچا ہوتا ہے......''

''تم اپنا مسئلہ بتاؤ؟ تم کیا چاہتے ہو؟'' غصہ اپنی جگہ تھا پر طنطنے میں خاصی کمی واقع ہو چکی تھی۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے کسی معاملے میں نہ بولوں۔

ٹھیک ہے میں نہیں بولوں گی۔۔۔۔ اگر تمہیں۔۔۔۔ اس دن کی فیشی کے ٹرپ والی بات پر غصہ ہے تو آئی ایم سوری۔۔۔۔" ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ رائٹنگ ٹیبل کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"نہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ" میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ "ایک گھنٹے بعد امی اور چچی جان تم سے میرے لیے پوچھیں گی بس تم ہاں کر دینا۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ کرسی سے اچھل پڑی۔ "دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟"

"اتنا آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے پوری بات سن تو لو۔ دراصل پچھلی مرتبہ جو خوامخواہ ہی انکار کر کے میں نے نافرمان اولاد کا لیبل لگوالیا تھا۔ میں اسے ڈھونا چاہتا ہوں۔"

کچھ کہنے کو اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

"دیکھو میں کسی کو پسند کرتا ہوں لیکن وہاں تھوڑا سا مسئلہ ہے وہ ابھی پاکستان نہیں آسکتی۔ اصل میں وہ کنورٹ ہوئی ہے اور اسلامی ماحول میں ڈھلنے کے لیے اسے کچھ وقت درکار ہے۔ یہی کوئی دو تین مہینے۔"

"تو تایا ابو تو چاہتے ہی نہیں کہ میری تم سے شادی ہو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ عالی شان۔۔۔۔" وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں دنیا زمانے کی حیرت سموئے مجھے یقین دلانے لگی۔

"کیا بات کر رہی ہو؟" میں نے منہ بنایا۔

"ابھی رات میری بابا سے بات ہوئی ہے۔۔۔۔ منتیں کر رہے تھے میری۔۔۔۔ اب میں اگر انہیں یہ کہتا کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں تو تمہیں پتا ہے پھر کیا ہوتا۔" وہ پریشانی میں غرق ہوتی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بس تم تم راضی ہو جاؤ دو تین مہینے کی تو بات ہے۔۔۔۔ دو تین مہینے بعد میں سب سنبھال لوں گا۔ ابھی میں انہیں کسی قسم کا دکھ نہیں دینا چاہتا۔"

"اور دو مہینے بعد۔۔۔۔؟ کیا دو مہینے بعد تایا ابو کو دکھ نہیں ہوگا؟" وہ اتنی معصومیت سے بولی کہ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اوہو! تم پریشان مت ہو دو مہینے بعد کوئی وجہ بھی تو ہوگی ناں انکار کی۔۔۔۔ جب لیزا پاکستان آئے گی تو میں سب سنبھالوں گا۔ ٹرسٹ می۔"

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "اچھا۔۔۔۔ لیکن یہ بات گھر ہی میں رہے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔۔" میں بہت سرسری سے انداز میں کہتا اٹھ گیا۔ "یہ بس اسی جمعہ کو گھر ہی میں امی کوئی چھوٹی سی رسم کر لیں گی۔" دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے اسے اپنا سر پکڑتے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جمعے کو اس کا ہاف ڈے ہوتا تھا۔ شاید دوپہر کا ہی کوئی وقت تھا جب مجھے اس کی دبی دبی سی چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"اٹھو عالی شان۔۔۔۔ تم سو رہے ہو۔ جلدی اٹھو۔"

صبح کے چار بجے میں اسلام آباد سے پہنچا تھا۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔ آنکھیں ملتے ہوئے میں نے اسے دیکھتے ہی شکر کیا کہ زارا آپی کے ساتھ جو دو گھنٹوں کی خواری کے بعد غرارہ سوٹ لیا تھا، اسے فٹ آیا تھا۔

"یہ کیا فضول سے کپڑے پہنے پھر رہی ہو۔۔۔۔ بالکل دلہن لگ رہی ہو۔"

"یہی تو۔۔۔۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "تم نیچے جا کے تو دیکھو لان میں اتنا بڑا فنکشن ہو رہا ہے۔" سر پہ اوڑھے بھاری کامدار دوپٹے کو ایک ہاتھ سے سنبھالے دوسرے سے غرارہ سنبھالتی وہ ہوش اڑا رہی تھی۔

"کیا؟ مگر کیوں؟" میں جھٹکے سے اٹھ کے کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگا۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ رونے لگی۔ "زارا آپی بھی آگئی ہیں یہ سوٹ لے کر۔"

"یہ سوٹ۔۔۔۔" پیشانی ملتے مجھے حیرت سے

دوبارہ اسے دیکھنے کا موقع مل گیا۔" یہ تو بہت فضول لگ رہا ہے۔ یہ ہو کیا رہا ہے یہاں؟"

"اتنے بڑے پیمانے پہ منگنی ہو رہی ہے اور تم خود اسلام آباد چلے گئے میں ہاسپٹل سے آئی تو یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں۔" وہ بے چاری کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی تھی۔

"چلو تم پریشان نہیں ہو...... میں کرتا ہوں کچھ۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

"او ہو، بھئی تم میرے کمرے سے تو نکلو ابھی۔ لوگ کیا کہیں گے؟" میں جھلاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

سب کچھ میری پلاننگ کے مطابق ہوا تھا۔ یہ بھی اپنی طرز کا ایک انوکھا نکاح تھا۔

"اس کو سمجھاؤ نا۔ ابھی رخصتی تو نہیں ہو رہی جو اتنا رو رہی ہے۔" میں نے آہستہ سے عاشی سے کہا۔

"اور کیا اور ویسے بھی رخصت ہو کے بھی جانا کہاں ہے چار فٹ دور کمرہ ہی تو بدلنا ہے۔"

"ویسے تم لوگ دو دن کے لیے کسی ہوٹل میں ہی چلے جاتے؟ کھچا کھچ مہمانوں سے بھرے ڈرائنگ روم میں ہر کوئی اپنی بولی بول رہا تھا۔

"ابھی کون سا رخصتی ہو رہی ہے جو ہوٹل میں چلے جاتے زارا آپی نے میاں کو گھورا۔

☆☆☆

امی تو میرے صبح اٹھ کے آفس جانے پر ہی حیران ہو رہی تھیں۔ ان کے خیال میں تو آج مجھے چھٹی کر لینی چاہیے تھی۔ اتنے بڑے آتش فشاں کو سینے میں دبائے مجھے آفس میں بھی کہاں چین آیا۔ اس کا ایک روپ تو میں اس دن ٹریپ والی جھڑپ کے دوران دیکھ ہی چکا تھا۔ نیچے وہ کہیں نظر نہ آئی اور اوپر اس کے کمرے میں زارا آپی کے بچوں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ اب نکاح کے دوسرے دن کسی سے اس کے بارے میں پوچھنا خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا تماشا بنوانا تھا۔ کل کی مووی میں محو عاشی سے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ اس کا اتا پتا معلوم کروں کہ کھیرے ٹماٹروں کی ٹرے اٹھائے امی وہیں آگئیں۔

"ذرا شروع سے لگانا عاشی۔" اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے انہوں نے اچانک میری طرف فکرمندی سے دیکھا۔

"تم نے کھانا تو نہیں کھانا بیٹے؟" پتا نہیں میرے چہرے پر کس قدر فقیرانہ قسم کے تاثرات تھے جو امی کو یہ خیال آیا حالانکہ میں تو نہا دھو کر پوری تیاری کے ساتھ اور اپنے حساب سے اپنے بیسٹ حلیے میں اسے ڈھونڈنے نکلا تھا۔

"نہیں۔" میں کوفت زدہ سا دوبارہ اوپر آ کے کمرے کھنگالنے لگا۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ کہیں غصے میں گھر سے تو نہیں بھاگ گئی...... لیکن گھر والے سب اتنے مطمئن سے پھر رہے تھے۔

دوبارہ سے سیڑھیاں اترتے میں نے اوپر آتے فیضی سے آہستہ سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"کون.....امی.....؟"

"ارے نہیں..... تمہاری بھابھی....." میں نے اسے دبی آواز میں جھڑکا۔

"بھابھی.....؟" اس نے پہلے سے بھی زیادہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"ہٹو یار۔" دل برا کرتا میں اسے پرے دھکیلتا نیچے آ گیا۔ سوچا کہ عاشی سے ہی اشارے سے پوچھ لوں لیکن یہاں تو وقار چچا اور چچی کے ساتھ عباد کا بھی اضافہ ہو چکا تھا اور سامنے سے ردا چائے کی ٹرالی دھکیلتی آ رہی تھی۔

"عالی بھائی! آپ پری آپی کا پوچھ رہے تھے؟" میرے ساتھ ساتھ نکاح کی مووی دیکھتے سب لوگوں نے بھی اوپر سے چیختے فیضی کو دیکھا۔ "وہ شاید اپنے کمرے میں ہوں..... بلاؤں؟"

میں نے اسے گھورا اور باہر نکل گیا..... نجانے لان کی پچھلی طرف والی ان سیڑھیوں میں ایسی کیا

خاص بات تھی جو یہ ہمیشہ یہی پائی جاتی تھی۔
"شوہر کو اتنے غصے سے دیکھنے والی عورتوں سے اللہ خوش نہیں ہوتا۔" نرمی سے کہتے ہوئے میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔
"چلو یہ بھی ٹھیک ہے پیار سے دیکھ نہیں سکتیں تو منہ موڑ لیا ادھر دیکھو۔"
بہت آہستہ سے اس کا چہرہ میں نے اپنی طرف موڑا۔
"اسی جگہ چار سال پہلے اگر تم اٹھ کے خوشی خوشی میرے ساتھ زارا آپی کو ایئر پورٹ لینے چلی جاتیں۔ تو ہماری شادی چار سال پہلے ہی ہو جاتی۔"
"تم سب جانتے تھے۔" مجھے دیکھے بغیر رندھی ہوئی آواز میں وہ جیسے بڑی مشکل سے بول پائی۔
"ہاں لیکن جو تم نہیں جانتیں، وہ تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔"
اس کی جھکی ہوئی بھیگی جڑی پلکوں اور ضبط سے سرخ چہرے کو دیکھتے میں نے کہا۔
"بہت سی باتیں ہم خود اپنے بارے میں نہیں جانتے لیکن جس نے ہمیں بنایا ہے وہ ہر چیز سے باخبر ہے کیونکہ وہ خالق ہے اور انسان مخلوق...... باوجود اس کے کہ تم میرا آئیڈیل نہیں تھیں...... تم وہ لڑکی تھیں پرنما۔ جسے میں نے پہلی دفعہ چاہا اور کبھی بھلا نہیں پایا۔
میری بات پہ اس نے بے اختیار مجھے دیکھا۔ اور اس کی نظروں کی بے یقینی کو دیکھتے ہوئے میں بے بسی مسکرایا۔
"بہت سی چیزیں انسان کے بس میں نہیں ہوتیں جس میں سے ایک محبت بھی ہے، تمہیں چاہنے سے تو تب چار سال پہلے بھی اپنے آپ کو روک نہیں پایا تھا لیکن اس دفعہ تمہیں جان کے، تمہارے خیالات جان کے مجھے لگا شاید۔ میں ہمیشہ سے ایسی ہی لڑکی کا آرزومند تھا۔ ایسی ہی سادہ، پروقار اور مکمل ...... پوری زندگی ایک گھر میں گزار کر بھی مجھے کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ تم اندر سے اس قدر اسٹرونگ ہو۔ مجھ سے بھی زیادہ اصل طاقت تو نفس کی حق پر چلنے کی طاقت ہوتی ہے۔ پرنما...... تمہارا یہ روپ میرے سامنے آیا تو میں حیران رہ گیا...... اپنے آپ پر...... تم پر...... اور خدائی کی خدائی پر...... جس نے تمہاری شخصیت کا یہ رخ مجھے دکھایا، کیا اللہ تعالیٰ کا مقصد مجھے سزا دینا تھا؟ پچھتاوے سے بڑھ کے کوئی سزا نہیں ہوتی پرنما اور مجھے کس بات کی اتنی بڑی سزا ملی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر سے میں بغیر کسی روک ٹوک کے پوری آزادی کے ساتھ اس ملک میں رہا تھا جہاں ہر طرح کی عیاشی ماحول کا بلکہ معمول کا حصہ تھی پھر بھی میں کبھی کسی حرام چیز کے پاس نہ گیا۔
پوری زندگی حلال کھایا تھا ادھر بھی حلال ہی کھایا اور حق حلال ہی کمایا۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ کیا تمہیں رد کرنے کی یہ سزا تھی......؟؟
پرنما میں نے تمہیں غرور سے رد کیا تھا کسی اچھی نیت سے نہیں کہ اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو تو اپنی مرضی سے شادی کر لو۔ اصل میں مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکا تھا کہ تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی آ چکا ہے۔"
اس بات پہ وہ ٹھٹکی۔ اس کی الجھن زدہ نظروں کے جواب میں میرے پاس سوائے ایک لمبی گہری سانس کے کچھ نہ تھا۔ میری یہ عادت، یہ کمزوری ہمیشہ سے میرے ساتھ رہی تھی اور میں نے کبھی اس چیز، اس احساس کو برا نہیں سمجھا تھا۔ اسکول کالج کے زمانے میں کبھی میں فرسٹ پوزیشن کے بجائے سیکنڈ یا تھرڈ نمبر پہ آجاتا تو میں اندر سے تو غصے سے بھر جاتا تھا لیکن دوسروں پہ اپنے دوستوں پر ایسے ظاہر کرتا جیسے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔
"ہارنا جیتنا زندگی کا حصہ ہے زندگی نہیں۔"
یہ میں اپنے دوستوں سے کہتا تھا لیکن میں خود اپنی ہار کو سر پر سوار کر لیا کرتا تھا۔ کسی کو اپنے سے آگے بڑھتا دیکھ ہی نہیں سکتا تھا لیکن اوپر اوپر سے یہ کہتا تھا کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
قول اور فعل کا یہ تضاد میری وہ خامی تھی جسے میں

نے کبھی خامی ہی نہیں سمجھا۔ میں نے کبھی پڑھا تھا گناہ کو معمولی یا چھوٹا سمجھ کے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

مجھ پر گزری تو میں نے جانا کہ میری وہ خامی جو بظاہر اس قدر معمولی تھی کہ میں محض ایک عادت سے زیادہ اسے کچھ نہیں سمجھتا تھا میری وہی خامی مجھے لے ڈوبی۔

وہ لڑکی جس نے مجھ سے پہلے کسی اور کو چاہا ہو۔ میں اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا تھا لیکن اسے میں اپنے دل سے بھی نکال نہیں سکا تھا۔"

وہ حیرت سے گنگ مجھے دیکھتی رہی۔

"میں سمجھتا تھا پرنما...... کہ تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں تمہیں بھول جاؤں گا لیکن دوبارہ یہاں آ کے میرے لیے تمہیں کھونا کس قدر تکلیف دہ تھا یہ تم نہیں جانتیں اور کوئی معجزہ ہی مجھے تم سے ملا سکتا تھا۔

جس دن میرا تم سے فیضی کے ٹرپ پہ جھگڑا ہوا اور تم مجھے طعنے دینے کھڑی ہو گئیں۔ میرے جیسا خود پسند انسان جو اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ میں تو اپنی ہی نظروں میں گر گیا پرنما...... تم مجھے اپنے آپ سے بہت اوپر بہت سچی کھری اور مخلص نظر آئیں اور اپنا آپ بہت چھوٹا کھوٹا اور کمتر لگا۔ اس دن میں نے جانا کہ محبت چھیننے کا نام نہیں محبت دینے کا...... بانٹنے کا نام ہے۔ محبت احساس کا نام ہے۔ دوسروں کا احساس کرنے کا، کبھی کبھی پوری زندگی ہم اپنے آپ کو جان نہیں پاتے، بدلنا تو دور کی بات ہے۔ اور کبھی ایک لمحہ ہمیں بدل کے رکھ دیتا ہے، ایک لمحہ لگا تھا مجھے بدلنے میں۔

پرنما! میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں جس نے میری رہنمائی فرمائی۔ سب سے پہلے میں نے اپنے رب سے معافی مانگی، اس بات کی کہ میں نے تمہیں صرف ایک شک کی بنا پر، ایک ضد کی بنا پر رد کیا میں اپنے رب سے اپنے ظاہر و باطن کو صاف رکھنے اور یکساں رکھنے کا وعدہ کیا اپنے دل کو نفرت اور حسد جیسی غلاظت سے پاک رکھنے کا عہد کیا۔ اور میں نے وعدہ کیا پرنما۔ کہ میں جو بھی تمہاری خوشیوں کے لیے کر سکا میں کروں گا۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

میرا گلا رندھ گیا۔ "جس دن میں تمہیں ساتھ لے کے ہاسپٹل گیا تھا۔ تو یہ سوچ کے گیا تھا کہ...... علی سے تمہارے لیے بات کروں گا۔"

اس کے آنسو تھم چکے تھے وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میرے آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی۔

"سوچو پرنما! بات تو کچھ بھی نہیں تھی آج سے چار سال پہلے میری تم سے بہت آرام سے شادی ہو سکتی تھی۔ تم تو میرے بالکل سامنے تھیں۔ میری دسترس میں...... لیکن تم مجھے کتنی مشکلوں سے ملیں...... بظاہر تو مجھ میں کوئی فرق نہیں آیا...... کچھ نہیں بدلا۔ لیکن یہ صرف میں اور میرا اللہ جانتا ہے کہ میں کس بھٹی سے گزرا ہوں، وہی میرے اندر کے حال سے واقف ہے، میری سوچ میرے خیالات بدلے، تب اس نے مجھے نوازا اور اس نے مجھے ایسے ہی نوازنا تھا۔ ایسے ہی بدلنا تھا۔ تمہارے قابل بنانا تھا مجھے۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں پرنما کہ اللہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہے کیونکہ میری سوچوں کا صرف وہی گواہ تھا۔ وہ اپنے بندوں پہ بہت مہربان ہے۔ بس ہم اس کا کرم سمجھ نہیں پاتے۔ کیا تم مجھے معاف کر سکو گی؟؟"

"ہاں۔" وہ بغیر توقف کے جیسے خواب میں بولی تھی۔ "جب اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تو میں تو کچھ بھی نہیں۔"

"لیکن مجھے یہ نہیں پتا پرنما! اللہ نے مجھے معاف کر بھی دیا ہے کہ نہیں۔"

میری بات پہ وہ اچانک سے ہنسی اور پھر ہنستی چلی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا وہ ہنس رہی ہے یا رو رہی ہے۔

"پرنما! کیا ہوا؟"

میں پریشان ہو گیا۔

"آج سے چار سال پہلے میں بھی اس کشمکش میں تھی۔

وہ اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "تمہارے چھوڑ جانے کے بعد مجھے لگا۔ اللہ میاں نے مجھے سزا دی ہے اور سزا تو برے لوگوں کو گناہ گاروں کو دی جاتی ہے۔ مجھے اللہ کو راضی کرنا تھا۔ تب میں نے جانا کہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جاتا ہے عالی شان...... یہ بندے کا اللہ سے اظہار محبت ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دوبارہ آنسو امڈ پڑے۔

"اور مجھ سے اظہار محبت نہیں کرو گی پری۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کیا ضروری ہے؟" گلابی آنکھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں بالکل نہیں۔ وہ لڑکی جو میرے چھوڑ جانے کو اللہ کی دی ہوئی سزا سمجھے، مجھے اس سے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔"

میں نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بھیگی انگلیوں والا ہاتھ تھام لیا۔

"لیکن میں خوش ہوں کہ یہ سب ایسے ہی ہوا بظاہر ایک معمولی سی عادت مجھے حاسد بنا رہی تھی جس طرح ایک چھوٹے معمولی سے بیج سے تناور درخت بن جاتا ہے۔"

"کیا ہوا؟" اسے کھل کے مسکراتے دیکھ کے میں نے پوچھا۔

"تم کتنا خوب صورت بولتے ہو عالی......" یہ پہلی تعریف تھی جو اس نے میری کی تھی۔

"اچھا مجھے لگا جیسے میں کوئی لیکچر دے رہا ہوں۔"

اور اس نے زور سے میرے کندھے پر مکا مارا۔

"صرف میں ہی بولے جا رہا ہوں تم بھی تو...... کچھ بولو۔" کندھا سہلاتے میں نے کہا۔

"تمہیں علی پہ کیوں شک ہوا تھا؟" اس نے اپنی انگلی کی پور سے اپنی پرسکون آنکھوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"بس یار کسی سے پتا چلا تھا کہ تمہاری اس سے دوستی ہے اور میں بدگمان ہو گیا۔" پتا نہیں میرے جواب پہ وہ مطمئن ہوئی بھی تھی کہ نہیں۔

"اور مصطفیٰ کی شادی کے بارے میں تمہیں کس نے بتایا تھا؟ علی نے ناں؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں۔" میں نے یقین سے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو؟" برہمی کے اظہار کے طور پر اس نے میرے دونوں ہاتھوں میں دبا اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"نہیں...... بالکل نہیں۔" اس فضول سے راز کو چھپائے رکھنے کا بچگانہ قسم کا وعدہ اگر کیا بھی ہوگا تو صرف علی نے...... اس کی بیوی نے نہیں لیکن یہ ذہن لوگوں کے سوچنے کی بات ہے رٹو طوطے قسم کی لڑکیوں کی اتنی پہنچ کہاں اور میرے جیسے جینئس کے لیے تو یہی سبق کافی تھا کہ بدگمانی کے جال میں اکثر مخلص لوگ ہی پھنستے ہیں۔

"یہ کیا تم تھانیداروں کی طرح تفتیش کرنے لگ گئی ہو۔ پہلے ہی ہمارا کتنا خوب صورت وقت ضائع ہو گیا بلکہ خوامخواہ ہی ٹینشن کی نذر ہو گیا سوچو ان چار سالوں میں ہم کتنا پیار کر سکتے تھے۔"

"شٹ اپ!"

"کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟ اچھا سنو، ذرا ادھر آؤ۔" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔

"ارے یار! وہ بابا اوپر سے دیکھ رہے ہیں، تم ذرا قریب آؤ نا...... وہ خوش ہو جائیں گے۔"

"تم چیپ تو ہو ہی، جھوٹے بھی ہو۔"

"چیپ کی تو خیر ہے، جھوٹا کیوں......؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ گھر کی کسی بھی بالکنی سے اس جگہ پہ نظر نہیں آ سکتا۔"

"اوہ ریئلی۔" خوش دلی سے کہتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "انفارمیشن کا شکریہ۔"

☆

بھولی ہوئی ہوں داستاں

عندلیب شاہانہ

کئی مرتبہ کا ذکر ہے میرے ابا میاں ایک قصہ سنایا کرتے تھے جو آج تک ذہن نشین بلکہ پناہ گزین ہے جو آپ آج بھی سننا پسند کریں گے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس میں ایک عجیب سی اداسی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ میرے ابا میاں، ہندوستانی اداکارہ ثریا کے بڑے عاشق تھے۔ ثریا کے عروج میں اس کی کوئی فلم دیکھنا بھی کبھی نہ بھولتے تھے۔ اس کی تصاویر تک ڈرائنگ روم میں لگا رکھی تھیں۔ میری والدہ سے رشتہ بھی انہوں نے یہی دیکھ کر کیا تھا کہ ان کی شکل وصورت بھی ثریا سے ملتی جلتی تھی میری والدہ کو ابا میاں کے ثریا سے عشق کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ وی سی آر کی بابرکت آمد کے بعد تو امی، ابا مل کر ثریا کی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں بھی کوئی گانا یا سین دیکھ لیتی تھی مگر وہ ابا، امی والی بات نہیں تھی مجھ میں۔

ابا میاں انجینئر تھے۔ دبئی میں انہیں اچھی نوکری ملی تو دبئی چلے گئے۔

دبئی میں ہندوستانی اداکار اور اداکارائیں آتے رہتے تھے مگر نہیں آتی تھی تو ثریا نہیں آتی تھی۔ ابا میاں رائٹرز میں امرتا پریتم کو پسند کرتے تھے جو تقسیم سے پہلے گوجرانوالہ میں رہا کرتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان ایسی گئی کہ پھر واپس پاکستان نہیں آئی۔ ساحر لدھیانوی سے عشق کیا مگر دونوں ایک نہ ہوسکے۔ امرتا پریتم مرتے دم تک اپنے ایک سیئر امروز کے ساتھ بغیر شادی کے رہتی رہی۔

ابا میاں نے بتایا کہ وہ ثریا اور امرتا پریتم سے ملنے کی خواہش لے کر دبئی سے ہندوستان گئے۔ امرتا پریتم سے دلی میں ملے اور ایک رات ان کے گھر میں بھی رہے۔ مگر اصل میں تو وہ ثریا سے ملنے گئے تھے۔ جب بمبئی جاکر انہوں نے ثریا کا نمبر حاصل کرنے کے بعد اس سے ملاقات کا وقت لینا چاہا تو اس نے انہیں ٹالنا شروع کردیا۔ کبھی ثریا فون خود اٹھاتی مگر کہتی کہ وہ ملازمہ ہے مالکہ سورہی ہیں۔ کبھی آج کی ملاقات کل پر ٹال دیتی۔

ابا میاں جس ہوٹل میں مقیم تھے وہاں ناشتے پر ایک مقامی بندے نے انہیں اپنا کارڈ دیا اور کہا۔

"جس دن آپ ثریا سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوجائیں مجھے بتائیں۔ میں آپ کو ایک کام اس وقت بتاؤں گا اور اگر آپ نے میرا کہا ہوا کام کردیا تو میں انعام میں آپ کو ایک بھاری رقم پیش کروں گا۔ اس بندے نے ابا میاں کو زبردستی اپنا

کارڈ دے دیا۔ ابا میاں فنکار دوست، فن کے قدر دان بندے تھے۔ انہوں نے ویسے ہی بے دلی سے کارڈ لے کر اپنے والٹ میں رکھ لیا اور ایک بار پھر ثریا سے ملاقات کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

ابا میاں نے بتایا کہ انٹرویو تو میں نے ثریا کا لینا تھا مگر وہ میرا انٹرویو لینے لگی۔ مجھ سے اپنی پرانی سے پرانی فلم کا نام پوچھا۔ پکچرائز ہونے والے گانوں کے بول سنے۔ ہیروز جن کے ساتھ کام کیا تھا، ان کے نام پوچھے۔ ثریا کے انٹرویو میں ابا میاں پاس ہو گئے تھے۔ ثریا نے انہیں اتوار صبح دس بجے ملاقات کا وقت دے دیا۔ ظاہر ہے ابا میاں کے لیے یہ ان کی زندگی کا یادگار ترین موقع تھا۔ انہوں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا۔ ثریا کے لیے تحائف خریدے اور صبح دس بجے سے بھی کچھ پہلے ثریا کی کوٹھی پہنچ گئے۔

ثریا کی کوٹھی پرانی وضع کی تھی جو ظاہر ہے اپنے عروج کے زمانے میں بڑا نام اور مقام رکھتی ہو گی مگر اب اجڑی اجڑی سی اور بے توجہی کا شکار لگتی تھی۔ ابا میاں کو ان سب باتوں سے کیا غرض تھی۔ وہ تو اپنی محبوب اداکارہ ثریا کو دیکھنے اور ملنے آئے تھے۔

گھریلو ملازمہ نے انہیں ایک پرانی وضع کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جس میں ہر طرف ثریا ہی ثریا تھی۔ ثریا کی جوانی کی تصاویر ہی ڈرائنگ روم کی اصل خوب صورتی تھیں۔

پہلے انہیں چائے اور لوازمات پیش کیے گئے۔ ثریا جو سادہ سی ساڑھی میں ملبوس تھی اور ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے ابا میاں کو چائے بنا کر پیش کر رہی تھی۔ ابا میاں کے لیے یہ ان کی زندگی کا قیمتی ترین لمحہ تھا۔ ابا میاں نے ثریا کو تصویروں کی البم میں سے اپنی اور امی کی تصویر بطور پر خاص دکھائی۔ تصویر دیکھتے ہی ثریا نے چیخ ماری۔ ''اوہ خدا! یہ تو میں ہوں۔ ارے ارے آپ نے یہ کہاں سے تلاش کر لی؟''

ابا میاں بتاتے تھے کہ جب ثریا نے انہیں اس قدر خراج تحسین پیش کیا تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنی والدہ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی، جنہوں نے ان کی ضد پر ثریا جیسی ہی اک ثریا ڈھونڈ لی تھی۔

''بھابھی کو ساتھ لے کر آتے تو ملاقات کا لطف دوبالا ہو جاتا۔'' ثریا نے ابا میاں سے امی کو ساتھ نہ لانے کا گلہ کیا۔ جواب میں ابا میاں نے انہیں ہندوستان براستہ دبئی آنے کا بتایا تو ثریا مطمئن سی ہو گئی۔ ابا میاں نے ثریا کے آگے میری والدہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''ثریا جی! میری بیوی نہ صرف شکل و صورت میں آپ جیسی ہے بلکہ اس نے نکاح نامے پر اپنا اصل نام بدل کر ثریا ہی رکھ لیا اور اسی نام سے اس کا شناختی کارڈ بھی بنا۔ خاوند پر مر مٹنے والی ہو تو ایسی ہو۔'' پھر بات امی سے ہٹ کر اصل ثریا تک گئی اور بہت دیر چلتی رہی۔

ابا میاں بتاتے تھے کہ ثریا اور مجھے باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے ایک ساتھ ہی کھایا۔

ابا میاں نے ثریا کو تحائف پیش کیے۔ جواب میں ثریا نے انہیں اپنی خوب صورت ترین بلیک اینڈ وائٹ تصویر دستخط کر کے دی اور ساتھ ہی چاندی کی ایک یاقوت جڑی انگوٹھی ابا میاں کو یہ کہتے ہوئے دی۔ ''ثریا کی طرف سے ثریا کے لیے۔''

ابا میاں بتاتے تھے کہ ان کا ثریا کے گھر سے نکلنے کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ثریا نے انہیں اپنا پورا گھر بڑے شوق سے دکھایا۔ انہوں نے تصویریں اتاریں۔ گھر میں ثریا اور ملازمہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ یا تو ثریا کی اولاد ہی نہیں تھی یا پھر وہ سب ملک سے باہر کہیں رہتے تھے۔ ابا میاں کو ثریا سے اس کی نجی زندگی کے بارے میں سوال کرنے کی جرات ہی نہ ہوئی۔

ثریا، ابا میاں کو ڈرائنگ روم سے باہر مین گیٹ تک چھوڑنے کے لیے تو نکلی مگر پھر ابا میاں سے کہا:

"افسوس میں آپ جیسے پرستار کو یہیں سے رخصت کرنے پر مجبور ہوں۔ میں بھی کیا کروں۔ صبح ہی سے آکر میری کوٹھی کے باہر میرے سودو سو دیوانے، پروانے بیٹھ جاتے ہیں۔ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے۔ آپ کے ساتھ گیٹ تک جاؤں گی تو بہت سوں کا دل ٹوٹے گا۔ میں اب ایسا نہیں کرسکتی۔ خدا حافظ!"

ثریا، ابا میاں کو الوداع کہہ کر ڈرائنگ روم سے ہوتی ہوئی، اپنی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

ابا میاں بتاتے تھے کہ ثریا کے گھر سے باہر نکلتے وقت میں رو رہا تھا کیونکہ ثریا کی کوٹھی کے باہر کوئی بندہ تو کیا پرندہ بھی نہیں تھا۔

ہوٹل واپس پہنچا تو ناشتے پر کارڈ دینے والے کا خیال آیا۔ اسے فون کیا اور بتایا کہ میری ثریا سے زبردست ملاقات ہوئی ہے۔ ممکن ہے دوبارہ بھی ملاقات ہو۔ اب آپ بتائیں آپ ثریا جی سے کیا چاہتے ہیں؟ اس بندے نے جواباً کہا کہ آپ آج رات ڈنر میرے ساتھ کریں۔ جو بات آپ سے کرنی ہے وہ فون پر نہیں ہوسکتی۔

ڈنر پر ابا میاں اور اجنبی ایک ساتھ تھے۔ اجنبی نے بتایا کہ ثریا جس کوٹھی میں رہتی ہے وہ اصل میں اس کے مرحوم والد کی تھی، جن کا گزشتہ ماہ ہی نومبر 2003 میں انتقال ہوا ہے۔ وہ بھی ثریا کے بڑے پرستار تھے۔ انہوں نے کوٹھی تحفے میں ثریا کو دے دی۔ مگر والد صاحب کے مرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ ثریا سے کوٹھی خالی کروالوں مگر میں ثریا کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔ ثریا کا کوئی بچہ بھی نہیں ہے۔ ایک ملازمہ کے ساتھ اتنی بڑی کوٹھی میں رہتی ہے۔ سائیکو بھی ہوچکی ہے۔ اگر آپ دبئی جانے سے پہلے پہلے یہ نیک کام کر جائیں کہ ثریا کو کوٹھی چھوڑنے پر رضامند کرلیں تو میں انہیں ایک بہت اچھا اپارٹمنٹ بمبئی ہی میں ان کے نام سے لے کر دینے کو تیار ہوں مگر وہ اب اتنی بڑی کوٹھی میں رہنا جسٹی فائی نہیں کرتی۔"

ابا میاں بتاتے تھے کہ انہیں ایک سیٹھ کے کاروباری بیٹے کی یہ باتیں سن کر دکھ تو بہت ہوا مگر انہوں نے خود کو ٹھنڈا ظاہر کیا اور ضبط سے کام لیتے ہوئے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔ "میں آپ کا یہ کام کرواسکتا ہوں۔ ٹوکن کتنا ہوگا اس کام کا؟"

سیٹھ کے بیٹے کی آنکھوں میں میرا جواب سنتے ہی چمک پیدا ہوئی۔ پچاس ہزار تو آپ ابھی لیں اور باقی کا کام ہونے پر آپ کے دبئی اکاؤنٹ میں بجھوادوں گا۔"

سیٹھ کے بیٹے سے پچاس ہزار لے کر ابا میاں نے ثریا سے اگلی ملاقات میں پچاس ہزار ثریا کو گفٹ کردیے اور سیٹھ کے بیٹے سے کہا۔ ثریا نے کوٹھی خالی کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔ وہ اپنی پچھترویں سالگرہ (15 جون 2004) یعنی پلاٹینم جوبلی اسی میرین ڈرائیو والی کوٹھی میں ہی کرنا چاہتی ہیں۔

سیٹھ کے بیٹے نے بخوشی ایسا کرنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ ابا میاں دبئی پہنچے تو سیٹھ کے بیٹے نے انہیں ڈیل (اصل میں ہوائی ڈیل) کروانے پر حسب وعدہ اور بخوشی ان کے اکاؤنٹ میں چار لاکھ پچاس ہزار اور ٹرانسفر کردیے۔

ابا میاں کی ڈیل کی عزت ایسی رکھی کہ ثریا 31 جنوری 2004 کو یعنی اپنی 75ویں سالگرہ سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ابا میاں بڑے کھرے آدمی تھے۔ انہوں نے ثریا کے نام پر ملنے والا پیسہ ثریا ہی کے نام پر خرچ کیا۔ جب تک زندہ رہے ثریا کی سالگرہ اور برسی باقاعدگی سے مناتے رہے۔

عفت سحر طاہر

رنگ دیس تیرے

ہائی وے پر ٹرالر اور کار کا شدید ایکسیڈنٹ ہوتا ہے ٹرالر کا ڈرائیور بھاگ جاتا ہے، کار بری طرح پچک جاتی ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مرد اور اگلی نشست پر ہی بیٹھی عورت خون میں لت پت ہیں۔ ریسکیو عملے کا انتظار ہے کہ وہ آئے تو گاڑی کی باڈی کاٹ کر لاشیں نکالی جائیں اسی وقت گاڑی سے ایک بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔

ہاسپٹل میں چار لوگ آئی سی یو کے باہر بیٹھے ہیں نرس باہر آ کر کہتی ہے آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

سرخ پھولوں سے سجی گاڑی پوش ایریا کے ایک بنگلے کے آگے رکتی ہے تو۔ دولہا کی ماں ملازمہ سے کہتی ہے کہ دلہن کو لے کر اندر آؤ۔ ملازمہ دلہن کو بیڈ روم میں بٹھا کر جانے لگتی ہے تو دلہن اس سے سر درد کی گولی مانگتی ہے۔ ملازمہ کہتی ہے کہ چائے بھی لے آؤں۔

دولہا کمرے میں آتا ہے۔ تو وہ اس کی شکل دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بچی کو لے کر آتا ہے کہ اس کے لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔

نرمین کو ہواؤں میں اڑنے اور اونچے خواب دیکھنے کا شوق ہے حریم اس کی چھوٹی بہن اسے سمجھاتی ہے۔

نرمین کی سہیلی سجل کہتی ہے کہ تمہیں عباد وسیم پوچھ رہا تھا۔

نرمین اپنی دوست صوما کی سالگرہ میں جانے کی ضد کرتی ہے لیکن اس کی اماں کو اعتراض ہوتا ہے کہ جوان جہان لڑکی آدھی رات کو سالگرہ میں سے واپس آئے گی تو محلے والے کیا کہیں گے۔ اس کے اصرار پر ابا سے جانے کی اجازت

دے دیتے ہیں لیکن اس کی اماں ناراض ہی رہتی ہیں۔

زمین صوما کی سالگرہ کی تقریب میں (جو کہ تھیم پر تھی) گھر سے تیار ہو کے نہیں جاتی بلکہ تجل کے گھر سے تیار ہو کر جاتی ہے۔ راستے میں تجل رانا سعید سے عباد وسیم کے متعلق بات کرتی ہے کہ رانا سعید عباد کا دوست ہے وہ عباد سے زمین کی دوستی کرادے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی دوست کو بربادی کے راستے پر مت ڈالو۔ پارٹی میں زمین کی عباد سے ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ یمنی الطاف کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگلی ملاقات میں تجل بتاتی ہے کہ عباد وسیم، رانا سعید سے تمہارا پوچھ رہا تھا۔ زمین بے یقین ہوتی ہے۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھی فیملی ڈاکٹر فریحہ کی ولیمے کی صبح اس کا چیک کرنے آیا تو اس نے کہا کہ شاکڈ اور ڈپرسیڈ ہیں۔ میڈیسن دیں آرام کرائیں شام تک بہتر ہو جائیں گی۔

تجل زمین کو آفس کے بعد لے کر کلب آجاتی ہے زمین کا موڈ آف ہے۔ وہاں ان کی ملاقات عباد وسیم سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان رکھائی سے بات چیت ہوتی ہے۔ عباد وسیم ان کے جوس کا بل ادا کر دیتا ہے۔ زمین کو برا لگتا ہے۔

نصرت زلفی کو کہتی ہیں کہ اٹھ کر دکان پر چلا جا لیکن وہ نہیں سنتا۔ وہ زمین کی ہم راہی کا خواب دیکھتا ہے نصرت کہتی ہیں کہ وہ پڑھی لکھی لڑکی تجھ سے شادی سے انکار کر دے گی۔ زلفی کہتا ہے کہ وہ میرے بچپن کی منگ ہے۔

زمین کے پاس چھٹی والے دن عباد کا فون آتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ دن گزارنا چاہتا ہے۔ زمین، تجل کے گھر کا بہانہ کر کے اس کے بتائے ہوئے ریسٹورنٹ میں اس کا انتظار کرتی ہے۔

عباد وسیم کے ساتھ ایک بھرپور دن گزار کر زمین خوشی خوشی گھر لوٹ آتی ہے۔ زمین کو اس کی کھوجتی چمکتی آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔

زمین کی غیر موجودگی میں اماں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ حریم ابا کے گھر میں نہ ہونے کی وجہ سے زمین کو فون کرتی ہے، فون بند ہونے کی صورت میں وہ تھک ہار کر تجل کے نمبر پہ کال کرتی ہے، اسے مبارک باد دیتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے کہ کس چیز کی مبارک باد اور اپنے گھر میں صبح سے کپڑے دھونے کی مظلومیت کا رونا روتی ہے۔ حریم پریشان ہو جاتی ہے۔ ابا آجاتے ہیں وہ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔

زمین کے آنے پر حریم اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کہاں تھی، زمین سچ اسے بتا دیتی ہے۔

عباد وسیم، رانا سے ملتا ہے تو زمین کی بات ہوتی ہے، رانا کہتا ہے کہ وہ شریف گھرانے کی ہے اس کو بخش دے۔ عباد ہنسنے لگتا ہے۔

مائرہ صبح صبح پھپھو کے گھر پہنچتی ہے جہاں عباد وسیم اور نزہت ناشتہ کر رہے ہیں۔ مائرہ اور نزہت کی معنی خیز باتوں سے انجان بنتا عباد وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

حریم بے ساختہ میرب کو پیار کرتی ہے، وہ گھبرا جاتی ہے۔

پانچویں قسط

رونا مسئلے کا حل ہوتا تو ساری دنیا روتی ہوئی ہی دکھائی دیتی... وہ بھی اپنے ساتھ بہت کچھ غلط ہونے کے دکھ پر ہفتہ بھر سے رو رو کر تھک گئی تو بے حس بن گئی...... اور ایسے میں انسان پر غلط سوچ غالب آنے میں دیر نہیں لگتی۔

"میرے ساتھ غلط ہوا، اب میں کسی کے ساتھ اچھا کیوں کروں اور دوسرے یہ سوچ دماغ میں جڑ پکڑ لیتی ہے کہ ہمارے وجود سے کسی کو کوئی خوشی نہ مل جائے۔"

حریم بھی اسی اسٹیج پر تھی۔ نزہت گھر آئیں تو ان کا موڈ بہت خراب تھا۔ کچھ تو رابعہ بھابی کا برا رویہ ان کے دل میں گڑ گیا، اوپر سے بائرہ کی آزردگی اور پژمردہ چہرہ آنکھوں میں جم سا گیا تھا۔ گھر پہنچیں تو لاؤنج میں کارپٹ پر بیٹھی میرب مسلسل رو رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرتی پہلے تو وہیں صوفے میں دھنس گئیں مگر جب اس کا رونا کانوں میں چبھنے لگا تو انہوں نے زور زور سے ثریا کو آواز لگانا شروع کر دی۔ وہ افتاں و خیزاں بھاگتی چلی آئی۔

''کہاں مری ہوئی ہو...... اور نسرین کہاں ہے؟'' انہوں نے شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ساتھ ہی دوسری ملازمہ کے بارے بھی پوچھا۔

''وہ تو کچن میں ہے شاید...... میں اوپر کپڑے استری کر رہی تھی۔ آپ ہی نے کہا تھا، سب سمیٹ دوں آج۔'' ثریا نے روتی ہوئی میرب کو اٹھا کر صفائی پیش کی۔

''اسے فیڈر کب دیا تھا؟'' وہ مستقل تیوری چڑھائے پوچھ رہی تھیں۔

''آدھا گھنٹہ پہلے کھچڑی کھلائی ہے۔''

''پھر سونے کے لیے رو رہی ہو گی...... اسے سلا دو جا کر اور حریم کو بھیجو میرے پاس۔'' انہوں نے تحکمانہ کہا تو وہ سر ہلاتی پلٹ گئی۔

''الو کی...... یہ یہاں عیش کرنے آئی ہے۔ سوگ ہی ختم نہیں ہو رہا بھورانی کا۔'' ثریا کے جانے کے بعد وہ نخوت سے بڑبڑائیں۔ ذرا دیر بعد گھبرائی ہوئی حریم آ گئی۔

''بیٹھو......'' اسے غلط نگاہ انداز سے دیکھتے ہوئے نزہت نے کہا تو وہ نروس سی سامنے صوفے پر ٹک گئی۔ اتنے دنوں میں نزہت سے باضابطہ طور پر اس کا پہلا سامنا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟''

''جی...... ٹھیک ہوں۔'' وہ نروس سی ہاتھ کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''تم سمجھ دار ہو، اچھی طرح جانتی ہو اپنی یہاں موجودگی کی وجہ...... آئندہ میں میرب کی طرف سے تمہاری کوئی کوتاہی برداشت نہیں کروں گی...... تمہاری وجہ سے ہمارا ہنستا بستا گھر تباہی کے دہانے پر آن کھڑا ہوا ہے۔ پہلے تمہاری بہن اور اب تم آفت بن کر ٹوٹی ہو ہماری فیملی پر...... میری بھانجی کے ساتھ ہونے والی شادی روک کر اس نے تم سے شادی کی ہے تو صرف اس لیے کہ اس کی بیٹی کی اچھی دیکھ بھال ہو سکے اور تم یہاں جیسے پکنک منانے آئی ہوئی ہو...... ثریا اسے لے کر گئی ہے ابھی۔ نا جانے کب سے وہ بچی رو رہی تھی اور تمہیں خبر ہی نہیں۔'' انہوں نے آگے پیچھے کا تمام غصہ نکال کر اچھی طرح اسے جھاڑ دیا اور حریم میں بہرحال اتنی جرات نہ تھی کہ وہ ان کو پلٹ کر کوئی سخت جواب دے سکتی۔

''جاؤ اور اسے اپنے کمرے میں سلاؤ...... یہی تمہاری یہاں حیثیت ہے۔ سمجھیں۔'' وہ تنفر اور حقارت سے کہتی اٹھ کر چلی گئیں جبکہ حریم سن سی وہیں گنگ بیٹھی تھی۔

وہ اپنے دھیان میں اندر داخل ہوا تو حریم کو خلاف معمول لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکا اور وہ اس قدر ساکت اور جامد لگ رہی تھی کہ وہ بے اختیار پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا...... خیریت تو ہے نا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ حریم نے جھرجھری لے کر جیسے کسی خواب سے بیدار ہوتے ہوئے چونک کر اسے دیکھا تو نگاہوں میں اگلے ہی پل وحشت سی اتر آئی۔

''میرد تو ٹھیک ہے نا؟'' وہ اس کی نگاہ کے تاثر سے مضطرب ہوا۔ حریم نے اس کا سوال سنے بنا اپنے گھٹنوں

پرے دھرے اس کے ہاتھوں کو دھکیلا تھا۔
''حریم ...... ہوا کیا ہے ...... بتاؤ تو؟'' وہ اس کے مقابل کھڑا ہو کر دوستانہ انداز اپناتے ہوئے بولا۔
''تمہاری ''کرنی'' کے بعد جو ہونا تھا، اس کی شروعات ہو چکی ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ پھنکاری۔
''ممانے کچھ کہا ہے؟'' وہ بہ سرعت نتیجے پر پہنچا۔ حریم جو اپنے آپ کو بہت مضبوط بنا کر اسے کٹہرے میں کھینچنے والی تھی، نئے سرے سے نزہت کی باتیں یاد کر کے اس کا گلا رندھ گیا اور باوجود ضبط کے آنکھیں ابل پڑیں وہ آنسو چھپانے کی خاطر تیزی سے پلٹ گئی تھی۔
''حریم ......'' وہ بھی اس کے پیچھے بڑھا۔
کمرے میں آ کر وہ بیڈ کے کنارے ٹک کر سر جھکائے خاموشی سے آنسو بہائے گئی، چند لمحوں تک وہ اسے روتے ہوئے دیکھتا رہا۔
''رونا مسئلوں کا حل نہیں ہوا کرتا حریم! بات کرنے سے بات بنتی ہے۔''
''جس کی پوری زندگی برباد ہو چکی ہو، اس کی بات کیا بنے گی۔'' وہ تلخی سے بولی تو آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔
لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے گہری سانس بھری اور کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس رکھی اور اس کے بالمقابل بیٹھ گیا۔
''زندگیاں اس گھر میں بھی ڈسٹربڈ (متاثر) ہیں ...... برباد ہیں حریم! دکھوں کا رولر ہم سب کو بھی ویسے ہی کچلتے ہوئے گزرا ہے جیسے تم اس کی لپیٹ میں آئی ہو۔'' اس نے بہت تحمل سے بات شروع کی تو لب و لہجہ نرم اور متاثر کن تھا جیسا کوئی مرد کسی بہت قابل احترام عورت کے لیے اپناتا ہے۔ مگر وہاں اس کمرے میں اس بستر پر وہ پرانی، نرم دل، دوسروں کے دکھ پر موم بن کر پگھل جانے والی حریم مصطفیٰ ہوتی تو نا ...... وہ حریم تو بابل کی گلیوں میں ہی کہیں بلکتی رہ گئی تھی۔
''زندگی کنارے چلتے شخص کو جان بوجھ کر لپیٹ میں لے کر خود کو بے قصور مت کہو ...... میں بے وقوف نہیں ہوں ...... انگلیوں کی پوروں سے آنسو صاف کرتے وہ بے رخی سے بولی۔
''وہ سیدھی سادی ماں باپ کی عزت کے لیے خود کو قربان کر دینے والی حریم مصطفیٰ آج بھی اپنے میکے کی سیڑھیوں پر دروازہ کھلنے کے انتظار میں بھکارن بن کے بیٹھی ہے ...... یہاں تو تم صرف ایک وجود لے کر آئے ہو جس میں کوئی جذبہ باقی نہیں رہا۔'' اس کا دھاڑیں مار کر رونے کا دل کر رہا تھا مگر اس شخص کے سامنے نہیں، جو کرسی پر آگے کو جھکا کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اسے سن رہا تھا۔
''نصیب سے آپ لڑ نہیں سکتے تو خوامخواہ کی پنگے بازی چھوڑ کر آگے بڑھنا ہی عقل مندی ہوتی ہے۔'' اس کے جذباتی مکالمے کو سننے کے بعد وہ جو کہہ رہا تھا، اسے سن کر حریم کا دماغ گھوم گیا۔
''جان بوجھ کر کسی کا نصیب برباد کرنے والے 'اور پر کاٹ کر اذن آزادی دینے والے واجب القتل ہوا کرتے ہیں۔'' وہ تڑخی۔
''اور ایک پر آسائش زندگی پا کر بھی ماضی کو رونے والے بے وقوف۔'' وہ برجستہ بولا تو حریم نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔
''تمہارا کیا خیال ہے سونے کے پنجرے میں قید ہونے والے پرندے کو قید کا دکھ نہیں ہوتا؟'' وہ لاجواب ہوا تھا۔
''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جو ہونا تھا ہو گیا، گزرے وقت کو نہ تم پیچھے موڑ سکتی ہو نہ میں ...... تو کیوں نہ زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔'' وہ مصالحانہ انداز میں کہتا حریم کو زہر لگا۔

''میرے والدین کو میری زندگی سے کسی حرف غلط کی طرح مٹا کر تم مجھ سے اگر اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی توقع کر رہے ہو تو یہ خواب ہی رہے گا تمہارا۔'' وہ بہت سلگ کر بولی تھی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے اپنی نہیں بلکہ میرب کی زندگی کے لیے تمہاری ضرورت تھی۔''
''مگر میں زمین مصطفیٰ نہیں تھی اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے تھے..... پھر بھی تم مجھے ایک قطعاً غلط طریقے سے اس دلدل میں کھینچ لائے۔'' وہ اختیار کھو کر چلا ہی تو اٹھی تھی۔
''زندگی میری بھی آسان نہیں ہے حریم!''
''مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں...... بلکہ کسی سے بھی نہیں ہے۔'' حریم نے نخوت سے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا تو اس کے لب بھنچ گئے، پیشانی پر گہری شکنیں لیے وہ تند لہجے میں بولا۔
''تو پھر مجھے بھی ذرا فرق نہیں پڑتا تمہارے ان ڈراموں سے......اور یہ تو تم جان ہی چکی ہو کہ میں اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتا ہوں۔'' حریم کا دل تڑپ اٹھا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
''اب یہ فیصلہ تم نے کرنا ہے کہ کیسے زندگی میں آسانی لا سکتی ہو۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔
''آگ لگا دوں گی میں تمہاری زندگی میں سمجھے تم۔'' وہ خود پر سے اختیار کھو کر چیخی مگر وہ ان سنی کرتا باہر نکل گیا، پہلے کون سا اس کی زندگی گل و گلزار تھی جو وہ اس کی لگائی جانے والی آگ کی فکر کرتا۔ اسے ابھی میرب کو دیکھنا تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

یمنیٰ کی اس کی طرف پشت تھی مگر اس کے مڑنے تک عباد اسے دیکھ چکا تھا۔
''ایکسکیوزمی!'' ہاتھ سے یمنیٰ کو پرے ہٹاتے وہ تحیر آمیز ناگواری سے اونچی آواز میں بولا مگر وہ بنا رکے آفس سے باہر نکل گئی۔
''کیا ہوا.....کون تھا؟'' یمنیٰ نے اسے آواز دی مگر وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ باہر لپکا۔ شاپنگ ہال پر طائرانہ نظر دوڑائی تو وہ ایک سائیڈ سے ہو کر ہینگ کیے کپڑوں کی اوٹ میں باہر کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ عباد نے دروازے پر ہی اسے جا لیا۔ پنک ڈریس میں ملبوس دوپٹہ شانوں پر ڈالے سر کونیٹ کے کیپ اور پنک حجاب سے ڈھکے وہ کوئی اجنبی مگر بڑی شناسا سی لڑکی تھی۔
''ایکسکیوزمی!'' عباد اس کے سامنے ڈٹا۔
''راستہ دیں پلیز۔'' وہ سختی سے بولی۔
''آپ میرے آفس میں کس کی اجازت سے داخل ہوئی تھیں محترمہ؟'' وہ دبے مگر سخت لہجے میں بولا۔ عباد کو دیکھ کر باہر بیٹھا گارڈ الرٹ ہوا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے، سب ٹھیک کا اشارہ دے دیا۔
''اس سے پہلے کہ گارڈ اور عملہ یہاں جمع ہو جائے بہتر ہوگا کہ ہم ایک سائیڈ پر ہو کر بات کر لیں۔''
''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ مجھے جو جاننا تھا آپ کے متعلق وہ پتا چل چکا ہے۔'' سینے پر بازو لپیٹے ہوئے تلخی سے کہتی وہ عباد کو حیران کر گئی۔ اگلے پل اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے حریم کو کلائی سے تھام کر زبردستی ایک سائیڈ پر کیا۔ وہ ہوتی کون تھی اس کے آفس میں دندناتے ہوئے داخل ہو کر جاسوسی کرنے والی۔
''میری بات خاموشی سے سنو ورنہ ایک منٹ نہیں لگاؤں گا چوری کا الزام لگا کر پولیس کے حوالے کرتے۔'' حریم کے چیخنے چلانے کے ارادے کو بھانپ کر وہ درشت اور کرخت لہجے میں کہتا حریم کے حواس کھٹرا گیا۔
''میں نے کچھ چوری نہیں کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔'' وہ حواس باختہ ہوئی۔
''یہ تو بس تم اور میں جانتے ہیں نا...... میرے ایمپلائز (ملازمین) تو پولیس کو وہی بتائیں گے جو میں کہوں گا۔'' وہ اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔

''مم...... میں...... غلطی سے آفس میں داخل ہوگئی تھی۔'' اس نے جھوٹ بول کر اپنی غلطی کو سدھارنا چاہا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس کی پیشانی پہ چمکتے قطروں کو دیکھتا وہ تیکھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''میں آپ کو نام بتانے کی پابند نہیں...... مجھے جانے دیں۔ میں نے محض غلطی سے آپ کے آفس کا دروازہ کھول دیا تھا اور دوسری بات یہ کہ آپ کے کسی بھی سی سی ٹی وی کیمرے میں میری چوری کا ثبوت موجود نہیں ہوگا۔ پولیس اندھی نہیں ہوتی۔'' آہستہ آہستہ اس کے حواس کام کر رہے تھے۔ تھوڑی بہادری دکھائی۔

''پولیس پیسے سے دیکھتی اور پیسے سے سنتی ہے محترمہ! اور اگر تم نے اب بھی مجھے فرفر ساری بات بتانے کے بجائے پردے ڈالنے کی کوشش کی تو میں فوراً گارڈ کو اشارہ کردوں گا۔'' عباد کا لب و لہجہ اس قدر اٹل تھا کہ حریم زرد پڑ گئی۔ جو ہمت جمع کر کے وہ یہاں تک آئی تھی وہ یکلخت ختم ہو چکی تھی۔

''میں...... حریم ہوں...... نرمین مصطفیٰ کی بہن۔'' اس نے مجرمانہ انداز میں گویا دھماکا ہی کر دیا تھا۔ عباد نے بے اختیار سر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے گہری سانس لی اور ادھر ادھر دیکھا تو لمحہ بھر کو ٹھٹکا یمنیٰ اسی طرف آ رہی تھی۔ اس نے حریم کو کلائی سے پکڑ کر ترتیب سے ہینگرز پہ لٹکے کپڑوں کی اوٹ میں دھکیلا۔

''ادھر ہی کھڑی رہو دو منٹ...... ابھی بات کرتا ہوں تم سے۔'' تیزی سے سخت لہجے میں کہہ کر وہ داخلی دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یمنیٰ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ سیدھی اسی کی طرف آئی۔

''کیا ہوا...... کون تھی وہ عورت؟'' یمنیٰ نے تشویش سے پوچھا تو وہ جان بوجھ کر کچھ ہی فاصلے پر چھپی کھڑی حریم کو سنانے کی غرض سے قدرے اونچی آواز میں بولا۔

''شاید چور ہی تھی کوئی...... میرے آنے تک بھاگ گئی۔ ڈونٹ وری۔ سی سی ٹی وی کیمرہ میں اس کی تصویر آ گئی ہوگی۔ دیکھتے ہیں اگر چوری ہوئی تو رابطہ کرتا ہوں میں پولیس سے۔''

''ہاں بالکل...... اور آئندہ کے لیے اپنے آفس کے باہر بھی ایک پیون بٹھاؤ۔ حالات اچھے نہیں ہیں آج کل۔'' یمنیٰ تشویش سے اسے ہدایت دیتی ایک دو باتوں کے بعد رخصت ہوئی تو وہ چند لمحے اسے گلاس ڈور سے نکل کر پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جاتے دیکھتا رہا اور پھر پلٹ کر حریم کی طرف آیا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے، آفس میں چلو۔'' اس کی بات سن کر حریم کی رنگت اڑ گئی۔

''مگر مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ ہٹیے سامنے سے.. مجھے جانا ہے۔''

''بات تو تمہیں سننی ہی ہوگی حریم مصطفیٰ! عباد وسیم کی کچھار میں کوئی آتا اپنی مرضی سے ہے مگر جاتا اس کی مرضی سے ہے۔'' کھردرے لہجے میں چبا چبا کر کہی اس کی بات پر حریم جیسی گھریلو لڑکی کے تو رونگٹے کھڑے ہونے ہی تھے۔

''زیادہ سوچو مت ورنہ نرمین کا خیال کیے بنا پولیس بلوا لوں گا...... لیٹس گو۔'' سرد مہری سے کہتا وہ جیسے اسے گن پوائنٹ پر دوبارہ اپنے آفس لایا تھا۔

''بیٹھو۔'' اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود ٹیبل کے پار اپنی کرسی میں دھنس گیا تو حریم مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق کرسی پر ٹک سی گئی۔

''اب بتاؤ...... نرمین نے بھیجا ہے تمہیں میری جاسوسی کے لیے؟'' اس کے سوال نے حریم کے گویا حواس پگھلا دیے۔

''نہیں......'' اس نے آگے جھک کر بے اختیار دونوں ہاتھ میز کی سطح پر ٹکائے۔ ''اسے تو پتا بھی نہیں کہ میں یہاں آئی ہوں۔'' اس کے جواب نے عباد کو حیرت میں مبتلا کیا۔

''تو پھر اس سارے ڈرامے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں میں؟'' وہ گہری نظروں سے حریم کا جائزہ لے رہا

تھا۔حجاب کے ہالے میں چہرے پر پسینے کی بوندیں دمک رہی تھیں۔زمین اگر شعلہ تھی تو وہ شبنم مگراس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بے پناہ حسن تھا اس خاندان میں۔وہ متاثر ہوا حریم اس کی نگاہ کے جمود پر کسمسائی اس کی بے داغ پیشانی پر شکن ہوئی تھی عباد کا یوں بے باکی سے دیکھنا اسے سخت ناگوار گزرا تھا۔

''زمین اپنے کزن کے ساتھ انگیجڈ ہے. آپ اس کا پیچھا چھوڑ دیں۔'' بگڑے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکالتے ہوئے ہنس دیا۔

''وہ انگیجڈ ہے تو اسے کیوں نہیں سمجھاتیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دے؟'' وہ عام سے انداز میں کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔حریم کا دماغ سن ہوا۔امید نہیں تھی آگے سے یہ سوال بھی سننے کو مل سکتا ہے۔

''آپ کا کیا خیال ہے، اسے نہیں سمجھایا ہوگا میں نے ......اور اب تو اور بھی اچھی طرح سمجھاؤں گی۔'' اس کا چہرہ لال گلابی ہوا وہ یقیناً ممنیٰ الطاف والے سین کی بات کر رہی تھی۔عباد نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر جھولتے ہوئے دلچسپی سے اس اکیس بائیس سالہ لڑکی کو دیکھا۔ذرا دیر پہلے والا ڈر اس کے چہرے سے اب غائب تھا۔

''امید ہے، تم اپنی اس بار کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ گی۔'' وہ ہمدردانہ انداز میں بولا جو سراسر حریم کو مذاق اڑانے والا لگا۔

''ہمارا گھر خراب ہو رہا ہے عباد صاحب! آپ اس کی حوصلہ شکنی کریں گے تو وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔'' حریم مجبور تھی یہ ''منت'' کرنے پر۔زمین جیسی بیٹیاں جنہیں خود والدین کی عزت کا احساس نہ ہو ان پر ایسی منتیں ترلے کچھ اثر نہیں کرتے ......شاید یہ عباد وسیم ہی انسان کا بچہ نکل آئے۔

''وہ سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا آگے میز پر جھکا۔

''میں تمہیں شکل سے بے وقوف لگتا ہوں؟ وہ میری دوست ہے، میں اسے کیسے ڈس ہارٹ کر سکتا ہوں۔''

''اگر آپ کو ہماری عزت کا احساس ہے تو......'' وہ اس کے نرم لہجے سے ہمت پا کر کہنے لگی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹ گیا۔

''میرے خیال میں اس عزت کا احساس تمہاری بہن کو ہونا چاہیے، میں تم لوگوں کا کیا لگتا ہوں جو یہ احساس کرتا پھروں؟'' اف......نرم لہجوں میں بھی اتنی کاٹ ہوا کرتی ہے، حریم کا حلق خشک ہوا۔

''اگر آپ اس کو بڑھاوا نہ دیں تو وہ پلٹ جائے گی۔'' ایک اور کوشش کی۔

''اپنے باپ سے کہو، اس کی ٹانگیں توڑ کر اسے گھر بٹھائیں ...... میں تو اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سمپل۔'' وہ دھواں اڑاتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔حریم کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں......اور اس کمینے پر زمین مر رہی تھی جسے بات تک کرنے کی تمیز نہیں تھی۔وہ ذلت کے احساس سے سرخ پڑتا چہرہ لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب یہ تو آپ کو وقت ہی بتائے گا کہ کون کیا کر سکتا ہے۔'' شعلہ بار لہجے میں کہتی وہ تن فن کرتی آفس سے نکل گئی تھی۔عباد کے چہرے پر محظوظ مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس کا ذہن کہیں اور ہی اڑان بھر رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا تمہیں کسی نے اتنے مینرز نہیں سکھائے کہ کسی کی باتوں کے درمیان ایسے نہیں کودتے۔'' کیتھی مارک کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اونہوں......'' ڈینئیل نے اسے خفیف سا ٹوکا پھر نرمی سے مارک سے پوچھنے لگا۔

''ایسی کیا خاص بات ہوگئی ہے مارک؟''
''اپنی بہن سے پوچھو جو میری منگیتر ہونے کے باوجود مجھے بات تک کرنے کا حق دینے کو گناہ سمجھتی ہے۔'' مارک تلخی سے بولا۔
''یہ تو بچی ہے، برداشت کم ہے اس میں اور ویسے بھی اس رشتے میں مردوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ عورتوں کی باتیں سمجھیں اور سنیں۔'' ڈینئل نے نیم مزاحیہ انداز اپنا کر ماحول کے تناؤ کو دور کرنا چاہا۔
''اسے سمجھا دو ڈینی! یہ میرے دوستوں پر اعتراض کا حق نہیں رکھتا...... چاہے وہ کسی بھی مذہب سے ہوں۔'' مارک کو غصے سے دیکھتے ہوئے وہ سینے پر بازو لپیٹے ناراضی سے بولی۔ ڈینئل نے استفہامیہ نظروں سے مارک کو دیکھا تو وہ گڑبڑایا۔
''مجھے کسی پر کوئی اعتراض نہیں مگر مسلمانوں کے بارے میں تم بھی جانتے ہو۔ کس قدر شدت پسند ہیں اپنے مذہب اور قومیت میں۔'' اس کی بات سن کر ڈینئل پورے کا پورا کیتھی کی طرف گھوم گیا۔
''تم نے پھر سے کوئی مسلم دوست بنایا ہے؟''
''وہ رچی اور فرینک کا پہلے سے دوست تھا۔ میری بات چیت بعد میں ہوئی اس سے۔''
''تم حالات جانتی ہو کیتھ! بی کیئرفل۔'' رچی اور فرینک ان کے کزن تھے، ان کا حوالہ سن کر ڈینی تھوڑا مطمئن ہوا۔
''اوکے.....'' کیتھی نے چڑانے والی تفاخرانہ نظروں سے مارک کو دیکھا اگر ڈینی سامنے نہ ہوتا تو وہ مارک کو زبان دکھانے سے بھی گریز نہ کرتی۔
''مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ تم مارک کے ساتھ باقی کا ٹہل لو، کافی فارغ ہو کر آیا ہے شاید اس کے پاس کوئی مزید نئی تازی خبریں ہوں تمہیں دینے کے لیے۔'' ہلکے پھلکے طنز سے کہتی وہ اپنی بلڈنگ کی طرف بڑھ گئی۔ مارک نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھا پھر شکایتی انداز میں بولا۔
''تم اس کے انداز دیکھ رہے ہو نا۔ اپنے منگیتر پر دوستوں کو ترجیح دینا کہاں کا انصاف ہے؟''
''وہ بچکانہ سوچ رکھتی ہے۔ تم اس پر خوامخواہ کی پابندیاں مت لگایا کرو وہ ضد میں آ کر وہی کرے گی جس سے تم چڑتے ہو۔''
''اس کے دوستوں میں یہ تیسرا مسلم ہے۔'' مارک نے جتانے والے انداز میں کہا۔
''وہ میں دیکھ لوں گا۔ تم نے بتا دیا تمہارا شکریہ۔'' ڈینئل نے نرمی سے بات ختم کر دی۔ مارک اس کے باپ کا پسندیدہ بھتیجا تھا اور پال ہی کی ضد کی وجہ سے کیتھی کا منگیتر بھی بنا تو وہ سب اسے حسب توفیق اہمیت دیتے تھے۔
''اوکے..... لیٹ اٹ گو (اسے جانے دو) مگر اسے اپنے لفظوں میں سمجھا دو میں اس کے دوستوں۔ وہ رکھائی سے کہتا چلا گیا تھا۔ ڈینئل اس کی شدت پسندی محسوس کرتا کچھ سوچتے ہوئے اپنی بلڈنگ کی طرف بڑھا۔
''وہ صرف اچھا دوست ہے میرا ڈینی! مارک کو تو بکواس کی عادت ہے اور جاسوسی کی بھی۔''
ڈینئل کے پوچھنے پر کیتھی چڑ گئی تھی۔
''چلو خیر..... اسے تو سمجھا ہی دیا ہے میں نے. تم بھی احتیاط کرنا اپنے لیے۔'' اس کی ضدی طبیعت کے پیش نظر ڈینئل نے مسکرا کر بات ختم کر دی۔
مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اکثر ہم جہاں اپنی طرف سے بات ختم کرتے ہیں وہیں سے کوئی نئی بات شروع ہو رہی ہوتی ہے.....

☆☆☆

''کیا کہا...... تم عباد سے ملنے گئی تھیں؟'' زمین بے اختیار اونچی آواز میں بولی تو حریم نے حواس باختہ ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا اور کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔

''آہستہ بات کرو۔''

زمین نے ہونٹوں پر سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے تیز نظروں سے حریم کو گھورا۔

''تم کس سے پوچھ کر وہاں گئی تھیں؟''

''مجھے اس شخص سے بات کرنی تھی جو ہمارے گھر میں قیامت برپا کرنے والا ہے۔''

''کیا بکواس کر کے آئی ہو تم عباد سے۔'' وہ متوحش سی ہو کر غرائی۔

''میں اسے صرف حقیقت بتا کر اور حقیقت دیکھ کر آ رہی ہوں...... اپنے آفس میں ایک بے ہودہ سی لڑکی کے ساتھ نازیبا حرکات کر رہا تھا وہ۔'' حریم نے تلخی سے کہا تو زمین نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''اچھا...... اور تم اتنے آرام سے اس کے آفس میں گھس گئیں؟''

''وہ ٹھیک انسان نہیں ہے زمین! وہ لڑکی بے شرمی سے اس سے مل رہی تھی۔'' حریم بدقت بولی۔

''تو کیا...... ہمارے جیسی کنزرویٹو سوچ نہیں ہے ان کی۔ اس کے سرکل میں سب لڑکیاں فرینک ہو کر ملتی ہیں لڑکوں سے بھی۔'' زمین کو تو گویا کوئی فرق ہی نہ پڑتا تھا مگر اس کی بات سن کر حریم کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔

''اور تم......؟''

''شٹ اپ...... میں نے اس کے سرکل کی بات کی ہے۔'' زمین جھلائی۔

''تم بھی تو اسی سرکل میں شامل ہوا ب۔'' حریم نے ترشی سے کہہ کر اس کا چہرہ ٹٹولا تو وہ سلگ اٹھی۔

''تم زیادہ میری اماں بننے کی کوشش مت کرو۔ سمجھیں؟ تھپڑ مارنے کو دل چاہ رہا ہے میرا۔ آج جو گھٹیا حرکت کر کے آئی ہو تم ابھی اماں یا ابا میں سے کسی کو بتایا نا کہ کسی لڑکے سے مل کر آ رہی ہو تو ابھی کے ابھی مار ڈالیں گے۔''

''اور تم...... تم بہت اعلا حرکتیں کرتی ہو۔ میرے بارے میں بتاؤ گی تو اس لڑکے کے ساتھ اپنا رشتہ بتانا مت بھولنا۔ شاید اماں ابا کو صحیح بندے کو مارنے میں آسانی رہے۔'' حریم نے بہت ضبط کا مظاہرہ کیا مگر پھر بھی زمین کے اس قدر گھٹیا پن اور بے اعتنائی پر اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔

''شٹ اپ...... بہت کمینی حرکت کی ہے تم نے آج۔'' زمین کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اسے پیٹ ہی ڈالے۔

''کیونکہ میں تم سے اور اپنے گھر والوں سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ ضبط سے بولی۔

''آخ تھو...... یہ محبت ہے؟'' وہ ایک طرف تھوک کر غرائی۔ ''میرے پیروں تلے سے زمین کھینچنے کو تم محبت کہتی ہو؟''

''وہ بگڑا ہوا امیرزادہ ہے۔ مجھے تو اس کی نظر بھی ٹھیک نہیں لگی۔'' حریم نے صاف گوئی سے کہا پھر اس کے بگڑتے نقوش دیکھ کر اضافہ کیا۔

''وہ کہہ رہا تھا اپنی بہن سے کیوں نہیں کہتیں کہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔'' زمین کا رنگ بدلا۔ اگلے ہی پل وہ گویا اس پر جھپٹ پڑی۔

''کیا بکواس کر کے آئی ہو تم اس کے ساتھ؟'' حریم کو سنبھل کر تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بھی شانے پر اس

کا جھانپڑ پڑ ہی گیا تھا۔
''اپنے گھر کی عزت کا واسطہ دے کر آئی ہوں اور کیا کر سکتی تھی۔ تمہیں تو احساس نہیں۔ سوچا شاید اسی کو خیال آجائے...... مگر وہ تو تم سے بھی بڑھ کر ہے۔'' وہ تلخ ہوگی۔ چھوٹے سے گھر میں آواز اور بات پھیلنے کا ڈر نہ ہوتا تو آج نرمین کو چیخنے اور حریم کو پیٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔
''تمہیں تو بڑی شرم آگئی اس سے ملتے ہوئے اکیلے میں۔'' وہ آگ پھونکنے لگی۔
''تم بھی تو یہی کرتی ہو...... اس کا کیا؟'' حریم نے اسے گویا آئینہ دکھایا۔
''جو خود بند کمروں میں اکیلی لڑکیوں سے ملتا ہے، اس کی اخلاقیات کے بارے میں اندازہ لگالو مینو! ایسے مرد کے ساتھ کوئی عزت دار لڑکی گزارہ نہیں کرسکتی...... ہم لوئر مڈل کلاس لڑکیاں تو بالکل بھی نہیں۔''
''بکواس بند کرو...... مجھے تو ٹینشن ہو رہی ہے کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ کیسی گھٹیا سوچ ہے میرے گھر والوں کی۔'' نرمین کی بات سن کر حریم کا دماغ گھوم گیا۔
''یعنی وہ ایک لڑکی کو بغل میں لیے اپنے آفس میں گھسا ہوا تھا۔ اس سے تمہیں اس شخص کا گھٹیا پن دکھائی نہیں دے رہا لیکن میرے صرف اس سے جا کر بات کرنے پر میں گھٹیا ہوگئی...... واہ۔'' اس نے تالی بجائی۔
''تم ان کا اسٹیٹس نہیں جانتیں...... اس لیے بات مت کرو اور اب اپنی بکواس بھی بند رکھو...... میرے اللہ...... کیا سوچ رہا ہوگا وہ کیسی فیملی سے تعلق ہے میرا۔'' نرمین روہانسی ہونے لگی، حریم اس کی بات سن کر سرتاپا جل اٹھی۔
''اللہ کا شکر ہے...... روپے پیسے کی کمی سہی مگر ان سے اچھی ہی ہے ہماری فیملی......''
''تم تو بکواس بند ہی رکھو اپنی...... جو چاند چڑھانا تھا، چڑھا آئی ہو۔''
وہ حریم کو جھڑک کر اپنا موبائل اٹھائی کمرے سے نکل گئی۔ اب یقیناً چھت پر جا کر عباد کو کال کر کے صفائیاں پیش کرنے والی تھی۔ حریم اپنی اتنی مشقت کنویں میں جاتا دیکھ کر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اسے حقیقت میں رونا آرہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے میری دادی نے پالا تھا...... مما کے پاس تو میں تب آیا جب دادی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ دراصل میری پیدائش کے وقت مما شدید بیمار ہوگئیں تو میں دادی کی گود میں چلا گیا۔ اس کے بعد مما کو ٹھیک ہونے میں کچھ ماہ لگ گئے تب تک میں دادی کی گود اور لمس کا عادی ہوگیا تھا کیونکہ وہ ہمارے گھر ہی میں تھیں تو اگلے دس سال میں دادی کے پاس زیادہ رہا۔
وہ برف پر اسکیٹنگ کرتے بچوں اور نوجوانوں کو دیکھتے ہوئے کیتھی کو بتا رہا تھا...... آج بہت دنوں بعد دھوپ نکلی تھی تو لوگ جوق در جوق موسم کا لطف اٹھانے چلے آئے۔ کیتھی نے اس کی ڈسپوزیبل کپ میں لائی ہاٹ چاکلیٹ کا گھونٹ بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور شرارت سے بولی۔
''تمہاری حرکتوں سے پتا چلتا ہے کہ تمہیں کسی دادی نے ہی پالا ہے۔'' اس کی طنزیہ بات سن کر وہ محض مسکرا دیا۔
''مارک نے ڈینی سے تمہاری اور میری شکایت کردی ہے۔'' کیتھی کو یاد آیا۔
''کیوں...... ہم نے ایسا کیا کردیا ہے؟'' وہ چونکا۔
''تم ایک مسلمان اور میں ایک کٹر یہودی فیملی سے ہوں۔'' کیتھی نے اسے یاد دلایا۔
''ہونہہ......'' وہ سر جھٹک کر گرما گرم کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ دھوپ کے باوجود ہوا بے حد سرد تھی۔

''سچ کہہ رہی ہوں...... لیکن میں نے خوب سنائی ہیں اسے...... چھوٹے ذہن کا بندہ ہے وہ۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے اسے مسلمانوں سے۔''

''اسے سمجھاؤ۔ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا...... دوستی انسان کسی کا اخلاق دیکھ کر کرتا ہے۔ کسی کا مذہب دیکھ کر نہیں۔'' وہ سنجیدہ تھا۔ وہ کیتھی کو یہ حقیقت بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی یہودیوں کو پسند نہیں کرتا۔

''واقعی...... سب سے پہلے تو اخلاق دکھائی دیتا ہے۔ ایک دوسرے کے بارے میں باقی باتیں تو بعد میں پتا چلتی ہیں لیکن تب آپ کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کی دوستی گہری ہو چکی ہوتی ہے۔'' وہ خالی کپ کو توڑ موڑ کر پاس رکھے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے مسکرائی۔ وہ سنہرے بالوں اور سبز آنکھوں والی ایک پیاری سی لڑکی تھی جس کا دل اس کی صورت سے زیادہ پیارا تھا۔

''زیڈ......'' کیتھی نے شرارت سے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی تو وہ خیالوں سے چونک کر مسکرا دیا۔

''نام بگاڑ دیا میرا تم نے......''

''تم بھی مجھے ''کے'' کہہ سکتے ہو۔ ایک تو تم پاکستانیوں کے نام اتنے مشکل ہوتے ہیں، آدھی کلاس زیڈ کہتی ہے تمہیں۔''

''ہاں...... تمہاری مہربانی۔'' وہ مسکراتے ہوئے کیتھی کو بہت پیارا لگتا تھا۔

''جب تم مسکراتے ہو، تب مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو۔'' کیتھی نے اسے اطلاع دی۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اچھا...... اور کیا پسند ہے تمہیں؟''

''تمہارے سامنے کے دکھائی دینے والے دانت بڑے اچھے لگتے ہیں۔'' وہ ہوا سے اڑتے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے گویا آج اعتراف کر رہی تھی، زیڈ کو ہنسی آ گئی۔

''کیا فضول ترین رومینٹک بات کی ہے تم نے۔'' اس کی بات سن کر کیتھی بھی ہنسنے لگی۔

''تمہیں تو ویسے ہی رومانس فضول چیز ہی لگتا ہے۔''

''میں نے کچھ حدود بنائی ہوئی ہیں اپنی اور بس۔'' اس نے شانے جھٹکے۔

''اور تمہاری یہی خاصیت مجھے تمہارے قریب لے آئی۔ تم عورت کی عزت کرتے ہو۔'' کیتھی مسکرائی۔

''میرا مذہب کہتا ہے کہ میں تمام عورتوں کی عزت کروں۔''

وہ سنجیدہ تھا...... اور اپنی فیملی سے بہت الگ...... کیونکہ اس کی تربیت کی بنیاد اس کی دادی نے رکھی تھی جو علی الصبح تلاوت کلام پاک کی عادی تھیں۔ اسے ہر لقمے پر بسم اللہ پڑھ کر کھلاتی تھیں اور یہ عادت اسے آج تک تھی۔

''ہمم...... میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ تمہارا مذہب اور کیا کیا کہتا ہے۔ مصر کی عائشہ تہامی نے مجھے بہت سی چیزیں بتائی ہیں...... میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم لوگوں کی الہامی کتاب میں کیا ہے جو سب غیر مذاہب کے لوگوں کو چبھتا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ویری نائس...... میں تمہیں کچھ بکس گفٹ کروں گا۔'' وہ خوش ہوا۔

''میرے پاس آل ریڈی ایک بہت اچھی بک موجود ہے۔'' کیتھی جیکٹ کی ٹوپی سر پر اوڑھتے اس کے ساتھ کیفے کی طرف چلنے لگی۔

''ہمم...... یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تم میرے بارے میں سب اچھی طرح جان لو۔'' وہ اسے چھیڑ رہا

تھا۔
''بے فکر رہو۔ اس کتاب میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہوگا۔'' کیتھی نے برجستہ کہا تو زیڈ کا قہقہہ بلند ہوا۔
مگر اب جبکہ وہ عائشہ تہامی کے بتائے ہوئے طریقے سے ہاتھ منہ دھو کر اس کتاب کو کھولے بیٹھی تھی تو وہ دنگ تھی۔
اس کتاب میں تو سب کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اس کی...... زیڈ کی بلکہ پورے عالم کی... پوری کائنات کی...... آسمانوں کی اونچائی پہ اڑتے پرندے سے لے کر سمندر کی گہرائی میں تیرتی ننھی سی مچھلی تک کی۔ ایک ساتھ تھپیڑے کھاتی سرکش موجوں والے مگر کبھی نہ ملنے والے دو الگ رنگوں کے سمندروں کی باتیں......
وہ کتاب حق تھی...... چودہ سو سال پہلے نازل ہو جانے والی کتاب حق...... جب کوئی سائنس دان نہ تھے کائنات کے راز جاننے کے لیے...... تو وہ سارے راز اور ان کی اصلیت اس کتاب میں اتارنے والا کیسے جان گیا؟
کیا یہی اصل میں وہ کتاب تھی جسے تمام بنی نوع انسان کے لیے اتارا گیا تھا...... کیتھی دنگ تھی...... دو گھنٹے میں اس نے جتنا ترجمہ پڑھا، وہ اسی کو پڑھ کر سمجھ کر دنگ تھی۔
بھلا چودہ سو سال پہلے لکھی جانے والی کتاب آج کل کے دور سے کیسے میل کھا سکتی ہے؟
اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے قرآن پاک کے ترجمہ کو بند کر کے دراز کے خفیہ خانے میں لاک کر دیا۔ واقعی کچھ عجب نہ تھا اگر یہ کتاب حق کسی پہاڑ پر نازل ہوتی تو وہ اس کی ہیبت سے ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ کیتھی نے لیٹ کر سر تک چادر اوڑھ لی۔ اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

نصرت پھپھو کا شام کے وقت اچانک اپنی شادی شدہ بیٹی فاخرہ اور مٹھائی کے ٹوکرے کے ساتھ آنا جہاں اماں اور ابا کے دل کو سکون دے گیا۔ وہیں رات کی روٹیوں کے لیے آٹا گوندھتی حریم کا دل گویا اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ آٹا پیالے میں رکھتی جلدی سے خالی پرات اور ہاتھ سنک میں دھو کر باہر نکلی تو پھپھو کی پاٹ دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔
''بھئی امانت تو امانت ہی ہے جب مرضی آ کر لے جاؤ...... بس یہی سوچ کر آ گئی میں۔ زلفی کے ابا تو یونہی پریشان ہو رہے تھے۔ میں نے کہا میاں تم گھر پہ رہو۔ آ کر منہ ہی میٹھا کراؤں گی تمہارا۔'' پھپھو نے بات کے آخر میں قہقہہ لگایا تھا۔ حریم سلام کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو ماحول بہت خوش گوار تھا ابا آج دفتر سے جلدی آ گئے تھے۔ حریم نے دیوار پہ لگے کلاک پہ وقت دیکھا زمین۔ بس کسی بھی وقت گھر میں داخل ہونے والی تھی۔
''اس وقت تک تو آ جاتی ہے گھر آج اس کے آفس کی میٹنگ تھی کوئی۔'' اماں پھپھو کو بتا رہی تھیں۔
''دھن کمانا آج کل آسان تھوڑی ہے مامی! مرد ہو چاہے عورت جان مارنی پڑتی ہے چار پیسے کمانے کے لیے۔'' فاخرہ نے بظاہر بڑی ہمدردی سے کہا۔ اندر سے دونوں ماں بیٹی خوش تھیں نکھٹو زلفی کے لیے زمین جیسی طرح دار لڑکی پا کر۔ حریم کلستی ہوئی ایک طرف بیٹھ گئی۔ اسے اندر ہی اندر ابا سے بھی شکوہ تھا...... کیا تھا جو لکیر کے فقیر بنے رہنے کے بجائے اپنی بیٹی سے بھی اس کی شادی کے بارے میں رضامندی لے لیتے...... بیٹیوں کو اتنا پڑھا لکھا کر بھی ان کے ہاتھ پیر زبان باندھے رکھنی ہے تو پڑھا کر ذہن جگانے کا کیا مطلب ہے؟ جب ہاتھ

پاؤں باندھ کر کنویں میں ہی ڈالنا ہے تو زندگی سے لڑنے کے گر سکھانا بے فائدہ ہوتا ہے۔
"بھئی مجھے تو جلد از جلد اپنی بہو گھر میں چاہیے۔ فاخرہ کی شادی کے بعد تو میرا گھر مانو سونا پڑا ہوا ہے۔" نصرت لگاوٹ سے کہہ رہی تھیں۔
"میری ساس تو میرے پیچھے لگی ہوئی ہیں زلفی اور میری تیسرے نمبر کی نند کے رشتے کے لیے۔ مگر میں نے صاف کہہ دیا ہمارے ہاں جان سے جاتے ہیں زبان سے نہیں...... بچپن کی منگ ہے نرمین میرے بھائی کی۔ اپنا منہ لے کر رہ گئیں۔" فاخرہ نے ٹھٹھا لگایا۔
"ہاں تو آج کل اچھے رشتے کون چھوڑتا ہے بھلا۔ مجھ سے بھی دبے لفظوں میں ایک آدھ بار کہہ چکی ہیں بڑی بی...... مگر میں نے ان سنی کر دی میرے گھر میں تو چانن ہی مینو کے دم سے ہو گا بھائی صاب!"
"کیوں نہیں...... تمہاری ہی امانت ہے جب جی چاہے لے جاؤ۔" ابا مسکرا دیے۔
"بس تو پھر باقاعدہ منگنی کو چھوڑیں اور سیدھے شادی کی تاریخ دیں مجھے بھائی صاب! چاہے مہینے بعد کی چاہے تین مہینے بعد۔" نصرت تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا سوچ کر ہی آئی تھیں شاید۔
"ہاں بالکل...... تیاری بھی تو ڈھیر کرنی ہوگی مینو نے شادی کی۔" فاخرہ نے لقمہ دیا۔
"دو تین ماہ تو ڈالنے ہی پڑیں گے تیاری کے لیے۔" اماں نے تائید طلب نظروں سے ابا کو دیکھا تو انہوں نے سر ہلا دیا۔
حریم کو نصرت کی چالاکی پر غصہ آیا۔ خود تو وہ نرمین کے لیے ایک چھلا تک نہ لائی تھیں اور انہیں اشاروں میں جہیز کی تیاریوں کے پیغام دیے جا رہے تھے۔
ذرا دیر بعد نرمین بھی آ گئی۔ وہ سب اماں کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ نرمین سیدھی اپنے کمرے میں گئی۔ حریم اسے بلا کر لانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آئی۔ اس روز کی لڑائی کے بعد ان دونوں کی بات چیت بند تھی۔
"پھپھو آئی ہیں اور ساتھ فاخرہ بھی۔"
"تو...... میں کیا کروں؟" وہ بستر پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے اکھڑ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔
"تو یہ کہ...... وہ شادی کی تاریخ لینے آئی ہیں۔" حریم نے مدھم لہجے میں بتایا تو وہ دم بخود سی حریم کو دیکھنے لگی۔
"کس کی شادی؟"
"تمہاری اور زلفی کی۔" حریم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آواز مدھم رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو وہ غرائی۔
"دھکے مار کر باہر کرو ان ماں بیٹی کو...... ہے کیا ان کا لچا لفنگا بیٹا...... جس کا رشتہ منہ اٹھا کر لے آئی ہیں یہ۔"
"جو بھی ہو...... مگر اس وقت تماشا مت لگانا...... ابا بھی موجود ہیں گھر پہ۔"
"تو کیا کروں خاموشی سے زلفی نام کے زہر کو پی جاؤں؟" وہ دانت پیس کر بولی تو حریم نے اسے تسلی دی۔
"تین ماہ کہہ رہی ہیں پھپھو شادی میں...... تم اپنا کیس اس دوران ابا کے سامنے اچھے سے پیش کر سکتی ہو مگر فی الحال چپ رہو اور چل کے ملو ان دونوں سے۔" حریم نے مشورہ اور آرڈر ایک ساتھ دیا تھا۔ چند لمحے اسے تیز نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیچھے نکل آئی۔ نصرت اسے دیکھتے ہی والہانہ انداز میں اٹھ کر چمٹا لپٹا کر پیار کرنے لگیں جبکہ نرمین کا انداز بہت روکھا پھیکا اور لیا دیا سا تھا۔
"بس بھائی صاب! اب مجھ سے مزید صبر نہیں ہوتا...... بات طے ہے اب...... ٹھیک تین ماہ بعد بارات لے کر آ جاؤں گی آپ کے دروازے پر۔"
نصرت نے نرمین کا روکھا انداز دیکھ کر بھی اف نہیں کی تھی۔ فاخرہ بھی ہونے والی بھابی کے نخرے ہضم کرتے ہوئے مسکرا مسکرا کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ جبکہ نرمین کے ذہن میں حریم کی سمجھائی ہوئی بات گردش

کر رہی تھی۔ اسے اب جلد از جلد ابا سے اپنے حق کے لیے بات کرنی تھی۔ اماں خاموش مگر گہری نظر سے زمین کے تاثرات دیکھ رہی تھیں۔ اس کی خاموشی کے پیچھے کوئی طوفان چھپا ہوا انہیں صاف نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

"تیار ہو جاؤ...... تمہارے گھر چلتے ہیں۔"

وہ میرب سے مل کر آیا تب بھی حریم اسی جگہ بیٹھی تھی۔ وہ مصروف سے لہجے میں کہہ کر وارڈ روب کھول کر کھڑا تھا۔ اس قدر غیر متوقع آفر پر حریم کے حواس بکھلنے لگے۔

"میرے گھر......" اس کی رگوں میں خون پوری قوت سے دوڑ اٹھا۔

"ہاں......" وہ پلٹ کر مسکرایا۔

"لیکن اگر ابا نے ہمیں گھر میں داخل نہ ہونے دیا تو......؟" وہ اٹکی۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تم اٹھو۔ فوراً سے تیار ہو جاؤ۔" وہ کہتے ہوئے اپنے کپڑے لیے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔

"اللہ...... تیرا شکر......" وہ متشکری نم آنکھوں کے ساتھ تیزی سے اٹھی اور اپنے کپڑے نکالنے لگی۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" وہ دونوں تیار ہو کر باہر آئے تو لاؤنج ہی میں نزہت سے ٹکراؤ ہو گیا۔ ان کی حیران سی نظر نک سک سے تیار حریم سے ہو کر بیٹے تک لوٹی۔

"حریم کو اس کے والدین سے ملوانے لے جا رہا ہوں مما۔" وہ رسٹ واچ بند کرتا مسکراتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"جو لوگ بیٹی کے ولیمے میں نہیں آئے وہ داماد کو گھر میں گھسنے دیں گے کیا؟ اسے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دو تمہیں کوئی ضرورت نہیں جا کر اپنی انسلٹ کروانے کی۔" وہ نخوت سے کہتی حریم کو چور سا بنا گئیں۔

"کچھ نہیں ہو گا مما! آپ فکر مت کریں۔ ماں باپ کی ناراضی ویسے بھی چند دنوں کی ہوا کرتی ہے۔ ان کا بھی غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔" ان کی ڈرائیور والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا پھر حریم کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔

"وہ اس گھر میں میری مرضی سے آئی ہے مما! اور میری وجہ سے جو کچھ بہت الجھ چکا ہے اب مجھے کھینچا تانی کر کے اسے توڑنا نہیں بلکہ جوڑنا ہے باقی جو اللہ کو منظور۔" وہ سنجیدگی سے جو کہہ رہا تھا نزہت اچھی طرح سمجھ گئیں۔

"تم اپنا گھر دیکھو...... کہاں ان دو ٹکے کے لوگوں کے ساتھ پھر سے ماتھا لگا رہے ہو۔ وہ جانے اور اس کے ماں باپ...... پہلے بھی تو......" وہ ناگواری سے کہہ رہی تھیں کہ وہ بیچ ہی میں ان کی بات کاٹ گیا۔

"پہلے کی بات اور تھی مما! اب تو سب کچھ ہی بدل چکا ہے۔" مدھم آواز میں کہہ کر جھک کر ان کی پیشانی چومتے ہوئے اللہ حافظ کہتا وہ حریم کے پیچھے نکل گیا تھا۔ نزہت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کو لگا جیسے اب کچھ بھی کہنے کو باقی نہ رہا ہو۔

☆☆☆

گاڑی پوش ایریا سے نکل کر اب بہت جانے پہچانے راستوں پر رواں دواں تھی تو حریم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں کر لیا۔ جوں جوں یہ فاصلہ سمٹ رہا تھا توں توں اسے اپنی سانس سینے میں گھٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ پچھلے دنوں میں اسے لگ رہا تھا کہ وہ ظالم ترین انسان ہے جو اس سے کہتا ہی نہیں کہ چلو تمہیں تمہارے والدین سے ملوا لاؤں...... اور آج جب وہ اس کے ساتھ چل پڑا تھا تو حریم کا راستے سے ہی پلٹ جانے کا دل کر رہا تھا۔ اسے یاد تھا ابا نے اس کی شادی سے ایک روز پہلے اسے کیا کہا تھا۔ حریم کو رونا آیا۔ ماں باپ کی باتیں بھلائے جانے والی نہیں ہوا کرتیں۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو حریم چونکی وہ چپ چاپ اس کے رخساروں پر بہتے آنسو دیکھ رہا تھا۔

"گاڑی گلی میں نہیں جائے گی...... یہاں سے پیدل جانا پڑے گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ حریم نے شرمندہ ہو کر سرعت سے آنسو صاف کیے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ شال اچھی طرح لپیٹتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتری اور چہرہ بھی چھپا لیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے والدین سے پہلے کوئی اور اسے پہچانے...... اس کے پیچھے سر جھکائے وہ اپنے دروازے تک روتی ہوئی آئی تھی۔

سر اٹھا کر دیکھا...... وہ گھر آج سر جھکائے کھڑا تھا جہاں سے تین بیٹیوں کا باپ کبھی سر اٹھا کر باہر نکلا کرتا تھا۔ حریم کا دل کسی نے کچل ڈالا۔ وہ ڈور بیل بجا رہا تھا۔ دروازہ طوبیٰ نے کھولا اور اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔ وہ خاموشی سے سائیڈ پر ہو گیا۔ حریم چہرے پر سے شال پرے کرتی بے تابی سے آگے بڑھی تو طوبیٰ ایک چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔

"آپی......" وہ ملے جلے تاثرات کے ساتھ رو رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی۔

"اماں کہاں ہیں؟" حریم اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھی۔

"اماں! دیکھیں تو کون آیا ہے۔" طوبیٰ کی کھنکتی ہوئی آواز بہت دنوں بعد گھر میں گونجی تھی وہ ماں تھیں کیونکر نہ سمجھتیں۔ تیزی سے صحن میں نکلیں۔

"اماں......" حریم ایک دھاڑ سی مار کر بھاگ کر ماں سے لپٹی تھی۔

"حریم......!" انہوں نے بھی بے اختیار اسے بانہوں میں لے لیا۔ "میری بچی!" وہ بلک کر رو دی۔ اس شفیق لمس کے لیے وہ کتنے دنوں سے تڑپ رہی تھی۔ وہ سینے پر بازو لپیٹے خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔ بنا کسی گلے شکوے کے وہ ان دونوں کو اندر لے گئیں۔ فوراً طوبیٰ کو چائے بنانے کا کہا اور حریم کے ہاتھ تھامے بیٹھی رہیں۔ کبھی اسے سینے سے لگا لیتیں اور کبھی اس کا ہاتھ چوم لیتیں۔

"ابا کیسے ہیں؟ انہوں نے مجھے معاف کیا یا نہیں اماں؟" حریم کے لب کپکپائے۔ وہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم تھی۔ جو مجرم تھا وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

"بس...... صبح سے رات اور رات سے صبح کر رہے ہیں۔" انہوں نے آہ بھری۔ آنکھوں تلے سیاہ حلقے لیے وہ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔

طوبیٰ چائے کے ساتھ شامی کباب اور چھوٹے سموسے تل لائی تھی۔ طوبیٰ نے ہی شاندار سی پرسنالٹی والے بہنوئی کو چائے کا کپ تھمایا۔ حریم نے تو یہاں آ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ اماں کی بات سن کر حریم کو رونا آ گیا۔

"اماں! آپ جانتی ہیں نا...... میں زلفی سے شادی کر لیتی ابا کی خوشی کی خاطر...... اس گھر کی خاطر۔" وہ حریم کی بات سن کر عجیب سی کیفیت میں گھرنے لگا اور اماں کو گھڑی پر ابا کے آنے کا وقت ہوتا دیکھ کر نجانے کیا کچھ یاد آ گیا۔

"جلدی سے چائے پیو اور جاؤ تم لوگ...... تمہارے ابا آنے والے ہیں۔" وہ فوراً اپنی شفقت سمیٹ کر سرد مہری ہو گئیں۔

"اماں...... مجھے ابا کو دیکھنا ہے پلیز۔ ان سے ملنا ہے۔" حریم کی رنگت زرد پڑی۔

"میں نے تو ان کی دی قسم توڑ دی ہے حریم! مگر وہ اپنی قسم کبھی نہیں توڑیں گے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔" انہوں نے سختی سے اسے باور کرایا تو ان کی بات سمجھتے ہوئے وہ چائے کا خالی کپ ساسر میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"چائے بہت اچھی بنی تھی۔" وہ مسکرا کر طوبیٰ سے کہہ رہا تھا۔ طوبیٰ بھی مسکرا دی۔ اسے اپنا بہنوئی بہت پسند آیا تھا۔ حریم کے ساتھ کیا ہی خوب صورت جوڑی لگی تھی اس کی۔ اماں کے ایک دم سے یوں نظریں پھیر لینے پر

حریم دل مسوس کر اٹھ گئی۔
"انہیں پتا چلا کہ تم یہاں آئی ہو تو قیامت برپا کر دیں گے وہ۔" ان کی نظر مستقل گھڑی کی آگے بڑھتی سوئیوں پر تھی۔
"کتنی بدقسمت بیٹی ہوں باپ کے لیے سلام بھی نہیں دے کر جا سکتی۔" وہ روتے ہوئے ماں اور بہن سے مل کر نکلی تھی۔
گاڑی میں اس کی سوں سوں کی آواز مسلسل گونج رہی تھی اس نے ٹشو کا پورا باکس ہی اٹھا کر حریم کی گود میں ڈال دیا۔
"بس کر دو اور کتنا روؤ گی؟" وہ کافی دیر سے گاڑی یونہی سڑکوں پر بھگا رہا تھا وہ ایسے روتے ہوئے حریم کو گھر نہیں لے کر جانا چاہتا تھا۔
"زندہ رشتے بچھڑیں تو صبر نہیں آیا کرتا۔" وہ رندھے لہجے میں بولی۔
"آئم رئیلی سوری...... مگر یہ فیصلہ وقت کی ضرورت تھا حریم! تم نہیں جانتیں میں نے بھی زندہ رشتے کھوئے ہیں اس فیصلے سے۔" وہ احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے اپنے علاقے میں گاڑی داخل کر رہا تھا۔ حریم نے دکھ سے اسے دیکھا۔
"اس سارے قصے میں میرا کیا قصور تھا جو مجھے سزا ملی؟"
"ضروری نہیں کہ ہر بار کسی قصور ہی کی سزا ملے...... کچھ کام قسمت میں جیسے ہونے لکھے ہوں ویسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسے آزمائش کہتے ہیں۔" وہ گیٹ کے سامنے آ کر ہارن بجا رہا تھا چوکیدار نے مستعدی سے گیٹ کھول دیا گاڑی چکنے فرش پر پھسلتی اندر پورچ میں آ رکی۔
"اس آزمائش میں، میں تمہارے ساتھ ہوں حریم! تمہارے گناہ گار کے طور پر ہی سہی۔"
وہ نیچے اتر رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے اس کی ٹھہری ہوئی آواز سنی مگر وہ رکی نہیں یونہی ست روی سے چلتی اندر کی طرف بڑھتی چلی گئی تو سر جھٹک کر گاڑی بند کرتا وہ بھی اندر چلا آیا۔ دو قدم کے فاصلے سے آگے پیچھے کوریڈور میں داخل ہوئے تھے۔ نزہت کے کسی کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوسری آواز پہچانتے ہوئے کوریڈور میں ہی حریم کا بازو تھام کر روک لیا۔
"اندر مائرہ ہے۔" اسے مطلع کیا۔
"مائرہ کون؟" حریم نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ کھنکھارا۔
"میری کزن ہے اور......" وہ ذرا رکا۔
"اور......؟" حریم ٹھٹکی۔
"اور...... شادی ہونے والی تھی اس سے میری مگر نہیں ہو پائی۔ آسان الفاظ میں زلفی ہی سمجھ لو اسے۔"
وہ سر کھجاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حریم کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ چمکی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے لاؤنج میں داخل ہوا تو دونوں کی مسکراہٹ نے اندر والوں کے دل جلا کر خاک کر ڈالے۔
"بڑی دیر لگا دی معافی تلافی میں تمہارے ماں باپ نے۔" نزہت نے کنٹیلے انداز میں کہتے ہوئے اچٹتی نگاہ حریم پر ڈالی تو اس کی مسکراہٹ گم ہوتے وقت نہیں لگا۔
"یہ مائرہ ہے حریم! میری فرسٹ کزن ہے اور مائرہ! تم تو حریم سے......" وہ ماحول کی سنگینی کو بدلنے کی خاطر تعارف کا تکلف نبھانے لگا جب ہی مائرہ نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز میں کہا۔
"اور یہ حریم ہے جس کا تعلق دن دیہاڑے دوسروں کا نصیب چرانے والوں کے قبیلے سے ہے۔" حریم کی

رنگت بدلی۔
''میں میرب کو دیکھ لوں ذرا۔'' فوراً سٹنگ روم کی طرف بڑھی اس وقت میرب وہاں کھیل رہی ہوتی تھی۔
''شکر ہے اس کا بھی خیال آیا تمہیں اپنے سوگ سے نکل کر۔'' نزہت کی بلند آواز نے اس کا پیچھا کیا تھا حریم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
''مما پلیز! جانے دیں یار۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس سارے سلسلے کو ہم اچھے طریقے سے بھی ہینڈل کر سکتے ہیں۔'' وہ خفا ہوا۔
''اچھے طریقے سے تو مائرہ بھی ہینڈل کر سکتی تھی پھر تم اسے بیچ میں کیوں لائے؟'' نزہت بگڑیں۔
''اسے ہی پہلا موقع دیا تھا مما! مگر اس کی طرف سے انکار ہی ملا ہمیشہ...... اور یہ بات آپ بھی جانتی ہیں اسے ''میں'' چاہیے تھا مگر بنا میرب کے۔'' وہ جتاتے ہوئے بولا۔
''تم نے ایک چھوٹی سی بات کے لیے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا...... میرب کو تو اب بھی ثریا ہی سنبھال رہی ہے۔'' مائرہ تو ابھی بھی اسی صدمے کی گرفت میں تھی۔ جتنا خود پر قابو پاتی اتنا ہی اناء یہ تازیانے برستے۔
''حریم اب پہلے سے بہتر ہے میرب کو سنبھال لے گی۔'' اس نے حریم کی حمایت کی تھی۔
''پہلے خود کو تو سنبھال لے۔'' نزہت نے طنز کیا تھا۔
''اور سنا ہے آج تم اس کے ماں باپ سے معافی مانگنے گئے ہوئے تھے؟'' مائرہ ویسی ہی تھی خشک اور تلخ...... غم بعض لوگوں کو جلا کر نرم کر دیا کرتا ہے مگر وہ جل سلگ کر اور تن گئی تھی ایسے لوگ ٹوٹ تو جایا کرتے ہیں جھکا نہیں کرتے۔
''اب اس سوال کا کیا جواب دوں میں تمہیں۔'' وہ ایک شاکی نگاہ نزہت پر ڈالتے ہوئے گہری سانس بھر کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
''تم صرف یہ کرو کہ اب مجھے گھر ڈراپ کر کے آؤ...... کافی دیر کی آئی ہوئی ہوں میں پھپھو کے پاس۔'' وہ موڈ تبدیل کر کے مسکرائی تھی۔
''ہاں کیوں نہیں بلکہ راستے میں کافی بھی پلوا دینا اسے ثریا تو میرب کو سنبھالنے میں ہی لگی رہی آج۔'' نزہت کے ہونٹوں پر بھی اتنی دیر میں پہلی بار نرم سی مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
''اوکے لیڈیز۔'' وہ ذرا سا جھک کر ادب سے بولا تو مائرہ کا دل خوش ہو گیا
''میں ابھی چھوڑ کر آتا ہوں اسے۔'' وہ نزہت سے بولا تو انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
وہ دونوں کو اکٹھے جاتے دیکھ کر کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

''خدا کے لیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو عباد! پاگل ہے وہ نری اور بے وقوف بھی۔''
آج عباد کا برتھ ڈے تھا اور پچھلے ہفتے ہی تو اس نے نزمین کو اپنے اپارٹمنٹ پر انوائٹ کیا تھا ایک اچھے سے سیلیبریشن کے لیے۔ مگر بیچ میں اس حریم کی بچی نے الگ ہی طوفان اٹھا دیا تھا۔ جس کی سزا کے طور پر دو دن سے نزمین مسلسل کال کر رہی تھی مگر عباد اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔ نزمین نے نجل سے کہہ کر رانا کے ذریعے اسے پیغام بھی پہنچایا مگر بے سود اور آج جب اس کا برتھ ڈے تھا تو وہ اس پر احسان کرتے ہوئے اس کی کال اٹینڈ کر چکا تھا۔
''تمہاری بہن نے کہا تھا کہ تمہارا پیچھا چھوڑ دوں۔'' وہ بات کے شروع میں ہی بے رخی سے بولا تو نزمین کی جان ہوا ہونے لگی۔ اس کے خواب...... دولت...... بنگلہ گاڑی سب دور جاتے محسوس ہوئے۔ ایسے میں معافی تلافی کر لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"آئم رئیلی سوری...... میں معافی مانگتی ہوں اس کی طرف سے۔" عباد کی پیشانی پر شکن تھی۔
"فون پر معافی ہوتی ہے نہ تلافی۔"
"میں آجاؤں گی تمہارے اپارٹمنٹ میں...... پھر تو ناراضی ختم ہو جائے گی نا؟" وہ آس سے پوچھ رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے جو اس کے اپارٹمنٹ میں اکیلے جانے یا نہ جانے والا مشکل فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی اسے منانے کی خاطر فوراً ہی کر لیا. اور اسے بتا بھی دیا۔
"اوکے......" وہ بھی گھاگ شکاری تھا اس کے مانتے ہی خشک لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا. وہ جانتا تھا اب زمین باقی کی بات ختم کرنے ضرور ہی آئے گی۔
"شکر اللہ۔" زمین نے موبائل آف کرتے ہوئے شکر کا کلمہ پڑھا پھر وقت دیکھا اور نوٹ پیڈ گھسیٹ کر ہاف لیو لکھنے لگی۔ ابارات گئے تو گھر سے باہر رہنے کی اجازت دینے والے نہیں تھے تو آدھے دن کی چھٹی کر کے وہ کافی ٹائم عباد وسیم کے ساتھ گزار سکتی تھی اور تجل کے مشورے کے مطابق اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے عباد سے شادی کی بات بھی کرنا تھی۔
"ہیپی برتھ ڈے ڈیئر۔" اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلتے ہی زمین نے خوب صورت سی مسکراہٹ اور بڑے پیارے انداز کے ساتھ لال اور سفید پھولوں کا بوکے اس کے سامنے کر دیا۔ عباد نے سنجیدگی سے بکے تھام لیا۔
"تھینکس آلاٹ۔" سائڈ پر ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا پھر دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آ گیا۔
"ہمم...... واؤ...... بیوٹی فل اپارٹمنٹ۔" زمین نے لاؤنج میں کھڑے ہو کر ڈبل بیڈ روم روشن اور ہوادار اپارٹمنٹ کا جائزہ لیتے ہوئے پرستائش انداز میں کہا تو عباد محض مسکرا دیا۔
"یہ تمہارا ہے؟" وہ بچوں کی سی خوشی سے پوچھ رہی تھی۔
"ہمم......" اثبات میں سر ہلایا تو اس کی خاموشی اور بے رخی زمین کو بری طرح چبھی۔
"کیا ہوا یار...... ابھی تک خفا ہو؟ حریم کی طرف سے میں سوری کرتی ہوں تم سے۔" زمین نے شرمساری سے کہتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"اپنی بہن کو بتانا مینرز اور ایٹی کیٹس کے بارے میں کچھ۔" وہ ناراضی سے بولا۔
"بہت ڈانٹا ہے اسے قسم سے...... بلکہ میں تو اچھی خاصی ناراض ہوں اس سے۔" اس کے تیقن سے کہنے پر عباد کا موڈ بدلا۔
"تم نے مجھے وش نہیں کیا۔" نظریں اس پر جمائے وہ اس کے قریب آیا۔ سرخ و سیاہ ڈیزائن کے ٹاپ اور سیاہ ٹراؤزر میں ملبوس جارجٹ کا سیاہ دوپٹہ جو گھر سے نکلتے بہت طریقے سے پھیلا کر سر اور وجود پر اوڑھا ہوا تھا اب اس کے گلے کے گرد بل کھا رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار پہ جھولتی بالوں کی لٹ کو اس کے کان کے پیچھے اڑسا، اس کی نظروں کی چمک نے زمین کو جھینپ جانے پر مجبور کر دیا۔
"ابھی آتے ہی وش کیا تو ہے۔"
"تم بھی نا......" عباد نے ہنستے ہوئے اسے بازو کے حصار میں لینے کی کوشش کی تو وہ گھوم کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔
"اکیلے بلا کر اب زیادہ پھیلو مت۔" زمین نے تنبیہ کی۔ مگر وہ تنبیہ ایسی نہیں تھی جس سے دوسرا قابو میں رہتا۔ مسکراتے ہوئے وہ اوپن کچن سے پلیٹ میں چاکلیٹ کیک لے آیا تھا۔
"اکیلے آنے کا مطلب تو سمجھتی ہو گی تم۔" وہ ذو معنی انداز میں کہہ رہا تھا۔
"شٹ اپ...... کیک کاٹو ورنہ گردن کٹوا بیٹھو گے۔" وہ چھری اٹھا کر لہرا کر اسے تھماتے ہوئے ہنسی دی۔

وہ کیک کاٹ رہا تھا۔ نرمین نے مدھم سروں میں برتھ ڈے سونگ گا کر اسے وش کیا اس نے کیک کا ایک پیس کاٹ کر نرمین کو آدھا کھلایا باقی اپنے منہ میں ڈال لیا۔ وہ بالکنی میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا جب نرمین چھوٹی نفیس سی ٹرے میں بھاپ اڑاتی کافی کے دو مگ رکھے چلی آئی۔

"تھینک یو۔" اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کافی کا مگ اٹھا لیا۔ وسیع بالکنی میں فرش پر باقاعدہ رگز بچھائے گئے تھے، ایک سائیڈ پر خوش رنگ پھولوں سے سجے تین گملے رکھے تھے جن میں سے کچھ بیلیں نکل کر بالکنی کے باہر لٹک رہی تھیں۔ ان کے پاس ہی ایک ایزی چیئر پڑی تھی۔ دوسری سائیڈ پر دو کین کی کرسیاں اور میز تھی۔ نرمین کے خیال میں تو اس بالکنی میں انسان پورا دن بنا کسی مصروفیت کے گزار سکتا تھا بس چائے کافی پیتے رہو اور ایزی چیئر پر نیم دراز جھولتے رہو۔

وہ اپنا مگ تھام کر ریلنگ کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگی۔

"باہر کے منظر اندر سے زیادہ اچھے ہیں کیا؟" وہ اٹھ کر اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا اور اب اسی کے انداز میں باہر جھانک رہا تھا جہاں سے لیڈیز پارک صاف دکھائی دے رہا تھا اور اکا دکا بچے اور عورتیں اس وقت بھی پارک میں موجود تھے عباد اس کے بالکل قریب کھڑا تھا اس کے شانے پر بازو پھیلائے ...... نرمین کی سانس تھمنے لگی وہ پلٹتی تو یقیناً عباد سے ٹکرا جاتی وہ ساکت کھڑی رہی۔

"پھپھو میرا رشتہ مانگ رہی ہیں اپنے بیٹے کے لیے۔" اس نے ہمت مجتمع کی اور خود کو کہتے سنا، جواب میں چند لمحے خاموشی پھیلی رہی۔ آر یا پار ...... آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ عباد وسیم سیٹھی اگر اس کی قسمت کا روشن ستارہ تھا تو آج اس کی جھولی میں آ گرنے والا تھا۔

"تو ......؟" کچھ دیر بعد عباد نے نارمل سے انداز میں پوچھا تو وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی اس کا چہرہ بہت قریب تھا اتنا کہ آج وہ بالکل ٹھیک سے اس کی آنکھوں کا رنگ دیکھ پا رہی تھی وہ بھی پلک جھپکے بنا اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"رئیلی ...... یعنی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا؟" نرمین کو تکلیف ہوئی، جواب میں لمحہ بھر کے توقف کے بعد عباد نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اندر لے آیا۔ کافی کے دونوں مگ کچن کاؤنٹر پر رکھے۔

"تم میری ہو میں تمہارا ہوں اس کے علاوہ ہر بات بے معنی ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"تم اپنا پرپوزل بھیج دو تو میں کیسے بھی ابا کو منا لوں گی۔" نرمین کا ہاتھ اس کے گرم ہاتھوں کے بیچ پگھلنے لگا۔

"ہمم ...... تم نے ابھی تک مجھے وش نہیں کیا۔" دوبارہ سے وہی متضاد بات کرتے ہوئے اس کے بازو نرمین کے گداز وجود کے گرد لپٹے تھے وہ سر تا پا سنسنا اٹھی۔

"دو نامحرموں کے بیچ تیسرا ہمیشہ شیطان ہوا کرتا ہے۔" نرمین کو ماں باپ کا پڑھایا ہوا سبق یاد آیا مگر کافی دیر سے ......

"عب ...... باد ...... لیوی ...... چھوڑو مجھے ...... کیا مذاق ہے یہ ......"

اس نے تڑپ کر خود کو عباد کی گرفت سے آزاد کروانا چاہا تو وہ مخمور انداز میں ہنسنے لگا۔

"نہ نہ ...... بڑی مشکل سے تو قابو میں آئی ہو اتنی آسانی سے تھوڑی جانے دوں گا ...... کچھ تو خراج ...... معافی تلافی ......" نرمین کو لگا جیسے اس کی سماعتوں میں کسی نے تیزاب انڈیل دیا ہو۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مکمل ناول

یہ گوٹھ مٹھار جا کی ریتیلی زمین کے فراخ سینے پہ سرپٹ دوڑتے ان سرکش گھوڑوں کی آوازیں ہی تھیں۔ جو پورے چاند کی رات میں ایک عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ فضا میں بلند ان چمکتی تلواروں کی کھنک بتاتی تھی کہ میدان میں ادھر ادھر دوڑتے مختلف رنگوں کے گھوڑوں کی پشت پر سوار ان آٹھ شہزادیوں کے درمیان چھڑی یہ جنگ اپنے عروج پہ پہنچ چکی ہے۔

تھیں تو وہ آٹھوں کی آٹھوں شہزادیاں ہی بے حد سندر مگر سب سے زیادہ حسین سفید گھوڑی کی پشت پر سوار وہ نازنین تھی۔ وہ جس کے مہکتے روپ کو دیکھ کر اس پر کسی چندر بنسی راجکماری ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

سحرش خان بھٹو

ہوا سہیلی، چلی پیا سنگ گوری

وہ زعفرانی اور عنابی رنگ کے راجستھانی گھاگھرا چولی میں ملبوس اپنے دونوں ہاتھوں میں بھر بھر کر کانچ کی چوڑیاں پہنے ہوئے تھی۔

اس کی نازک پشت پر بکھری اس کی سنہری زلفیں کھلی ہوئی تھیں اور مٹھار جا کی محبت بھری ہوا میں اس میں لہریں اٹھا رہی تھیں۔

اس کے نازک ہاتھ میں تھمی چاندی کے ہتھے والی تلوار کا عکس جب میرون رنگ کی لپ اسٹک سے سجے اس کے ہونٹوں کے نچلے خم پر پڑتا تو تمام منظر جیسے مکمل ہونے لگتا۔

اور اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے ایسے ہی منظر مکمل کیسے ہو گیا؟ بغیر کسی راجکمار کے۔

جب مٹھار جا کے صحرا میں گھوڑے تھے۔ تلواریں تھیں۔ پورا چاند بھی تھا اور راجکماری بھی تھی۔ تو کیا کوئی شہزادہ کوئی راج کمار نہیں تھا وہاں؟ ہاں تھا، راجکمار بھی تھا۔ وہاں، سیاہ سوٹ میں ملبوس گہری سانولی رنگت اور سیاہ داڑھی والا راجکمار، جس کی فراخ پیشانی پر سرخ رنگ کا رکھشا (حفاظت) کا ٹیکا سجا تھا۔

گو وہ تلک غیر ضروری تھا مگر پھر بھی اس کی پیشانی پر سج رہا تھا۔

پنڈال میں جلتے برقی قمقموں کی روشنی اور ریت

کے کنارے گڑے چراغوں کی لو جب اس راجکمار کے سانولے سے چہرے پر تھرتھراتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج سمندر کے سینے کو چیر کر طلوع ہونے کی تیاریوں میں ہو۔

سانولی رنگت کے باوجود اس راجکمار کی وجاہت کا یہ عالم تھا۔ اگر چہرے کی رنگ سنہری ہوتی تو کیا ہی بات تھی۔

وہاں موجود کئی شہزادیوں کی نگاہیں اس کے وجیہہ چہرے پر بھٹکی تھیں۔

لیکن خود اس راجکمار کی بے تاب خواب ناک آنکھیں۔ سفید رنگ کی گھوڑی کی پشت پر براجمان اس چندر بنسی راجکماری پر جمی تھیں اور اس کی سحر طراز آنکھوں سے ہوتی اس راجکمار کی نظریں میرون لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں کے نچلے خم پر گڑی تھیں۔

خسرو دریا پریم کا، الٹی وا کی دھار
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا سو پار

☆☆☆

"ایک بات یاد رکھنا شارق عباس! چھپکلی کا بچہ کبھی بھی مگرمچھ کی اولاد نہیں بن سکتا...... کیونکہ اس کے مقدر میں عمر بھر دیوار پر رینگنا لکھا ہوتا ہے...... سمندر کا بادشاہ بننا نہیں۔"

"ہاہاہا!" اسپیکر پر سے ابھرتی اپنے سیاسی حریف کی آواز نے سنتے اوطاق میں کرمیوں (مزارعوں) کے درمیان بیٹھے شارق عباس اک زبردست سا قہقہہ لگایا تھا۔

"لگتا ہے اسحاق بھاؤ را ہو جا پولنگ اسٹیشن بھی آپ ہار رہے ہیں...... جب ہی تو توائی (غصے) کا یہ عالم ہے۔

ریلکس! چھوٹی سی کرسی تو ہے ناظم کی، آپ اس درجہ پریشان کیوں ہو رہے ہیں......؟"

"پریشان؟ ہونہہ۔" اسحاق نظامانی نے تمسخر سے سر جھٹکا۔ "توں کھی خبر آ شارق عباس...... میں نے ناظم کی سیٹ کے لیے تمہارے بھتیجے کے مقابلے میں اپنے منشی کے بیٹے راجن داس کو کھڑا کیا ہے...... اگر یہ سیٹ وہ تمہارے بھتیجے سے ہار گیا تو اس کی اوقات پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا، البتہ تمہارے بھتیجے کی اوقات راجن داس جیسی ضرور ہے میری نظر میں۔"

"ہا...... ہا! خوب سائیں بہت خوب۔" شارق عباس کی ہنسی میں جوابا سکون جھلکا تھا۔

"یہ ہی بات بتانے کے لیے آپ نے فون کیا تھا کیا؟" وہ ہنسے۔

"نہیں!" اسحاق نظامانی نے دانت پیستے ہوئے گردن نفی میں ہلائی تھی۔ اور قبل اس کے کہ وہ اپنی بات کہتے۔

"اچھی بات ہے۔" شارق عباس نے رک کر قہقہہ لگایا۔ "تو پھر مینڈک کو کنویں کے کنارے پھدکنے دیتے ہیں...... کہ جھیل کا راجا تو بہرحال مینڈک بھی نہیں بنتا۔" انتہائی طنزیہ لہجے میں کہنے کے بعد وہ سلسلہ منقطع کر گئے تھے۔

☆☆☆

اس نے بیل بجائی تو دروازہ ایک بہت کیوٹ سے گول گپلو بچے نے کھولا۔ وہ ننھا فرشتہ سفید شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔

"نمستے انکل۔" دروازہ کھولنے کے بعد وہ بڑے ہی بے تکلفانہ انداز میں اس کے گلے لگ گیا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے نرم گرم لمس نے اس شخص کے دہکتے وجود میں پھوار برسا دی تھی۔ وہ مسحور سا سمت سے الگ ہو کر جیتن سے ملا تھا۔

اپنے بزنس ٹور کی وجہ سے وہ ان دنوں میکسیکو میں رکا ہوا تھا اور آج اس کی واپسی تھی مگر جیتندر نے اچانک کال کر کے اس کو لنچ پر انوائیٹ کر لیا۔

جیتندر کی پتنی پرمیلا بھابی ہمیشہ کی طرح بے حد تپاک سے اس سے ملی تھیں۔ "سدا رنگ بھیا! آپ کی دھرم پتنی ساتھ نہیں آئیں۔" پرمیلا بھابی نے اس سے پوچھا تھا۔

اور اس سوال پر ایک رنگ آ کر اس کے چہرے

پر گزر گیا تھا۔

☆☆☆

"ناظرین! گوٹھ طیب سادھو، عید منگی کے راہو جا کونسل سے پولنگ اسٹیشن کے نتائج آ چکے ہیں۔" ان کے مطابق راجن داس کے مقابلے میں پی ڈی ایس پارٹی (پاکستان ڈریم سپورٹرز) پارٹی کے ٹکٹ پر پہلی مرتبہ ناظم کی سیٹ کے لیے الیکشن لڑنے والے سہیل فاروق آ گئے ہیں...... یاد رہے کہ سہیل فاروق سندھ اسمبلی کے ممبر ایم پی اے شارق عباس ابڑو کے بھتیجے ہیں۔"

"او پس! بیڈ لک......" اسکرین پر چلتی خبر سن کر اس نے مرمریں ہاتھ کی مخروطی انگلیوں میں تھاما اورنج اسکوائش سے بھرا کانچ کا نفیس گلاس غصے سے سامنے سینٹر ٹیبل پر پٹخا تھا۔

"یہ سب ہو کیا رہا ہے؟" ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور باہر برآمدے میں نکل آئی۔

اس کے گلابی نازک پاؤں برآمدے میں بچھے سبز قالین میں دھنس سے گئے تھے۔ بھابھی سامنے ہی کاؤچ پر بیٹھی نظر آ گئی تھیں۔ جب کہ زمین پر بچھے کارپٹ پر ان لوگوں کی کڑمیانیاں (مزارعوں کی بیویاں) بیٹھی ہوئی تھیں۔

ہرے رنگ کے جارجٹ کے قیمتی سوٹ میں ملبوس اپنے گاؤں کے سردار کی بیٹی پر نگاہ پڑتے ہی ان سب کی آنکھوں میں ستائش اتر آئی تھی۔ چھوٹی بی بی تھیں بھی تو اتنی پیاری۔

"بھابی! دیکھا آپ نے، ہم لوگ طیب سادھو کے پولنگ اسٹیشن پر بھی ہار گئے راہو جا کی تو خیر......" اپنی بے پناہ خوب صورت آنکھوں میں اداسی لیے وہ بھابی کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

تجھ سا حسیں، میں نے دیکھا ہی نہیں
تیری ہر اک ادا میں کوئی جادو ہے
تیرے چہرے کا نور مجھے دیتا ہے سرور

میرا ہوش میں بھی دل بے قابو ہے
تو میرا ہے نشہ، تو میرا ہے جنوں
سوہنڑیے مجھ کو بنا لے اپنی
کالر ٹیون...... کالر ٹیون ......

جونہی اس کی گاڑی پورچ میں آ کے رکی۔ میوزک کا بے ہنگم شور اس کی سماعتوں کے پردے پھاڑنے پر تل گیا تھا۔

اپنی کنپٹیاں سہلاتا وہ گاڑی سے اتر آیا۔ گیٹ کے ساتھ بندھے دونوں پالتو کتے حسب معمول اس پر نگاہ پڑتے ہی فوراً اس کی جانب لپکے تھے۔ ان میں سے ایک کتے جس کا نام نوزی تھا۔ بابا نے بچپن میں اس کو گفٹ کیا تھا۔ جب کہ براؤن کتے کو اس کی بیوی جہیز میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

سامنے لان میں پاگلوں کی طرح ناچتے جوڑوں پر نگاہ پڑتے ہی ناگواری کی اک تند لہر اس کے اندر تک اتر گئی تھی۔

اپنی سمت لپکتے نوزی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ یہ گھر تھا یا کوئی کلب جہاں آئے دن پارٹیاں سجائی جاتی تھیں اور ایسا اس کی شادی کے بعد زیادہ ہونے لگا تھا۔ کچھ اس کی بیوی اس کو زچ کرنے کی خاطر یہ سب کھڑاک پھیلائے پھرتی تھی اور کچھ اس میں بابا بھی اس کا ساتھ دیتے تھے۔

وہ لب بھینچتا لان کے اس حصے میں آ گیا تھا جہاں اس کی بیوی بنا آستینوں کے بلاؤز والی نارنجی ساڑھی میں ملبوس سہیل فاروق کی بانہوں میں جھول رہی تھی۔

سدحان کا خون کھول گیا تھا حالاں کہ یہ سب تو ان کی کلاس کا حصہ تھا مگر اس وقت اس کا جی چاہا آگے بڑھے اور اس بے حیا عورت کا میک اپ سے سجا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر کے رکھ دے۔ اذ وہ اسی ارادے سے آگے بڑھا تھا۔

جب شافعہ ہی کی عمر کی ایک دوسری لڑکی کو اپنے باپ کی بانہوں میں جھولتے دیکھ کر سدحان شارق کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اپنی دونوں کنپٹیوں کو مسلتا وہ پاؤں پٹختے ہوئے مڑا تھا اور اپنے بیڈروم کی سمت بڑھ گیا۔

اس بات سے بے خبر کہ لاؤنج کی کلاس وال کے اس پار کھڑی ماسی سردار بانو اس کے سیاست دان باپ کے پیارے پیارے پوز اپنے فون پر اتارتے ہوئے شاطرانہ انداز سے مسکرا اٹھی تھی۔ سائیں تو سائیں، شارق عباس کی گرل فرینڈ بھی سائیں؟ کل جب یہ تصویریں سوشل میڈیا پر وائرل ہوں گی تو یقیناً آپ کی شہرت آپ کے ووٹرز کو خوش کر دے گی۔“

☆☆☆

”سجدہ جانو!“ بھابی نے اٹھ کر اس کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ”ریلیکس......! راہو جا کی سیٹ ان کو جیتنی ہی تھی۔ وہ ان کا علاقہ ہے مجھے شامی طیب سادھو کی پولنگ ہارنے کا دکھ ہے۔ ہمارے لوگوں نے اتنا کام کیا تھا ادھر جا کر۔“ نومیہ بھابی کا لہجہ افسردہ تھا۔

سجدہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔

”میں بابا کو اداس نہیں دیکھ سکتی بھابھی...... میں ان کو ہارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

”بابا ہیں کہاں؟“ اپنے نازک لب کچلتی، آنسو پلکوں پر روکتی وہ وہاں بیٹھی اپنی تمام کزنیانیوں کو مبہوت ہی تو کر گئی تھی۔

سجدہ اسحاق کا حسن تھا ہی مبہوت کر دینے والا۔ وہ گویا کانچ سے بنی کوئی گڑیا ہی تو تھی۔

صندلی سڈول بدن، پانچ فٹ آٹھ انچ قد سنہری پلکوں سے سجی قاتل آنکھیں۔ جو مقابل کو گھائل کرنے کا ہنر رکھتی تھیں۔

چاند چہرے پر کٹاؤ دار لب اپنے مخاطب کو دونوں جہاں بھلا دیا کرتے۔

کمر سے بھی نیچے کو جاتے اس کے خوب صورت بالوں کو دیکھ کر کسی سبک خرام آبشار کا خیال آتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ دیومالائی کہانیوں کا کوئی کردار ہی تو نظر آتی تھی۔

☆☆☆

لنچ ان لوگوں نے خاصے خوش گوار ماحول میں بیٹھ کر کیا۔ لنچ کے دوران بھی وہ جتین کے بیٹے سمت کی چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو انجوائے کرتا رہا۔

"جتین کی شادی میری شادی سے تین چار سال قبل ہی ہوئی ہے اور میری شادی کو بھی ایک سال تو ہونے ہی والا ہے اگر میں اور وہ ایک نارمل میرڈ لائف گزار رہے ہوتے تو یقیناً آج ہم دونوں کے پاس بھی سمت جیسا اک کھلونا ہوتا۔" سیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا سدحان اس خیال آنے پر اچانک سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ اور پھر کراچی ایئرپورٹ پر اترتے ہی وہ ایک فیصلہ کر بیٹھا۔

یہ ہی وجہ تھی گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے نوکرانی سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

☆☆☆

"بابا اوطاق میں ہیں سجدہ۔" اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بھابی نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"اور ادا سائیں؟" اس کے ہونٹ نزاکت سے ہلے۔

"وہ بھی بابا کے ساتھ ہی باہر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" بھابی کی اطلاع پر وہ سرعت سے پلٹی تھی اور بھاگ کر لان کے اس حصے میں آ گئی، جہاں سے باہر اوطاق کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس کی بے پناہ پرکشش وسرمئی آنکھیں لکڑی کی جالیوں سے جھانکتے ہوئے اسحاق نظامانی کے شاہی کاؤچ پر جا رکی تھیں۔ اور ٹھیک اسی وقت سجدہ نے صوبے کو بابا کے پاس آتے دیکھا تھا۔

"سائیں! یہ مٹھن والا گاؤں کے پولنگ اسٹیشن سے ووٹنگ لسٹ آ گئی ہے۔" ہاتھ میں دبے تینوں کاغذ صوبے نے ڈرتے ڈرتے بابا کی سمت بڑھائے تھے۔

"ارے بابا! خاک ڈالو مٹھن والا کے ووٹوں پر ہمارے ہی آدمیوں نے جا جا کر ہران پر ٹھپے مارے ہیں جب ہی تو جیت رہا ہے وہ تمام کی اولاد......"

سہیل فاروقی کی ذات پر چوٹ کرتے ہوئے سردار اسحاق نظامانی کا لہجہ بے حد کتایا ہوا تھا۔"

انہوں نے صوبے کے ہاتھوں سے لسٹ لے کر ہوا میں اچھال دی تھی۔

"خیر رہی بابا...... ناظم کی معمولی کرسی پر ہی تو جیتا ہے وہ چاچے کا بھائیا (بھتیجا)۔" قریب بیٹھے ہارون ادا نے گویا ان کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"ہم!" اسحاق نظامانی لب بھینچ گئے۔

"ہارون۔" بابا نے پاس بیٹھے ادا سائیں کو پکارا۔

"جی...... جی بابا!" ہارون نظامانی مؤدب سے مزید قریب ہوئے۔

"شارق عباس کو ایم پی اے کی سیٹ پر جیتنا نہیں چاہیے۔ میں اس سے دوسری مرتبہ ہار برداشت نہیں کر سکتا۔"

"نہیں بابا! میں آپ کو ہارنے نہیں دوں گی۔" قبل اس کے کہ ہارون ادا بابا کی بات کے جواب میں کچھ کہتے۔ حویلی کے اندر لان کے اس حصے میں جالیوں کے پیچھے کھڑی سجدہ بول اٹھی تھی۔

"تم کیا کرو گی سجدہ......" پاس کھڑی نومیہ بھابی جو اس کی خود کلامی سن چکی تھیں۔ انہوں نے حیران ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"میں...... میں کچھ بھی کر لوں گی...... شارق عباس بابا کو مقابلے میں ہارنا ہی ہو گا۔"

"تم کیا کر سکتی ہو اس سلسلے میں سجدہ......؟" بھابی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں......!" وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہو گئی۔

☆☆☆

تیرا چپ رہنا، میرے ذہن میں کیا بیٹھ گیا
اتنی آوازیں تجھے دیں کہ گلا بیٹھ گیا!

"کہاں سے تشریف لا رہے ہیں قیس

صاحب؟"

وہ کوئی کالی دھند تھی جس میں لپٹا وہ اس وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔ بلکہ یہ اس صحرا کی دھول تھی جہاں سے وہ ہو کر آیا تھا۔ وہ آج اس کو پھر وہاں ڈھونڈنے گیا تھا۔ جہاں اس سے وہ پہلی بار ملی تھی اور آخری بار بھی۔

"پاپا! میں، میں شکار پر گیا تھا۔" دھول میں اٹی آنکھیں اپنے باپ سے چراتے ہوئے اسے اپنی بے بسی پر خود بھی ترس آیا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو سدحان۔" پاپا نے گرد میں اٹے اس کے جوتوں کی سمت اشارہ کیا۔

"تم جنگل سے نہیں......اس وقت کسی ریگستان سے ہو کر آ رہے ہو......کیا تمہیں کسی جوگن سے عشق ہوا ہے......جسے صحرا میں ڈھونڈتے پھر رہے ہو تم؟" شارق عباس کے کاٹ دار طنز پر وہ لب بھینچ گیا۔

"چلیں مان لیا، وہ اگر جوگن نہیں بھی تھی۔ آپ کے بیٹے کو تو جوگی بنا دیا اس نے......" اپنے شانے پر دھرا کوٹ سامنے صوفہ پر اچھالتے ہوئے وہ اپنے لہجے کی تھکن کو اپنے باپ سے نہیں چھپا پایا تھا۔

"سدحان؟ کیا ہے یہ......؟" شارق عباس نے اس کو ٹوک کر کہا۔

"پاپا! یہ میری ہار ہے۔" نڈھال سا وہ ان کے سامنے کاؤچ پر ٹک گیا۔

"ہار جیت کو اتنی معمولی باتوں پر نہیں تولتے بیٹا، دنیا میں خوب صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں؟" نرم لہجے میں وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ جلتی آنکھیں موند گیا۔

"تم پلیز شافعہ کے بارے میں سوچو، میں نے پہلے بھی تم سے کہا تھا۔"

"پاپا! میں اس کے بارے میں کیا سوچوں؟ میرے پاس ہے ہی کیا اس کو دینے کے لیے۔" اپنی سرخ ہوتی آنکھیں کھول کر اس نے سامنے بیٹھے باپ کی طرف دیکھا تھا۔

وہ اس کی آنکھوں میں ناچتے سناٹے سے نگاہ چرا گئے۔

"سدحان! تم، تم اس کو کچھ مت دینا، فقط اس کو اپنا نام دے دو، باقی سب کچھ اس کو اس گھر میں مل جائے گا۔" اس بار یہ بات کہتے ہوئے وہ اس کو واقعی ایک سیاست دان ہی لگے۔

"پاپا......اور میرے دل کا کیا؟"

"دل کو مارو گولی......" بے اختیار ان کا لہجہ چٹخا تھا۔ ورنہ وہ سوچ بیٹھے تھے کہ آج سدحان کو پیار سے منانے کی کوشش کریں گے۔

"پاپا! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟" شاکڈ سے انداز میں وہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

یہ جو کھوئے کھوئے رہتے ہیں ہم
اس میں کچھ دخل ہے تمہارا بھی
لوگ جیتے ہیں کس طرح اجمل
ہم سے ہوتا نہیں گزارا بھی!

☆☆☆

آئینے کے سامنے کھڑے جیتن کی تیاریاں آخری مراحل میں پہنچی ہی تھیں جب وہ سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس راجکمار کا روپ دھارے اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

"میں بھی ساتھ چل رہا ہوں تم لوگوں کے نوراتری کے میلے میں۔

"تم ساتھ چل رہے ہوتا کہ کوئی لڑکی وہاں بھی ہم کو نظر اٹھا کر نہ دیکھے......ہے ناں؟" خود پہ باڈی اسپرے کرتا رتم پتلون بنیان میں ہی اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہاہاہا۔" اس کے لڑاکا انداز پہ وہ ہنس دیا۔

"کیوں نہ دیکھیں گی لڑکیاں میرے یار کو......اتنی چارمنگ پرسنالٹی تو ہے رتم راج کی......" اس نے گویا تسلی دی۔

"میں...... میں دانت توڑ دوں گا سدارنگ کے بچے تیرے۔ یہ چاند جیسی پیشانی، یہ سورج کی طرح دمکتی رنگت، یہ گھنا سلکی بالوں کا پف......یہ ساحر آنکھیں، یہ چھ فٹ سے نکلتا قد لے کر جو تو ہمارے

ساتھ جائے گا تو پھر سندریاں ہم دونوں خاک گھاس خاک ڈالیں گی......؟'' رتنم جھلا گیا۔

''او بس!'' سدا رنگ نے آنکھیں پٹپٹا گئی۔

''تو کیا نوراتری کے میلے میں تم لوگ گھاس کھانے جا رہے ہو......؟''

''ابے رک تو......'' رتنم اور جیتن دونوں ایک ساتھ اس پر جھپٹے تھے۔

دل میں رکھنے کی چیز ہے حسد
اس کو ہرگز نہ برملا کہیے

عشق کی جگہ شعر میں لفظ حسد کو فٹ کرتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا۔

''مجھ کو ساتھ لے جانے پر کیوں موت آ رہی ہے؟'' ان دونوں کی گرفت میں پھڑ کتے ہوئے اس نے دہائی دی۔

''اور ساتھ چلنے کے لیے تمہاری آتما کاہے کو پھڑک رہی ہے؟'' وہ دونوں اس کی حالت زار پر ہنسے تھے۔

☆☆☆

''باپو رام کا کہنا ہے ہیں کہ......ان کے گاؤں میں نوراتری کا میلہ لگ رہا ہے......اس میلے میں تلوار بازی و گھڑ سواری کا منورنجن بھی ہوگا......تو کیا کہتی ہے پھر......؟''

وہ کالج سے آنے کے بعد ادا کے سنگ شکار پر جانے کے لیے تیاری کر رہی تھی جب ساکشی نے آ کر یہ اطلاع دی تھی۔

وہ اور ساکشی ان دنوں کالج کی اسٹوڈنٹ تھیں۔ دونوں نے قد کاٹھ خوب نکالا تھا۔ لیکن ساکشی کے مقابلے میں اس کا حسن کسی نوخیز کلی کی مانند تھا۔ اس پر پہلی نگاہ ڈالنے والا نظر ہٹانا بھول جاتا۔

''تو مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے پگلی......یہ تو وہی موقع ہے جس کا انتظار تھا۔'' وہ کھلکھلائی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسے خطرناک کھیل میں تمہارا نام لکھواتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے......اگر تمہارے پتا شری (والد صاحب) کو پتا چل گیا تو۔''

''اوں ہوں! انہیں پتا نہیں چلنے والا......'' اس نے صراحی دار گردن نفی میں ہلائی تھی۔

''وہ کیسے......؟'' ساکشی حیران سی اس کے قریب آ گئی۔

''وہ ایسے کہ اول تو نوراتری کا میلہ ہمارے گاؤں سے تین گاؤں چھوڑ کر لگ رہا ہے......وہ گوٹھ یہاں سے اچھا خاصا دور ہے......اور دوسرا یہ کہ تم اس منورنجن میں حصہ لینے کے لیے میرا اصلی نام لکھواؤ، یہ ضروری تو نہیں......؟''

''اِس مین......؟'' ساکشی کماری نے آنکھیں پھیلائیں۔

''اِس مین......میرا نام کچھ بھی ہو سکتا ہے!''

''مثلاً ہوا سہیلی، چاند سہیلی۔''

''مائی گاڈ! ہوا سہیلی۔'' ساکشی اچھل پڑی تھی۔

☆☆☆

''ہاں یہ میں کہہ رہا ہوں......تمہارا باپ......میرے اکلوتے بیٹے ہو تم، آج سے آٹھ سال قبل تمہاری ماں اس دنیا سے جا چکی ہے، وہ تمہارے بارے میں سوچتے سے رہی، میں تمہارا گھر بسا دیکھنا چاہتا ہوں سدحان! اس میں برا کیا ہے......؟''

''پاپا برا کچھ نہیں......لیکن پلیز، آپ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں......'' وہ بالآخر اپنا مدعا زباں پر لے آیا۔

''وقت......؟'' شارق عباس نے بھنویں سکوڑیں۔

''اور کتنا وقت چاہیے تمہیں سدحان! پورے تین سال سے تم اس کو ڈھونڈ رہے ہو......وہ اب تک نہیں ملی تو اب کہاں ملے گی تمہیں......میری مان لو شادی کر لو بیٹا۔''

''تین سال کہاں......پورے دو سال تو میں آسٹریلیا میں رہا ہوں پڑھائی کی وجہ سے......پاپا ایک سال ہی ہوا ہے مجھے پاکستان آئے ہوئے۔''

''ٹھیک ہے ایک سال تو ہوا ہے ناں تمہیں اس کو ڈھونڈتے ہوئے۔ وہ تم کو نہیں ملے گی سدحان کبھی

بھی نہیں ...... اور اگر ملی بھی تو کسی اور کی بیوی بن چکی ہوگی وہ۔‘‘

’’پاپا پلیز ایسے مت کہیے۔‘‘

شارق عباس کے اس آخری وار پر اس کی گرد سے اٹی پلکیں نم ہو گئی تھیں۔

عجب طرح کی قیامت نے مجھ کو گھیر لیا
تیری جدائی کی عجلت نے مجھ کو گھیر لیا
میں آنسوؤں سے نکل ہی نہ سکا فرحت
کسی کے غم کی امانت نے مجھ کو گھیر لیا

☆☆☆

’’اوکے ڈن تم لوگوں کا مسئلہ میرے فیئر کامپلیکشن سے ہے ناں؟‘‘ اس نے رک کر پوچھا تھا۔

’’مطلب؟‘‘ جیتن اس کو چھوڑ کر دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

’’مطلب یہ کہ اس فیئر کامپلیکشن کو ہی اگر ہٹا دیا جائے تو پھر ساتھ چل سکتا ہوں ناں میں ......‘‘

’’ایسا کیسے ممکن ہے؟‘‘ رستم نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

’’ایسا ممکن ہے میرے میت۔‘‘ اس نے آگے بڑھ کر اپنے بیگ سے ایک لوشن نکال کر ان کے سامنے کیا۔

’’تو کیا تم اس کو اپنے چہرے پر لگاؤ گے؟‘‘ رستم مارے اشتیاق کے اس کی قریب آ گیا۔

’’ہوں!‘‘ وہ اثبات میں سر ہلاتے مسکرایا تھا۔

’’بٹ یار اس سے کیا ہوگا؟‘‘ جیتن بھی زیادہ دیر چپ نہ رہ پایا تھا۔

’’اس سے یہ ہوگا کہ میرے چہرے کا رنگت بدل جائے گی سانولی دکھائی دے گی۔‘‘

’’گڈ!‘‘ جونہی اس کی بات مکمل ہوئی جیتن خوشی سے ہنس پڑا تھا۔

’’اس کا مطلب آج ہمیں چانس ملنے والا ہے......؟‘‘ کھلی کھلی مسکراہٹ کے سنگ جیتن نے کہا تو۔

سدحان زور سے ہنس پڑا۔

ویسے جیتن ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ سدحان کی موجودگی میں لڑکیاں ہمیشہ رستم اور جیتن کو بھیا اور سدحان کو اپنا پیا بنانے پر راضی نظر آیا کرتی تھیں۔ ایسے میں اس کو ساتھ نہ لے جانے کی وجہ تو بنتی تھی۔

☆☆☆

ما...... بھابی! ماسی جنت۔‘‘ ساعت کے ہزارویں حصے میں اس کے ذہن میں جھما کا سا ہوا تھا اور چہرے پر روشنی بکھر گئی تھی۔

’’ماسی جنت؟‘‘ نومیہ بھابی نے تعجب سے ماسی جنت کا نام دہرایا تھا۔

’’ماسی جنت، صوبے جی سس (ہاں ماسی جنت صوبے کی ساس) آپ کو یاد ہوگا۔ جن کے پوتے کی جان میں نے بچائی تھی۔‘‘

’’ہا...... ہاموں کھی یاد آیو سجدہ جانو۔‘‘

’’یہ تو بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، تم ان دنوں ناکتھ کی اسٹوڈنٹ تھیں جب ایک شام گاؤں کا پاگل کتا ماسی جنت کے چھوٹے سے پوتے کے پیچھے پڑ گیا تھا...... اور تم نے ہارون کی شکار والی بندوق سے اس کتے کو شوٹ کیا تھا۔‘‘

’’بے حد دلچسپ منظر تھا وہ سب جمع ہو گئے تھے اور تمہاری بہادری کی داستان پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔‘‘ بھابی اب ہنس رہی تھیں۔

’’جی جناب!‘‘ وہ اٹھلائی تھی۔ ’’میں اسی ماسی جنت کی بات کر رہی ہوں۔‘‘

’’تو ماسی جنت اس میں کہاں آ گئی سجدہ ڈیر؟ کیا وہ ویسا ہی پاگل کتا جیسا اس کے پوتے کے پیچھے پڑا تھا وہ شارق عباس کے پیچھے لگا دے گی...... تاکہ وہ ایم پی اے کی سیٹ پر الیکشن نہ لڑ پائے۔‘‘ نومہ ہارون کا لہجہ اس عرصہ میں پہلی بار استہزائیہ ہوا تھا۔

’’اوں ہوں! ڈیر بھابی...... دماغ کے گھوڑے کو اس دشت میں دوڑائیں...... جدھر میں دوڑا رہی ہوں۔‘‘

’’میں سمجھی نہیں سجدہ...... تم کہنا کیا چاہتی ہو؟‘‘

''آئی وانا جسٹ سے...... ماسی جنت شارق عباس کے شہر والے بنگلے پر کام کرتی ہے......؟''

''تو پھر؟'' نومیہ بھابی نے سوالیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

''پھر یہ کہ شارق عباس کو سجدہ اسحاق سے اب کوئی بچا نہیں سکتا۔''

اور اس کی اس آخری بات کو سن کر نومیہ ہارون کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

وہ اتنا تو جانتی تھیں کہ ان کی یہ اکلوتی نند بے حد بہادر تھی۔ اتنی بہادر کہ دشت تو دشت دریا میں بھی گھوڑے دوڑا دے۔ ہاں جی سجدہ اسحاق ہر فن مولا ہی تو تھی۔

☆☆☆

''بھائیوں بہنوں! آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ہرن پر ٹھپہ مار کر آپ لوگوں نے پی ڈی ایس پارٹی کو جتوا دیا تو...... ہم بے روزگاروں کو روزگار دیں گے، صوبے میں پھیلے کاپی کلچر کا خاتمہ کر دیں گے......اور سب سے بڑھ کر سندھ کے اندر پینے کے صاف پانی کا جو مسئلہ ہے، اس کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''شارق عباس زندہ باد...... ابڑو صاحب زندہ باد۔''

اسٹیج پر کھڑے اپنے لیڈر کی تقریر سن کر مجمع میں بکھرے کارکن جوش سے نعرے لگانے لگے۔

دیوار گیر ایل ای ڈی پر اپنی آنکھیں جمائے قالین پر پھسکڑا مارے بیٹھی سردار بانو نے اپنے سامنے پڑی پلیٹ میں سے آخری پکوڑا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے مسکراہٹ دبالی تھی۔

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آگے جوش خطابت میں وہ زندہ باد لیڈر کیا کہنے والا تھا۔

''میرے بھائیوں بہنوں! میں اس پیار کا دل سے ممنون ہوں......آپ کو وہ سب ملے گا جس کا آج میں وعدہ کرتا ہوں......میں جانتا ہوں آپ سب لوگ کتنی مشقت کر کے آج ادھر جمع ہوئے ہیں۔ اس لیے جلسے کے اختتام پر فی فرد ہر بندے کو دو دو ہزار روپے ملیں گے...... بریانی اور قورمے کا بندوبست۔''

''آھوں......آھوں۔''

کچھ غلط ہونے کا احساس ساتھ کھڑے سہیل فاروق کے اچانک کہنی مارنے پر ہوا تھا۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

پارٹی کے گانے پر رقص کرتے کارکنان کو گویا سانپ سونگھ چکا تھا۔

''ہی ہی ہی!'' اور ادھر ہنستے ہنستے سردار بانو کے پیٹ میں بل پڑ چکے تھے۔

اس نے اس قدر چالاکی کے ساتھ درمیان سے تقریر چینج کی تھی کہ شارق عباس دھیان دیے بنا پڑھتے چلے گئے تھے۔

''معذرت چاہتا ہوں ......میں ، میں مزید خطاب نہیں کر پاؤں گا۔ استھما کا اٹیک اچانک ہی پڑتا ہے مجھے۔''

وہ اب کھانستے ہوئے اسٹیج سے اترتے نظر آرہے تھے۔

کس نام سے پکاروں، کیا نام ہے تمہارا؟
بریانی، قورمہ بانٹنا کام ہے تمہارا

شارق ولا کے لاؤنج میں بیٹھی سردار بانو جھوم اٹھی تھی۔

''اے مائی......'' سیڑھیوں سے نیچے آتی شافعہ کی نظر اچانک اس پر پڑی۔ ''یہ کیا ہر وقت ٹی وی کے آگے جمی رہتی ہو۔ جا کر لنچ لگاؤ میرے لیے۔'' شافعہ ایوب نے اپنے نئے تراشیدہ بالوں کو جھٹکتے ہوئے آرڈر دیا تو سردار بانو دانت پیستی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

آئینہ دیکھ کر خیال آیا
ہم کو اس گھر میں جانتا ہے کوئی؟

پورے پندرہ منٹ بعد جب وہ اپنے چہرے و ہاتھوں پر لوشن ملنے کے بعد باہر آیا تو آئینے پر نگاہ پڑتے ہی گنگنا اٹھا۔

''جانتے ہیں ہم دونوں ہی تم کو اچھی طرح سے

جانتے ہیں، تم تو ہماری جان ہو۔'' اس کی سانولی رنگت دیکھ کر رتم راج کا لہجہ شہد ٹپکا رہا تھا۔

''یار! مگر اس سے کیا ہوگا۔'' سدا رنگ کے عقب میں کھڑے ہوئے جیتن کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔

''تم تو اس طرح بھی اچھے خاصے ہینڈسم لگ رہے ہو۔''

''ایسا کرو، یہ دونوں چیزیں بھی پہن لو تم۔'' دراز سے کچھ نکال کر نے اس کی جانب اچھالا۔

''جیتن ...... یو ایڈیٹ۔'' وہ جیتن کو بے ساختہ گھور گیا تھا۔

''اس کا مطلب تم میرے کلین شیو سے بھی جیلس ہو۔'' سدا رنگ نے قہقہہ لگایا۔

''و جیلس نہیں یار۔'' جیتن کان کھجاتے ہنسا۔

''ہم قربان ہیں تم پر...... پرنتو جہاں بات سندریوں کی ہو...... وہاں تم جیسوں پر پہرے لگائے ہی پڑتے ہیں۔''

''آئی انڈر اسٹینڈ ......! بٹ اس سب کے باوجود بھی اگر تم دونوں کو چھوڑ کر کوئی سندری مجھ جیسے پر اپنا من ہار بیٹھی تو پھر کیا کہو گے تم لوگ؟''

لفظ جیسے کو کھینچ کر ادا کرتا سیاہ داڑھی مونچھوں کو اپنے چہرے پر سجانے کے بعد وہ اب جیتن کے دیے ہوئے سیاہ لینسز اپنی آنکھوں میں لگا رہا تھا۔ جبکہ اس کی بات سن کر وہ دونوں ایک ساتھ جلبلا گئے۔

''تو پھر کیا...... ہم اس سندری کو شرافت سے اپنی بھابی جی مان لیں گے اور بھگوان سے پراتھنا کریں گے کہ وہ تم دونوں کی جوڑی کو سدا سکھی رکھیں۔'' جیتن نے دانت کچکچائے تھے۔

''اور اگر ایسا ہو گیا تو تم کیا کرو گے؟'' رتم نے اب اس سے پوچھا تھا۔

''میں؟'' سدا رنگ کی خوابناک آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

میں اس جھانسی کی رانی کو...... اس جودھا راجپوتانی کو...... اپنی جوہی (گھوڑی) کی پشت پر بٹھاؤں گا...... اور گوٹھ کی سیر کراتے اپنا دل اس کے قدموں میں دان کر دوں گا...... اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس سے کہوں گا

''بدلی میں چھپے اس چاند کو پہچان کر...... میرا دل چرا کر تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے، اس کا بدلہ تو پورا جیون نہیں چکا سکتا میں۔''

''ابے شیانے (سیانے) تو نے تو ادھر ہی نوٹنکی شروع کر دی ہے۔ وہاں چل کر بھی ضرور ہیرو کے موافق بڑھکیاں مارے گا تو......'' رتم اور جیتن نے لپک کر اس کی گردن اپنی گرفت میں دبوچ لی تھی۔

''ہاہاہا!'' سدا رنگ کا قہقہہ ان دونوں کی بے بسی پر خوب تھا۔

''کام ڈاؤن فرینڈز! اینڈ آئی وش کہ اپنا اپنا من تم دونوں پر ہارنے والیاں آج تم دونوں کو مل جائیں...... اور ہمیں وہ بہاروں کی ہم جولی مل جائے جو ہمارا من چرا لے آکر۔'' وہ مسکرایا۔

''کوئی تو ہو گی اس دنیا میں میرا من چرانے والی؟'' آخری بات کہتے اس سانولے شہزادے کے لہجے میں اتنی حسرت سمٹ آئی تھی کہ پاس کھڑا رتم وجے اور جیتن پانڈیا اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے تھے۔

جگ جگ جیوت سدحان باؤ شب نوراتری کی بدھائیاں ہوں۔'' ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی سیندور کی تھالی میں انگوٹھا، ڈبو کر سدحان کی سانولی پیشانی پر تلک کھینچتے ہوئے رتم نے خوشی سے اسے گلے لگا لیا۔

اور وہ اسے روکتا رہ گیا۔

☆☆☆

''آئی کانٹ ٹیل یو...... یہ سب کس درجہ انٹرسٹنگ ہو جائے گا ناں...... تم اس منورنجن میں ''ہوا سہیلی'' کے نام سے حصہ لو گی، ادھر اناؤنسمنٹ کے دوران تمہارا نام ہوا سہیلی پکارا جائے گا اور ادھر تمہاری تلوار کی بجلیاں کڑکیں گی، جانے اس روز کتنے بھلے منش تیرے روپ کی چھب دیکھ کر اپنا من ہاتھوں سے گنوا بیٹھیں گے ...... ہے ناں۔''

سائشی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کی تلوار بجلی کی طرح چلتی تھی اور اس کا روپ آری کی طرح کاٹتا تھا۔

اس نے تلوار چلانی اپنے باپ کے منشی کاکا چندن داس سے ہی سیکھی تھی۔ جن کی بیٹی سائشی کے ساتھ اس کی پکی دوستی تھی۔ گھڑسواری میں تو وہ تھی ہی ماہر کیونکہ اس کے بچپن کا بیشتر وقت اپنے بابا کے اصطبل میں گھوڑوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔

بندوق البتہ اس کو آٹھویں میں ادا نے چلانی سکھائی تھی۔ یوں لڑکوں والا ہر ہتھیار چلانا اس کو آتا تھا۔

اس دھان پان سی لڑکی کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بلا کی شہ سوار تھی۔ بغیر فوج کے ہی میدان مارنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ بہادر ہونے کے ساتھ وہ بلا کی ذہین بھی تھی۔ اس کے بیڈروم کے شیلف اس کی ٹرافیوں اور مختلف قسم کی میرٹ شیٹ سے بھرے پڑے تھے۔ جبکہ کمرے کی دیواروں پر جا بجا اس کی فل سائز تصاویر سجی تھیں۔ جس میں کسی تصویر میں وہ شکاری لباس زیب تن کیے بندوق تھامے کھڑی تھی۔ تو کسی میں راجھستانی شہزادیوں کی طرح گھنے بال پشت پر پھیلائے چمکتی تلوار سے وار کرتی نظر آرہی تھی۔

یعنی ہوا سہیلی قدیم دور کی جدید شہزادی تھی۔

☆☆☆

''استھما کا اٹیک یا معاملہ کچھ اور؟''

جس نجی چینل پر جلسے کے کوریج دکھائی جارہی تھی۔ نیوز بریک کا ٹائم ہوا تو خوش شکل سی نیوز کاسٹر اسکرین پر جلوہ افروز ہوتے ہی مسکرا اٹھی۔

''ناظرین تازہ ترین خبر سے آپ کو آگاہ کرتے چلیں...... جلسے میں خطاب کے دوران پی ڈی ایس پاکستان ڈریم سپورٹرز پارٹی کے چیئرمین شارق عباس ابڑو عجیب بوکھلاہٹ کا شکار نظر آئے۔

پارٹی چیئرمین کی تقریر سنتے پنڈال میں رقص کرتے کارکنان کے جوش پر پانی پھر گیا۔ انہوں نے کہا۔

''آپ سب کے پیار کا ممنون ہوں، فی فرد جلسے میں آئے ہر بندے کو واپسی پر میری طرف سے دو دو ہزار روپے دیے جائیں گے۔ بریانی قورمے کا بندوبست بھی ہے۔''

''سارے سچ اچانک زبان سے پھسلے تو پارٹی لیڈر استھما کے اٹیک کا بہانہ کر کے کھانستے ہوئے اسٹیج سے اترتے نظر آئے۔''

شارق ولا کے لاؤنج میں نیوز کاسٹر کی آواز برابر گونج رہی تھی۔

شافعہ بی بی کے ناشتے کی ٹرے سنبھالے سیڑھیاں چڑھتی سردار بانو کے سیاہی مائل لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

☆☆☆

''سہیل، ناظم کی سیٹ جیت چکا ہے۔ سدحان تم نے اس کو مبارک باد دی......؟''

اپنے نئے کانٹریکٹ کے سلسلے میں اس کو ملائیشیا جانا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کی فلائٹ تھی۔ وہ آفس سے گھر تیار ہونے آیا تھا۔ جب لاؤنج میں سہیل اور شافعہ کے ساتھ بیٹھے پاپا نے روک کر اس کو مخاطب کیا۔ پاپا آج صبح ہی گاؤں سے شہر پہنچے تھے۔

''آں...... ہاں کیوں نہیں پاپا۔''

''کانگریچولیشن سہیل'' سدحان اس کو مبارکباد دینے کے بعد اس کی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''شافعہ! آپ سدحان کے لیے بھی کافی بنائیں بیٹا'' شارق عباس نے اس کی بیوی کو حکم دیا۔

سدحان نے وجیہہ چہرے پر اک رنگ آکر گزر گیا۔

''سنا تم نے! میرے لیے کافی شافعہ بنائے گی؟ شافعہ کون ہے اور ہمارے درمیان کہاں سے آ گئی؟ میں آفس سے لوٹتا تو میرے لیے کافی تم اپنے ہاتھوں سے بناتیں...... دس از ٹو مچ تم، مجھے نہیں ملیں...... اگر تم کو میری زندگی میں نہیں آنا تھا تو...... تو تم مجھے ملی ہی کیوں تھیں؟'' کرب سے سوچتے ہوئے وہ اپنے لب کاٹ گیا۔

سدحان کے لیے ایتھوپین کافی میں شہد ملاتے ہوئے شافعہ کی نگاہیں سہیل فاروق سے جا ملیں۔

دونوں نے کن اکھیوں سے اس قیس کی سمت دیکھا تھا اور پھر ایک دوجے سے نظریں ملاتے ہوئے معنی خیزی سے مسکرا دیے۔

''خیر رہی شافعہ بی بی! آپ کے سیاں جی تو دیوداس بنے بیٹھے ہیں۔'' سہیل نے شافعہ کے سیل پر ٹیکسٹ کر دیا۔ وہ کافی میں شہد گھول چکی تھی۔'' سو سہیل کا مسیج پڑھتے ہوئے جو مسکراہٹ اس کے چہرے کا حصہ بنی تھی، اسی مسکراہٹ کے سنگ ...... کافی کا مگ سدحان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

''نو تھینکس ...... میرا موڈ نہیں ہے۔'' شافعہ کی آنکھوں میں دیکھے بغیر انکار کرتا وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''پاپا! میں چینج کر لوں ...... ایرپورٹ کے لیے بھی نکلنا ہے مجھے۔'' سیاہ کوٹ بازو پر ڈالتا وہ سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔

اور شارق عباس سامنے بیٹھی بہو سے نگاہ چرا گئے تھے۔

''ایم سوری بیٹا ...... شاید وہ تھک گیا ہے۔'' شافعہ سے معذرت کرتے ہوئے وہ خود بھی وہاں اٹھ گئے تھے۔

یہ جانے بغیر کہ ان کے جانے کے بعد شافعہ اور سہیل کی مشترکہ ہنسی لاؤنج میں گونج اٹھی تھی۔

''شافعہ ایوب، شارق عباس کی بہو بعد میں بنی اس سے قبل وہ سہیل فاروق کی محبت تھی۔

لیکن یہ لالچ بھی ناں انسان سے کیا کچھ نہیں کروا لیا کرتا۔ شارق عباس کے کاروبار میں ان کے دیرینہ دوست ایوب ساریو کے پچیس فیصد شیئرز تھے، ان شیئرز کو محض اپنے نام کروانے کے خیال سے شارق عباس نے اپنے اکلوتے لخت جگر کے لیے ایوب ساریو سے ان کی بیٹی شافعہ کا رشتہ مانگ لیا تھا۔

شافعہ ایوب نے سنتے ہی انکار کر دینا چاہا تھا۔

لیکن سہیل نے اس کو ایسا کرنے سے روک دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی جانو؟ تم انکار کیوں کر رہی ہو؟''

''سہیل! تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ میں محبت تم سے کرتی ہوں ...... اور شادی تمہارے اس کزن سدحان کے ساتھ کر لوں ......؟''

''ڈارلنگ! تم کیوں بھول رہی ہو کہ کبھی تم بھی سدحان کے مداحوں میں شامل تھیں۔''

سہیل نے شافعہ کو اس ریسٹورنٹ میں بلایا تھا جس میں اکثر ہی وہ لوگ ملا کرتے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے جب سہیل فاروق نے اچانک اس پرانی بات کا طعنہ مار کر شافعہ ساریو کو جانے کیا کچھ یاد دلا دیا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے طلسماتی دھند میں لپٹی وہ خواب ناک شب آ گئی تھی۔

جس رات شہر کے مشہور بینکوئٹ میں سدحان کی برتھ ڈے پارٹی منائی گئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب شافعہ نے کالج اور سدحان نے یونی کو نیا نیا جوائن کیا تھا اور ان دنوں سدحان کے لیے ایک بات سرکل میں بے حد مشہور تھی کہ اس کو اپنی زندگی میں اس لڑکی کا انتظار تھا جس کو دیکھ کر سدحان کو اس سے پیار ہو جاتا۔ اس رات پارٹی میں بھی سدحان کے تمام فرینڈز اور کزن کے درمیان یہ ہی ایک موضوع زیر بحث تھا۔

جب بینکوئٹ کے ڈی جے نے کسی اولڈ سے انڈین سانگ کو چن کرانی ہی تیار کردہ میوزک پر لگایا تھا۔ تب سہیل فاروق کی سامنے والی کرسی پر بیٹھی گرین نائٹ پارٹی گاؤن میں ملبوس شافعہ ایوب۔

بلوٹو پیس میں بجلیاں گراتے سدحان شارق کو دیکھتی رہ گئی تھی، وہ سافٹ ڈرنک کا گلاس تھامے بے حد اچانک ڈانسنگ فلور کی طرف بڑھا تھا۔

☆☆☆

''سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ آفس سے آتے ہی صوفے پر ڈھے گیا تھا۔

سردار بانو کے ساتھ مل کر لاؤنج کی ڈسٹنگ

کرتی ماسی جنت گھبرائی سی اس کے پاس چلی آئی۔
''ہوں، لگتا ہے ہلکا سا ٹمپریچر ہے، خیر باقی سب لوگ کہاں ہیں؟'' آنکھیں کھولے بغیر ہی اس نے پوچھا۔
''سائیں! بڑے صاب سہیل بھاؤ کے ساتھ ابھی ابھی نکلے ہیں اور شافعہ بی بی۔'' قبل اس کے ماسی جنت اپنی بات مکمل کرتی۔ سیڑھیوں پر نازک ہیلز کی ٹک ٹک سنائی دے گئی۔
''لیجیے سائیں! شافعہ بی بی آ گئیں۔'' اس اطلاع پر سرخ آنکھیں کھولتے ہوئے وہ صوفے پر لیٹے لیٹے ہی اپنا چہرہ سیڑھیوں کی جانب موڑ گیا تھا اور جیسے اس کے ساتھ ہی ویران دل میں چراغاں سا ہو اٹھا۔لمحوں کا فریب صدیوں پر محیط ہو گیا تھا۔
آج پھر شافعہ کے چہرے کی جگہ اس جوگن کے مکھڑے نے لے لی تھی۔ ہرنی جیسی آنکھوں میں رچ کر کاجل ڈالے وہ سدحان کے ہوش اڑا لے گئی تھی۔
اورنج اور پرپل کلر کی میکسی میں ملبوس وہ اس ساحرہ کو دیکھتا ہی تو رہ گیا۔ وجیہہ چہرے پر وہ رنگ بکھرے کہ......
کونے میں سجے پیتل کے بڑے سے گلدان پر کپڑا مارتی ماسی سردار بانو بھی اس شخص کے چہرے کے رنگوں کو دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

''اے ہوا سہیلی! تمہارا من نہیں کرتا، کسی کو تم سے پریم ہو جائے؟'' وہ براؤن کوٹ شوز میں جلدی جلدی اپنے پاؤں پھنسانے میں مصروف تھی۔ جب ساکشی اس کے قریب ہوتے گنگنائی۔
''نہیں۔'' کوٹ شوز پہننے کے بعد وہ اب اپنے لمبے گھنے بالوں میں ہیئر برش پھیرتے ہوئے نفی میں گردن ہلا گئی۔
''بلکہ میرا من کرتا ہے کہ میری تلوار کی کاٹ کے ساتھ کوئی اپنا من الجھا بیٹھے۔'' وہ گہری معنی خیز مسکان لبوں پر سجائے بولی۔
''اوہاں! مجھ کو یاد آ گیا۔'' ساکشی نے فوراً سر پر ہاتھ مارا۔
''تم کو اس جدید دور میں کسی قدیم راجکمار کا انتظار ہے......؟'' ہے ناں......ہاؤ فنی؟'' اس نے مذاق اڑایا۔
''اس میں اس طرح ہنسنے والی کیا بات ہے، اس پورے جہاں میں......کوئی تو ہوگا ایسا میرا من چرانے والا۔'' اس کی ہنسی کمرے میں گونجی تھی۔
''تم کو یاد ہے ناں اس منور بجن کے دوران تم کو میرا کام کرنا ہے۔'' اپنی خوب صورت آنکھیں ساکشی کی آنکھوں میں گاڑ کر کہا۔
''یاد ہے......یاد ہے......'' ساکشی مسکرائی تھی۔ اور وہ دونوں ہنستی ہوئی باہر آ گئیں۔

☆☆☆

خوب صورت پریوں کے جھرمٹ میں گھرا گانے پر پھرتی سے اسٹیپ لیتا وہ اپالو کئی لڑکیوں کے دل ایک ساتھ دھڑکا گیا تھا۔
اس کی خواب ناک پیاسی نگاہیں اس چہرے کی متلاشی تھیں جس کو دیکھ کر وہ اپنا قرار کھو بیٹھتا۔
وہ عجیب تھا اور اس کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب۔ یہاں پارٹی میں جو اتنی خوب صورت خوب صورت لڑکیاں اپنا دل اس کو دیکھ کر ہار بیٹھی تھیں۔ ان پر تو ایک نگاہ غلط بھی ڈالنا گوارا نہ کی تھی اس نے......بلکہ اسے تلاش تھی تو اس کی جس کو دیکھ کر وہ اپنا من لٹا بیٹھتا۔
اس پارٹی میں سہیل فاروق بھی تھا۔ سدحان شارق کی آنکھوں سے چھلکتی پیاس کا نوٹس لیتے ہوئے اس نے مسکرا کر اپنے ہاتھ میں تھاما جام لبوں سے لگا لیا تھا اور اپنی نگاہیں شافعہ ایوب کے چہرے پر جما دی تھیں۔
شافعہ اس کی کلاس فیلو تھی اور سہیل دل ہی دل میں اس کو چاہتا تھا۔
سہیل، شارق عباس کے مرحوم سوتیلے بھائی کا اکلوتا بیٹا تھا......اور شارق عباس کے اکلوتے بیٹے سدحان ابڑو سے بے پناہ جیلس بھی تھا۔ سہیل فاروق

ہی تھا جو پوری پارٹی میں سدحان کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

''کم آن سہیل! لگتا ہے۔تم نے آج پی رکھی ہے۔اتنی پرانی باتیں کیوں دہرا رہے ہو تم ......''
سہیل کی چوٹ پر وہ بل کھا کر رہ گئی تھی۔

''ڈارلنگ! تم تو برا ہی مان گئیں۔'' سہیل نے رک کر شانے اچکائے۔''میں نے یونہی ایک بات کہی تھی کہ سدحان کی برتھ ڈے پارٹی میں اس کی شاطرانہ ادائیں دیکھ کر تم بھی اس کی فین بن چکی تھیں۔یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ سدحان نے نو لفٹ کروا دی ورنہ میرے پرپوز کرنے سے قبل ہی تم اس کی ہو جاتیں۔''

''اوہو...... سہیل۔'' شافعہ نے اس کو ٹوکا۔''تم یہ بتاؤ۔اب آگے کیا کرنا ہے..... ماضی دہرانے سے کیا فائدہ۔''

''آگے.....؟'' وہ رک کر مسکرایا۔

''تم ایوب انکل کی بات مان لو۔'' اس نے اس کو نیا راستہ دکھایا۔

''میں پاگل نظر آتی ہوں تمہیں؟'' شافعہ برا مان گئی۔

''نہیں!'' وہ ہنسا۔''سدحان پاگل نظر آتا ہے مجھے..... وہ تم کو بیوی کی حیثیت کبھی بھی نہیں دے گا۔شرط لگا لو مجھ سے۔''

''اور اس سے کیا ہو گا..... پوری زندگی اسی طرح جھک مارتے گزر جائے گی۔'' شافعہ اس کو گھور کر بولی۔

''ریلیکس! آپ کی زندگی ہمارے ساتھ گزرے گی.....بس جو ہم کہیں، ویسا ہی کرتی جائیں۔''

''اور آپ جناب کیا کہتے ہیں؟'' دونوں کہنیاں میز پر جمائے ہاتھ کی مٹھی پر اپنی نازک ٹھوڑی ٹکائے اس نے محبت پاش نظروں سے سہیل فاروق کا چہرہ دیکھا تو..... وہ اس کی آنکھوں میں ڈوب کر گویا ہوا۔

''سو سمپل! شارق چاچا سائیں جب ایوب انکل کے ٹوئنٹی فائیو پرسینٹ شیئرز حاصل کرنے کے لیے سدحان کا نکاح تمہارے ساتھ کروا سکتے ہیں تو......تم حق مہر کے ذریعے پورے ففٹی پرسینٹ شیئرز وصول کرنے کی خاطر یہ شادی کیوں نہیں کر سکتیں؟''

''اور شادی کے بعد......؟'' شافعہ ساریو کا لہجہ سرسراتا سا تھا۔

''کم آن مائی لو......شادی کے بعد خلع بھی تو لی جاتی ہے۔''

''سہیل صاحب؟'' شافعہ نے اس بار اٹھلا کر اسے پکارا۔

''جان سہیل؟'' وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

''آپ بے حد شاطر ہیں۔''

''ہاہاہا......!'' سہیل کا قہقہہ جاندار تھا۔

''جو بھی کچھ ہیں، آپ ہی کی خاطر ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ بولا تو شافعہ ایوب ہنس پڑی۔

☆☆☆

''الوژن ......الوژن!'' وہ جو سیڑھیاں اتر کر نیچے آ چکی تھی۔سدحان کے قریب آ کر چڑانے والے انداز میں گنگنا اٹھی۔

وہ اتنے عرصے میں اس کی کمزوری بھانپ گئی تھی۔

سدحان کا چہرہ لمحوں میں سپاٹ ہوا تھا۔لبوں پر کھلتی مسکراہٹ یک لخت دم توڑ گئی۔

''کہیں جا رہی ہو تم......؟'' وہ یونہی بات بدلنے کی غرض سے بولا تھا۔وہاں کھڑی سردار بانو نے حیرت و دلچسپی سے دونوں میاں بیوی کی گفتگو کو سنا۔کیونکہ اس کی یہاں ملازمت کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔جب وہ دونوں ایک دوجے سے یوں مخاطب ہوئے تھے۔

''ہاں۔ایک پارٹی میں جا رہی تھی۔'' وہ اترائی۔

''بی بی! آپ آج نہ جائیں، سدحان سائیں کو بخار ہے۔'' اس کو دروازے کی جانب قدم

بڑھاتے دیکھ کر پیچھے سے ماسی جنت نے آواز دی تھی۔
''کیا کہا......؟'' اس نے بھنویں اچکائیں۔
''جی بی بی۔جی! سدحان سائیں کی طبیعت ٹھیک نہیں، آج پارٹی میں مت جائیں۔'' ماسی جنت کے لہجے میں اپنے چھوٹے مالک کے لیے فکر تھی۔
''یونان سینس! بڑھیا، مجھے روک رہی ہو تم۔'' وہ بھڑک کر بولی۔ ''پارٹی میں نہ جاؤں تو کیا تمہارے سائیں کے سرہانے بیٹھ کر سر دباؤں میں اس کا......؟''
''الس اوسم جوک۔سر دبانا کجا۔'' وہ جو سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا شافعہ کی بات پر سلگ کر گویا ہوا۔
''تم جیسی بیوی سے تو گلا دبانے کی امید ہی کی جاسکتی ہے۔'' اور اس بات شافعہ کو پتنگے لگے تھے۔
''وائے ناٹ مسٹر ابڑو...... میں آپ کا گلا شوق سے دبا دیتی اگر آپ نے یہ حق مجھے دیا ہوتا۔'' اس نے پلٹ کر جوابی کارروائی کی۔
''گلا دبانا تمہارے لیے کون سا مشکل کام ہے...... اگر بس چلے تو تم تو بندوق سے اڑا دو مجھ کو۔'' دانت پیستے مسکرایا۔
''اجی مفت میں ہم بدنام کیوں ہوں۔'' اپنی بائیں ابرو کو کمان کی طرح اٹھاتے ہوئے وہ ہنسی۔
''ایسی خطائیں تو ان پر ہی سوٹ کرتی ہوں گی۔جن کی خاطر یہ جوگ لیے پھر رہے ہیں آپ؟'' شافعہ بھی کون سا کم تھی۔تاک کر طنز کیا تھا اس نے۔
اور تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔
''ہک ہاہ!'' اس لمبی سانس لی۔
''کیا کہنے شافعہ بی بی تمہارے، اگر ہمارے لیے خطاؤں کو سر انجام دینے والی ہستی یہاں موجود ہوتی تو پھر آپ کا یہاں کام ہی کیا تھا؟'' اس کی آنکھوں جھانکتے ہوئے وہ بھی لمحوں میں اس پر اس کی اوقات جتا گیا۔
''مائی فٹ!'' شافعہ بکتی جھکتی شارق ولا سے نکل گئی۔ صوفے سے کوٹ اٹھائے بنا وہ سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔
''یہ کیا ماجرا ہے بھئی؟'' ان دونوں کے وہاں سے جانے کے بعد سردار بانو ماسی جنت کے پاس آ کھڑی ہوئی۔
''ماجرا اس چھوکری (لڑکی) کا ہے سدحان سائیں جس سے محبت کرتے تھے۔'' جنت ماسی نے اداس لہجے میں اس کو بتایا تھا۔

☆☆☆

راجن داس بھیا ناظم کی سیٹ کیا ہارے، بابا دو دن تک گھر ہی نہ آئے تھے۔
سجدہ کی یونیورسٹی کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں سو تیسرے دن مجبوراً وہ بابا سے ملے بنا ہی ادا کے ساتھ ہاسٹل واپس آ گئی تھی۔ وہ یونیورسٹی میں ایم بی اے سیکنڈ ایر کی اسٹوڈنٹ تھی۔
آج جمعرات تھی اور کل اس کی کلاس تھی سو کچھ سوچ کر اس نے صوبے سے لیے نمبر پر ماسی جنت کو کال ملا ڈالی تھی۔
''سجدہ بی بی آپ؟'' فون پر سجدہ بی بی کی آواز سن کر ماسی جنت ورطۂ حیرت میں پڑ چکی تھی۔
لیکن اصل سناٹا تو دوسری طرف تب چھا گیا تھا جب سجدہ بی بی اپنا مدعا زبان پر لے آئی۔
احسان کا بدلہ احسان ہی ہوا کرتا ہے۔سو ماسی جنت کو بھی وہ بات ماننا ہی پڑی تھی۔ جو سجدہ اسحاق نے اس سے کہی تھی۔
ماسی جنت کو منانے کے بعد اپنی کچھ مطلوبہ چیزیں خریدنے کے ارادے سے وہ ہاسٹل سے مارکیٹ کے لیے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

سدحان کی طرف سے شافعہ کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کی صورت میں شارق عباس نے اس کو اپنی دولت سے عاق کرنے کی روایتی سی دھمکی دے ڈالی تھی۔
''آپ ایسا نہیں کر سکتے بابا...... یہ بات کہتے ہوئے آپ کو اپنے سیاسی کیریئر کے بارے میں سوچنا

چاہیے۔" وہ زہرخند سا مسکرایا۔
"تم کو آخر کس بات کا زعم ہے؟" وہ بپھرے۔
"ایک مجنوں کو عاق کرنے کے جرم میں۔ میں ایم پی اے کی سیٹ تو ہارنے سے رہا؟"
"ہاہا! پاپا۔" آپ کا یہ لفظ مجنوں یونو کتنی مٹھاس ہے اس ایک لفظ میں میرے لیے۔" وہ ہنسا۔
"جسٹ شٹ اپ سدحان! دیوانے پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" سیڑھیوں سے نیچے آتے سہیل سے نگاہ چراتے ہوئے انہوں نے خود کو بے بسی کی انتہا پر کھڑے محسوس کیا۔
"تم...... تم کو دیکھ کر یقین نہیں ہوتا...... کہ تم اس صدی کے نوجوان ہو۔" دونوں مٹھیاں بھینچتے ہوئے شارق عباس کا ضبط چھلکا۔
سہیل اپنی مسکراہٹ چھپانے کی خاطر سر جھکاتے کنپٹی کھجا گیا۔ اس نے محبت میں کسی کو اتنا خوار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جتنا خوار یہ سدحان شارق ہوا تھا۔
وہ سیڑھیوں کی جانب مڑا ہی تھا جب پاپا کی پکار نے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔
"سدحان!"
وہ رک ضرور گیا لیکن پلٹ کر دیکھا نہیں۔
میں نے کل دوپہر کو شافعہ کے ساتھ تمہارا نکاح طے کر دیا ہے، انکار کی صورت میں تم کل شام سے پہلے یہ گھر چھوڑ کر جا سکتے ہو۔" سرد لہجے میں پاپا نے اطلاع دی۔
وہ ٹکر ٹکر اپنے باپ کا چہرہ تکتا رہ گیا تھا۔
جنہوں نے اپنے سوتیلے بھتیجے کے سامنے اس کے وجود کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔
تجھ سے تو دل کے پاس ملاقات ہو گئی۔
میں خود کو ڈھونڈنے کے لیے دربدر پھرا
سدحان شارق نے اپنی آنکھوں کے آگے سرمئی دھند کو پھیلتا محسوس کیا۔
☆☆☆
میلے میں آتے ہوئے رتنم اپنی تلوار بھی ساتھ لایا تھا۔ کیونکہ اس کا ڈانڈیا راس میں حصہ لینے کا پکا ارادہ تھا۔
ڈانڈیا راس یہ ایک قسم کے رقص کا نام ہے۔ پچھلے زمانوں میں ہندو راجپوت جب کوئی جنگ جیت کر آتے تھے تو راجپوت عورتیں ان کے ساتھ ہاتھوں میں تلواریں لے کر فتح کے جشن کے طور پر ناچتی تھیں۔
گجرات کے لوگوں نے البتہ اس میں سے تشدد کا عنصر نکال دیا۔ اور تلواروں کی جگہ لکڑی کی ڈانڈیاں استعمال کرنے لگے۔ چوں کہ زخمی ہونے سے ڈرتے تھے۔ ڈانڈیا راس راجپوتوں کا پسندیدہ رقص تھا اور یہ رقص راجستھان سے ہی گجرات میں آیا تھا۔ گوٹھ مٹھار جا راجستھان کا حصہ نہیں تھا۔ یہ صحرائے سندھ کے ریتیلے علاقے میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مگر ادھر راجپوت ہندوؤں کی کثرت تھی۔ سو ہر سال نوراتری کے میلے میں ڈانڈیا رقص لازمی ہوتا تھا۔
رتنم نے رج کے رقص میں حصہ لیا تھا۔ اس کی پریکٹس اچھی تھی۔ لیکن قسمت نہیں کیونکہ ڈانڈیا، راس میں جو لڑکی اس کی پارٹنر بنی تھی۔ وہ بالکل سندر نہیں تھی۔ یہ ہی وجہ تھی پورے رقص کے دوران رتنم کے چہرے کے زاویے بگڑتے ہی رہے۔
یہ الگ بات تھی کہ اس کی روہانسی صورت دیکھ جیتن اور سدحان نے اس کا خوب خوب ریکارڈ لگایا تھا۔
"پکڑو...... مردتم۔" رقص ختم ہونے کے بعد رتنم نے بے حد خراب موڈ کے ساتھ اپنے ساتھ لائی تلوار سدحان کے ہاتھوں میں پکڑائی تھی۔ اور خود اپنے چوڑیوں کے اسٹال پر جا بیٹھا تھا۔
"آؤ۔ تمہیں تلوار بازی و گھڑسواری کا مقابلہ دکھاؤں۔"
ٹی اسٹال سے گڑ والی چائے پینے اور سندیش مٹھائی والے کے ٹھیلے سے چم چم اور گلاب جامن خرید کر کھانے کے بعد جیتندر نے دو ٹکٹ خریدے تھے

اور پھر سد حان کا ہاتھ تھام کر اس پنڈال میں داخل ہو گیا تھا۔

جہاں قدم رکھنے کے بعد سدا رنگ کے ہوش اڑ گئے تھے۔

اس نے اپنا بنا کر چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے، کیا دہائی ہے

☆☆☆

''صاحب! میں نے ساری عمر کی خدمت کی ہے اور آج ایک عرض لے کر حاضر ہوئی ہوں...... مجھے امید ہے آپ میرا مان ضرور رکھ لیں گے۔''

پورے دو دن گوٹھ میں گزارنے کے بعد شارق عباس آج صبح ہی شہر لوٹے تھے۔ اور اسی روز دو پہر کو ماسی جنت ایک عمر رسیدہ سی عورت کو اپنے ساتھ لیے ان کے پاس آ پہنچی تھی۔

کیا بات ہے مائی؟'' شارق عباس کے ساتھ بیٹھا سہیل فاروق اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''سائیں! وہ مجھے وڈے صاب سے کچھ بات کرنی تھی۔'' ماسی جنت شارق عباس کے قدموں سے کچھ ہی فاصلے پر نیچے قالین پر بیٹھ گئی تھی اور اس کے ساتھ آئی اس عورت نے بھی اس کی تقلید کی۔

''کیا بات ہے مائی جنت؟ آج تقریر کرنے کا موڈ ہو رہا ہے کیا؟'' کان سے کارڈلیس ہٹاتے ہوئے شارق عباس مسکرائے۔

''صاحب ایک عرض لے کر حاضر ہوئی ہوں۔''

''ارے عرض کی کیا بات ہے بابا...... تم حکم کرو۔'' بادامی کاٹن کے کلف لگے کرتا شلوار میں ملبوس شارق عباس خاصے خوش گوار موڈ میں تھے۔

''صاب! یہ میری پھپھی کی بیٹی ہے۔'' ماسی جنت نے خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھی اس گہری سانولی رنگت والی عورت کی سمت اشارہ کیا تھا۔

''صاب! اس بے چاری کا گھر سیلاب میں بہہ گیا۔ اس کا خاوند اور ساس بھی سیلاب میں ڈوب کر مر گئے۔ نمانی بے آسرا ہے، اسے روٹی اور چھت کا سہارا چاہیے۔ اگر آپ اس کو اپنے یہاں کام پر رکھ لیں تو۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' مائی جنت کے گلوگیر لہجے پر شارق عباس کا دل نرم پڑ گیا تھا۔

''تم اس کو کام پر رکھ لو...... اور شافعہ سے ملوا دینا اسے۔'' وہ کہہ کر اٹھ گئے۔

سہیل فاروق بھی ان کے پیچھے اٹھ گیا تھا۔

اور ماسی جنت کے ساتھ بیٹھی سردار بانو کے چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

☆☆☆

پورے چاند کی ٹھنڈی میٹھی روشنی میں صحرا کی ریتیلی زمین پر تیزی سے دوڑتے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اور فضا میں بلند تلواروں کی کھنک سن کر وہاں قدم رکھنے والے، ہر ذی نفس کو پہلا گمان وہاں پر چھڑی کسی جنگ کا ہی ہوتا تھا۔

لیکن پنڈال کے کنارے پر سجے مٹی کے دیوں سے کچھ فاصلے پر کھڑے وہ تمام تماش بین جانتے تھے کہ یہاں پر کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی بلکہ ادھر نوراتری کے میلے میں ہونے والا تلوار بازی کا پہلا مقابلہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مقابلہ چونکہ آٹھ لڑکیوں کے درمیان تھا۔ سو اس وقت مختلف قسم کے رنگ و نسل کے آٹھ گھوڑوں کی پشت پر آٹھ سندریاں بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔ یوں تو وہ آٹھوں ہی خوب صورت تھیں۔ مگر ان میں عربی نسل کی ایک بے حد خوب صورت سفید رنگ کی گھوڑی کی پیٹھ پر براجمان اس سندری کو دیکھ کر میلے میں آیا ہر شخص اپنی پلکیں جھپکنا بھول چکا تھا۔

کہ وہ سندر شہزادی تھی ہی بے مثال، اس نے راجکماریوں والا گیٹ اپ کیا تھا راجستھانی لباس کے ساتھ اسی ثقافت کے زیورات پہن رکھے تھے۔ سفید و میرون کلر کی گھاگرا چولی میں ملبوس اس راجکماری کے سولہ سنگھار دیکھ کر سدا رنگ کے ہاتھ میں تھمی رستم کی تلوار ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

وہ مبہوت سا اپنے سپنوں کی رانی کو تکتا رہ گیا تھا۔

سفید مرمریں کلائیوں میں اس نے جو بھر بھر کر

کانچ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کی شوخ کھنک سن کر سمتھار جا کی دھرتی کا دل بھی دھڑک اٹھا تھا۔

اس چندر بنسی راجکماری کی گھنی پلکوں کے چلمن سے وار کرتی آنکھوں کو دیکھ کر سدار نگ کو کھڑے کھڑے کسی شاعر کی دہائی یاد آئی۔

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

نگاہ آنکھوں سے ہٹی تو میرون لپ اسٹک سے سجے ان لبوں پر ٹھہر گئی۔

سنا ہے اس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پر الزام دھر کے دیکھتے ہیں

وہ سحر زدہ سا اس کی نازک پشت پر بکھری ناگن زلفوں کی جانب متوجہ ہوا۔

سنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اس کی
سنا ہے شام کو سائے گزر کر دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے رات اسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بام فلک سے اتر کر دیکھتے ہیں

ہاں اس سندر شہزادی پہ افق کے ستارے تک اپنا من ہار بیٹھے تھے سدار نگ کی طرح ......

☆☆☆

منصور کو ہوا ، لب گویا پیام موت !
اب کیا کسی سے عشق کا دعوا کرے کوئی

سدحان شارق کے لیے جس دار کو سجایا گیا۔ بھرے شہر کے سامنے اس کو اس دار پر سولی بھی چڑھا دیا گیا تھا۔

وہ اپنی بارات میں آئے ڈھول تاشے پیٹنے والے تماش بینوں کو سرخ آنکھوں سے تکتا رہ گیا۔ تمام مہمان ایوب ساریو اور شارق عباس کی طرف سے شامل ہوئے تھے۔ سدحان نے اپنے کسی ایک دوست کو بھی نکاح میں مدعو نہیں کیا تھا۔

اس کی تمناؤں اور ارمانوں کا خون اس کی نگاہوں کے بالکل سامنے ہوا اور وہ ہوا سہیلی کی جگہ شافعہ ساریو کو بیاہ کر شارق ولا لے آیا تھا۔

پھر پرانی خواہشوں نے خواب دکھلایا کوئی
سر کسی کے دوش پر تھا، اور یاد آیا کوئی ......!

یہ پل پل اوس میں بھیگتی رات اس کے تن کو راکھ بنا رہی تھی۔

ادھر حجلہ عروسی میں پھولوں سے مہکتی سیج پر شافعہ ایوب اس کی دلہن بنی بیٹھی تھی۔ وہ جانتا تھا شافعہ نے اپنے دل کو سدحان کے ارمانوں سے نہیں سجایا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے نام کا جوڑا پہن کر اس کی زندگی میں شامل ہو چکی تھی۔

شیروانی میں ملبوس سدحان شارق سگریٹ پھونکتے ہوئے لان میں ٹہلتا رہا۔

جبکہ ٹیرس کی ریلنگ تھامے کھڑے سہیل کی آنکھیں اس کے اضطراب پر مسکرا اٹھی تھیں۔

وہ جانتا تھا آج کی رات سدحان کا اپنی خواب گاہ میں جانے کا ارادہ نہیں تھا۔

☆☆☆

''یہ باہر کون لوگ آئے ہیں ......؟'' شارق عباس کے ڈرائیور کو روک کر اس نے پوچھ لیا۔

''مائی تمہارا اس سے کیا کام ...... تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' الطاف ڈرائیور نے اس نئی ملازمہ کو گھورا تو۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنس دی۔

''ارے بیٹا کاہے کو ڈانٹتا ہے۔ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی ......؟''

اور الطاف جو خود اس کی عمر کا تھا۔ سردار بانو کے منہ سے اپنے لیے لفظ بیٹا سن کر کھل اٹھا تھا۔

''وہ اماں کچھ نہیں۔'' الطاف ایک دم نرم پڑ گیا۔

''یہ سب شارق سائیں کے علاقے سے تعلق رکھنے والے گوٹھوں کے وڈیرے اور بزنس مین لوگ ہیں۔ الیکشن قریب آ رہا ہے ناں تو یہ ہی وہ لوگ ہیں جو سائیں کو ووٹ دے کر جتوائیں گے۔''

''او! اچھا ...... چھا ...... چھا!'' سردار بانو کی آنکھیں چمک گئیں۔

''ہاں!'' الطاف ہنسا تھا۔
''سائیں نے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے سب کو۔''
''آں ہاں بیٹا! دوپہر کا کھانا۔'' الطاف کی اطلاع پر وہ من ہی من میں چونک گئی تھی۔ اور پھر ڈرائیور کے وہاں سے جانے کے بعد سردار بانو کی سیاہ آنکھیں کچن کے دروازے پر آٹھہری تھیں۔
جہاں ہمزشارق عباس کا چائینز کک اس وقت کھڑا مہمانوں کے لیے کھانا تیار کررہا تھا۔

☆☆☆

تواتنی خوب صورت ہے
فدا دیدار پر تیرے
عشق کی داستاں جدا ہے میری
تو ہی دونوں جہاں ، بخدا ہے میری

میلے میں لگائے گئے میوزک سسٹم پر بجنے والا یہ پہلا ٹریک (نغمہ) تھا۔ جس کو رک کر سدارنگ نے بے حد غور کے ساتھ سنا تھا۔
اور اس کی بے تاب نگاہیں میدان میں ادھر ادھر اپنی سفید گھوڑی دوڑاتی اس جھانسی کی رانی کے چہرے پر گڑی رہ گئی تھیں۔
''گھوڑی نمبر چار پر بیٹھی مس ہوا سہیلی یہ کامپیٹشن جیت چکی ہیں۔'' وہ مقابلہ جیت چکی تھی۔ پردے کے پیچھے بیٹھے ججز کی اناؤنسمنٹ پنڈال میں گونجنے لگی۔
''ہوا سہیلی......'' سدارنگ کے لب پھڑپھڑائے تھے۔
لیکن دوسرے ہی پل وہ چونک گیا۔ کیونکہ اس کی آنکھوں نے منظر ہی ایسا دیکھا تھا۔
جونہی پنڈال میں اس کی جیت کا اعلان سنایا گیا۔ گھوڑا نمبر پانچ پر بیٹھی اس سانولی سی لڑکی نے بے حد اچانک اپنی تلوار سے اس سندر شہزادی پر وار کرنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔

☆☆☆

اے اجنبی آنکھوں والی لڑکی
کون ہو تم......؟
نہیں پہچانتا ہوں میں
کیا نام ہے تمہارا......
یہ تک کہاں جانتا ہوں میں؟
پھر بھی ہے اک راز، بتانا چاہتا ہوں میں
فقط یہ ہی تم کو، جتانا چاہتا ہوں میں
ہم دونوں نے کھیلی ہی نہیں جو بازی
میں نے تم سے وہ بازی ہاری ہے
سوائے میرے اس دل کے
اس گھر کی ہر چیز تمہاری ہے
ہاں تمہاری ہے......!

مہکتے پھولوں و چراغوں سے سجی اس حجلہ عروسی کے وسط میں کھڑے اس اپالو نے اپنی ہی لکھی اس نظم کے ایک ایک حرف کو اپنی نئی نویلی دلہن کے آگے اس درجہ سفاکی کے سنگ ادا کیا تھا کہ اگر اس وقت شافعہ ساریو کی جگہ سیج پر کوئی دوسری لڑکی بیٹھی ہوتی تو ضرور آج وہ اپنے مقدر کو رو پڑتی جبکہ ادھر صورت حال مختلف تھی۔ شافعہ کا پورا دھیان اپنی گود میں پڑے سیل فون کی طرف تھا۔ جس پر اس وقت سہیل فاروق کی کال آن تھی۔ (یہ سہیل نے ہی کہا تھا ان دونوں کے مابین کیا بات چیت ہوتی ہے وہ سننا چاہتا ہے)
وہ نظم جو سدحان شارق نے اپنی بیوی پر اس کی اوقات جتانے کی خاطر پڑھی تھی۔ اس نظم کا اک اک حرف شافعہ کے ساتھ ساتھ سہیل بھی سماعت کر چکا تھا۔
''ہا......ہا......ہا۔''
اپنے کمرے کی راکنگ چیئر پر نیم دراز سہیل فاروق، شارق چاچو کے نور نظر کی تباہ حالی پر قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا تھا۔

برباد ہونے کے اور بھی راستے تھے فراز
نجانے انہیں محبت کا ہی خیال کیوں آیا

سدحان شارق کی حالت پر سہیل کو یہ شعر خاصا حسب حال لگا تھا۔

☆☆☆

"دور ہٹو......"
وہ چونکہ قریب ہی کھڑا تھا اور حسن اتفاق کے اس کے ہاتھ میں رستم کی تلوار بھی تھی۔ سو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور قبل اس کے کہ وہ سانولی سی گھڑسوار اپنی تلوار اس نازک اندام مہ جبیں کی پشت میں گاڑ بیٹھتی۔ آگے بڑھ کر سدارنگ نے نا صرف اس کے وار کو ناکام بنایا تھا بلکہ غصے سے ایک زوردار ضرب بھی اس دشمن لڑکی کی تلوار پر دے ماری تھی۔
وہ جھانسی کی رانی جو اپنی جیت کی خوشی میں مسکاتی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی۔ مقابلہ ختم ہونے کے باوجود اپنی پشت پر تلواروں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز سن کر چونک اٹھی اور اپنی صراحی دار گردن موڑ کر ان دونوں کی جانب دیکھنے پر مجبور ہوگئی۔
یہ وہ لمحہ تھا جب سدارنگ اپنی تلوار سے اس لڑکی کی تلوار پر ضرب لگا رہا تھا۔
اور یہ منظر دیکھتے ہی اس شیرنی کی غزال آنکھیں شعلہ بار ہوگئی تھیں۔
کچھ آگے جا کر اس نے اپنی گھوڑی ایڑھ لگائی تھی۔ اور دوسرے ہی لمحے اچانک نیچے کود گئی۔
سدارنگ کھڑا اسے دیکھ ہی رہا تھا۔ جب پلٹ کر اچانک اس پر اپنی تلوار سے وار کر کے اس نے اس کو حیران ہی کر دیا تھا۔
ایک وہ ہی کیا، وہاں کھڑا ہر شخص دنگ رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ سدارنگ سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا جتین پانڈا بھی۔
وہ لڑکی پاگل تھی کیا؟ ایک تو سدارنگ نے اس کی جان بچائی تھی الٹا وہ اس کے ساتھ لڑ رہی تھی۔ یہ تو بھلا ہو رستم کا جس کی تلوار کو استعمال میں لاتے ہوئے وہ اگر بروقت اپنا بچاؤ نہ کر لیتا تو ضرور اس چندر جیسی راجکماری کے نازک ہاتھ میں تھمی تلوار کی نوک اس کی ناک میں گھس چکی ہوتی۔

☆☆☆

کوئی پوچھ لے تو میں کیا کہوں......؟
اسے کیا بتاؤں؟
یہ روز و شب تو جنم جنم پر محیط ہیں
میرے زخم...... زخم دل و نظر
مجھے اس جنم میں نہیں ملے
میرے رتجگے میرے ہمسفر
میرے ساتھ آج نہیں چلے
یہ مہیب وحشت و فکر جو ہے
میرے نقش نقش کی روح ہے
کوئی بے ثبات بیاں نہیں
یہ آتماؤں کا عکس ہے
یہ دیوتاؤں کا دھیان ہے
یہ جانے کیسی
صدی صدی کی اذیتوں کا گیان ہے
یہ عجیب میرے غم و الم
یہ نصیب سنگ سیاہ پر
یہ ورق ورق گڑے قلم
یہ کڑا احصار نیا نہیں
میرا انتظار قدیم ہے
میرا اس سے پیار قدیم ہے
یہ عجیب میری محبتیں......!

"سدحان! تم رات بھر جاگ کر کیا کرتے رہے؟"
رتجگوں کی تھکن اپنے مضبوط پروں میں سمیٹے وہ ٹوٹتے بدن کے ساتھ رات بھر جاگنے کے بعد صبح آفس جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آیا تھا۔
جب نوکیلے پتھر کی طرح لڑھکتا سوال پاپا کی طرف سے آ گیا۔
ٹوسٹ پر جیم لگاتے سدحان نے نظر اٹھائی تو نگاہ سیدھی سامنے والی کرسی پر بیٹھی شافعہ ایوب سے جا ٹکرائی۔ ساڑھے نو ماہ قبل ہی تو اس عورت کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا۔
"پاپا...... سوری۔" سدحان کو ایک لمحہ نہیں لگا تھا نگاہ چرانے میں۔

☆☆☆

اتنا تو مجھ کو بتا دے کھاؤں میں یا نہ؟

ہمزکو کچن سے ہٹادے چاہوں میں کچھ ملانا!

الطاف کے وہاں سے جانے کے بعد سردار بانو گنگناتی ہوئی پلٹی تھی اور پھر اس کے قدموں کا رخ اپنے اور ماسی جنت کے مشترکہ کوارٹر کی سمت تھا۔ جی ہاں اپنے کوارٹر میں پہنچ کر اس نے بیگ سے وہ پیکٹ نکالا۔ جسے اگر مہمانوں کے کھانے میں ملا دیا جاتا تو ان سب کے پیٹ میں یقیناً کالے بادل چھا جانے والے تھے۔

ایسے میں شارق عباس کی بیٹھک کا رنگ خاک جمنا تھا۔

اپنے مہمانوں کے ساتھ لان میں بیٹھے شارق عباس کو لاؤنج کی گلاس وال سے دیکھتی وہ کچن میں گھس چکی تھی۔

کیونکہ کھانا بنانے کے بعد ہمزا اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا اور کھانا سرو کرنے کی ذمہ داری ماسی جنت کے ساتھ سردار بانو کی تھی۔

سو ہمز کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بے حد آرام کے ساتھ اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔

آدھے سے زیادہ پاؤڈر اس نے مہمانوں کی ڈشز میں گھولا تھا۔ اور پھر بڑے ہی سلیقے کے ساتھ ماسی جنت کی مدد سے کھانا مہمانوں کو پیش کر دیا تھا۔

☆☆☆

''ابے تجھ کو تلوار چلانی نہیں آتی کیا......؟''

پہلے پہل پے درپے کیے جانے والے اس نازنین کی تلوار کے ہر وار کا جواب وہ اپنے بچاؤ کی صورت میں دیتا رہا۔

جب کچھ فاصلے پر کھڑے جیتن نے دور سے چلا کر اس کی مردانہ غیرت کو جوش دلانے کی سعی کر ڈالی تھی۔

''ابے گھامڑ ہے کیا، لڑکی سے پٹ رہا ہے؟''

وہاں پر کھڑا کوئی اور ہیرو بول پڑا تھا۔

ایسا نہیں تھا سدارنگ کو تلوار چلانی نہیں آتی تھی۔ اس کے دادا تلوار بازی میں خاصے مشاق تھے اور بچپن میں سدارنگ نے تلوار چلانی ان ہی سے سیکھی تھی۔ یوں وہ ایسا ماہر بھی نہیں تھا کہ جنگ میں سپاہی بن کر لڑنے چلا جاتا تو میدان مار کر ہی لوٹتا......اور نہ ہی ایسا اناڑی تھا کہ ایک لڑکی کے وار کا جواب اپنی تلوار سے نہ دے پاتا......لیکن وہ اب جیتن کو بھلا کیا بتاتا کہ جس سندر راجکماری کو دیکھ کر وہ اپنا من اس کے قدموں میں ہار بیٹھا تھا۔ اس پر وار کیسے کرتا۔

اپنی تلوار کے جوہر دکھاتی وہ جھانسی کی رانی باز نہ آئی تو مجبوراً سدارنگ کو بھی جنگجو شیر کا روپ دھارنا ہی پڑا۔

سو اس کا پہلا وار ہی اس ہوا کیلی کے لیے اس قدر اچانک و ناقابل فہم ثابت ہوا تھا کہ وہ نا صرف بمشکل اپنا بچاؤ کر پائی تھی بلکہ بچاؤ کی کوشش میں بری طرح لڑکھڑا بھی گئی تھی۔

اور یوں لڑکھڑاتے ہوئے اس کی نازک کمر سے نیچے کو آتی سیاہ کالکیں ایسے لہرا گئی تھیں۔ جیسے سمندر کے کنارے سیاہ ناگنیں رینگتی ہوں۔

ایک لمحے کے لیے تو سدارنگ کا دل ان گھٹاؤں میں الجھ کر ڈوب گیا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی پل وہ سنبھل کر دار پر دار کرتا چلا گیا۔ یوں متھارجا کی رنگیلی زمین پر اک نیا و دلچسپ مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔

بنا ٹکٹ والا شو تو اب شروع ہوا تھا۔ پنڈال میں موجود تمام لوگ راجپوتوں جیسی آن بان رکھنے والے اس سانولے شہزادے اور ہوا کیلی کے درمیان چھڑی اس جنگ کو حیرت و دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ انجوائے کر رہے تھے۔

اکیسویں صدی میں چھڑی یہ قدیم جنگ تمام تماش بینوں کے لیے تعجب و حیرت کا باعث ٹھہری تھی۔

یہاں تک کے پردے کے پیچھے بیٹھے ججز بھی اٹھ کر باہر آ چکے تھے۔ یہ تمام صورت حال شاید ان کے لیے بھی دلچسپ تھی۔

''واؤ! ہی از بریو مین......''

''کم آن یار......لڑکی بھی کم بہادر نہیں ہے اس

صدی کی، جودھا راجپوتانی ہے وہ۔'' لڑکیوں کے درمیان ہونے والے تبصرے کو سن کر تلوار والا ہاتھ سدا رنگ کے پہلو میں جا گرا تھا۔

اور یہ ہی وہ وقت تھا، جب لمحہ کی تاخیر کیے بنا اس جودھا راجپوتانی نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی تلوار کی نوک پر اٹھا دیا تھا۔

جہاں کھڑا تھا وہ راجپوت شہزادہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

مثال دست زلیخا تپاک چاہتا ہے
یہ دل بھی دامنِ یوسف ہے چاک چاہتا ہے

☆☆☆

''میں رات بھر جاگا نہیں۔'' اس نے ٹوسٹ کو دانتوں سے کترتے ہوئے جھوٹ بولا تھا۔

''یو شٹ اپ۔'' سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ شارق عباس اتنی قوت کے ساتھ دھاڑے تھے کہ سدحان صاحب کے لیے گرم دودھ کا گلاس کچن سے اٹھائے اس طرف آتی ماسی سردار بانو کو ہنسی آ گئی تھی۔

''واہ بڑے صاحب جی! آپ میں تو بڑی انرجی ہے۔ اگر ایسی قوت کے ساتھ کوئی ینگ لڑکا بھی چلائے تو اس کو ضرور کھانسی آ جائے۔ آپ کو تو ہچکی تک نہیں آئی۔'' من ہی من سوچتی وہ آگے بڑھی تھی۔

''تم بکواس کر رہے ہو سدحان۔''

گرم دودھ کا گلاس اس نے سدحان صاحب کے سامنے رکھا ہی تھا، جب بڑے صاحب کے جملے نے ان کا چہرہ سرخ کر دیا۔

''جب آپ کو پتا ہے کہ میں بکواس کر رہا ہوں، تو پھر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

''میں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں تا کہ آج بتا دو کہ میری بہو کی اس گھر میں حیثیت کیا ہے۔''

''کمال ہے پاپا! یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟'' اس نے کندھے اچکائے۔

''حالانکہ شافعہ کو بہو بنا کر اس گھر میں آپ لائے تھے؟''

''تم نے اس کو کیا دیا ہے سدحان؟'' شارق عباس بیٹے کے انداز پر بھڑکے۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟ اس گھر میں اسے کچھ نہیں مل رہا کیا؟ آپ نے تو کہا تھا تم شافعہ کو محض اپنا نام دے دینا سو میں نے نکاح نامے پر دستخط کر دیے کہ...... نہیں......'' اپنی بات کہہ کر وہ مسکرایا تھا اور دودھ کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ جبکہ بہو کے سامنے بیٹے کی اتنی کڑی بات پر شارق عباس ضبط نہ کر سکے تھے۔

''تم...... یو آر...... یو آر کریزی...... تم ٹوٹلی پاگل ہو چکے ہو اس گمشدہ لڑکی کے عشق میں۔''

''یہ بات آپ کو آج پتا چلی ہے پاپا! ایم شاکڈ......'' وہ ہنسا۔ ''حالانکہ میں نے شادی سے پہلے آپ کو آگاہ کیا تھا کہ میرے پاگل پن کو آپ کی بہو جھیل پائے گی۔''

''پلیز انکل! میری وجہ سے آپ دونوں آپس میں مت لڑیں۔'' اپنی فاتحانہ نگاہیں سدحان کے خوبرو چہرے پر گاڑے وہاں کب سے سکون کے ساتھ بیٹھی شافعہ سار یوا چانک بول پڑی تھی۔

گرم دودھ کا گھونٹ حلق سے اتارتے سدحان کے جبڑے بھینچ گئے۔

''تم خاموش رہو شافی! ایسے دیوانوں کے جن نکالنے مجھے خوب آتے ہیں۔''

''ہاہاہا...... کیا واقعی؟'' اس بار اپنے باپ کی بات سن کر اس پر ہنسی کا وہ دورہ پڑا تھا کہ ہنستے ہنستے پورا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

یہاں تک کہ دروازے کے پاس کھڑی سردار بانو بس اسے دیکھتی رہ گئی تھی کیونکہ سدحان شارق کے اوپر والے دانتوں کا کٹاؤ ہنسی کے دوران اسے کسی کی یاد دلا گیا تھا۔

ماسی سردار بانو کا دل یکا یک اداس ہوا۔

کوئی اس کو بہت ہی غلط وقت پر یاد آ گیا تھا۔

اے درد بتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں، یا آپ دل بے تاب ہیں ہم

☆☆☆

"یہ چکن شاشلک ٹیسٹ کیجیے ناں عادل صاحب! میرا شیف کمال کی بناتا ہے۔" چکن شاشلک کی ڈش سیٹھ عادل کی جانب بڑھاتے ہوئے شارق عباس کو بے حد اچانک اپنے پیٹ میں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تو وہ گڑبڑا گئے۔ لیکن اس ہڑبڑاہٹ میں جو نگاہ اٹھائی تو سیٹھ عادل کے چہرے پر بکھری بوکھلاہٹ دیکھ کر وہ چونک ہی گئے۔

"کیا بات ہے عادل صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" یہ استفسار کرتے جانے کیوں ان کا لہجہ چور سا ہو گیا تھا۔

ڈائننگ روم کی کھڑکی کے ساتھ کان لگائے کھڑی سردار بانو کو شارق عباس کے چور لہجے پر بڑے زوروں کی ہنسی آئی تھی۔

لیکن یہ ہنسی اس وقت اس کے چہرے سے اڑن چھو ہو گئی تھی جب اچانک اس کی پشت پر ایک بے حد بھاری آواز آئی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں پر؟"

"باپ رے!" اپنی پشت پر بھاری گونج دار آواز سن کر اس کی سانس رکی۔

وہ پلٹی تو خود سے کچھ فاصلے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر چونک گئی۔ سردار بانو کو لمحہ لگا تھا اس شخص کو پہچاننے میں کیونکہ وہ اس بندے کی لاتعداد تصویریں گھر کے کونے کونے میں بھی دیکھ چکی تھی۔

رائل بلیو تھری پیس میں ملبوس اس اکھڑے تیوروں والے شخص کا نام سدحان شارق تھا۔ وہ شارق عباس کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مائی جنت نے اس کو بتایا تھا، سدحان سائیں کاروباری مصروفیت کی بنا پر بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔

تو کیا بدھو باپ کا اکڑو بیٹا بیرون ملک سے واپس آ چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

جبکہ سامنے کھڑا شخص سر سے پیر تک خاصی مشکوک نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

☆☆☆

"اے کنیا! شانت ہو جا۔ کاہے کو غصے میں آکاش کو سر پر اٹھائے جاوت ہو۔"

سدا رنگ کی تلوار کو اس کے پہلو میں گرتے دیکھ کر جیتن دل ہی دل میں اس کو گالیاں بکتا آگے بڑھا تھا اور پھر اس جھانسی کی رانی کو جھڑک کر رکھ دیا۔

"میرے میت نے تیرے پران کی رکھشا کی۔ تجھے اس شترو کنیا کی تلوار کے گھاؤ سے بچایا...... اور تو ہے کہ اس کا اپکار ماننے کے بجائے الٹا یدھ کرنے کھڑی ہو گئی۔"

جیتن کی بات سن کر وہ لڑکی بے ساختہ اپنی نازک گردن موڑ کر پیچھے کھڑی اپنی دوست کو دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اور دفعتاً لمحے کے ہزارویں حصے میں جیتن اور سدا رنگ کے ساتھ ساتھ پورے پنڈال نے اس کے سرمئی نینوں کو بھیگتے دیکھا تھا۔ کٹاؤ دار لب پھڑپھڑا گئے۔

وہ ایک جھٹکے سے اپنی تلوار کی نوک سدا رنگ کی ٹھوڑی سے ہٹا گئی تھی۔

"ایم ایم...... سوری......" اس نے اپنی چاندی کے ہتھے والی تلوار متھار جا کی سنہری زمین کے سینے میں گاڑتے ہوئے معذرت کی...... اس کے خالص راج کماریوں والے انداز کو دیکھتے ہوئے سدا رنگ بت ہی بن گیا۔

یہاں تک کہ وہ اپنی تلوار ریت سے نکال کر خود بھی پنڈال سے نکل گئی تھی۔ اس نے تو مقابلہ جیت جانے پر رک کر ججز سے انعام بھی وصول نہیں کیا تھا۔

"لگتا ہے اپنی سکھی کے دھوکا دینے پر بہت دکھ ہوا ہے بے چاری کو۔" پاس کھڑے جیتن نے کہا تھا۔

اور سدا رنگ ہوش میں آتے ہی اس کے پیچھے لپکا تھا۔

جب وہ دوڑتا ہوا پنڈال سے باہر آیا تو وہ دونوں باتیں کرتی رتنم کے چوڑیوں کے اسٹال کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

اس کی سکھی نے رک کر اس سے کچھ کہا تھا اور تب وہ مسکراتے ہوئے پلٹی تھی لیکن سدا رنگ کی پیشانی پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی جگہ ہلکی سی نمی نے لے لی۔

وہ جوان دونوں پر نظر پڑتے ہی کھل اٹھا تھا۔ قبل اس کے ان تک پہنچ پاتا۔ گم صم نگاہوں سے سدا رنگ کو تکتی وہ وہاں سے ہٹ چکی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی پیشانی پر سجے تلک کی وجہ سے گئی تھی۔

اگر وہ جان لیتا تو نوراتری کے میلے میں اس کو اس دن کی قیمت پرکھوانے نہ دیتا۔

بہار آئی تو پھر ملیں گے
زندگی راہ گزر کا میلا ہے

☆☆☆

''میں جاتی ہوں صاب!'' وہ منمناتی ہوئی جانے کو پلٹی۔

''رکو۔۔۔کون ہو تم؟'' سرد لہجے میں کہتا وہ اس کا راستہ روک چکا تھا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی کہ جب سے یہاں نوکری کی تھی، ایسی مشکل کا سامنا آج پہلی بار ہوا تھا۔

''میں نے پوچھا کون ہو تم؟'' سخت لہجے میں پوچھتا وہ قریب ہوا۔

''صاب! جنت بی بی ہے ناں۔۔۔'' خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے ماسی جنت کا نام لیا۔

''کون۔۔۔ جنت بی بی؟'' اس کے جملے کو کھینچ کر دہراتے اس نے اس بدصورت بڑھیا کو گھورا۔

''صاب وہ۔۔۔وہ جو۔۔۔آپ کی پرانی خادمہ ہے، میں اس کی سگی پھپھی کی بیٹی ہوں۔''

''تم مائی جنت کی بات کر رہی ہو؟'' سدجان اب بھی اس کو شک بھری نگاہوں سے تک رہا تھا۔

سردار بانو کو اپنی جان مشکل میں پھنسی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

''ہائے دیا! تم اس وقت یہاں پر بیٹھی کیا سوچ رہی ہو؟''

شام کا وقت تھا اور وہ حویلی کے لان میں بیٹھی افق پر اڑان بھرتی کونجوں کو تکتے جانے کیا سوچ رہی تھی۔

جب ساکشی اچانک اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''آں۔۔۔ہاں! کچھ نہیں یار۔'' وہ چونکی۔

اس نے ایک دم گود میں رکھی ''فرحت عباس شاہ'' کی کتاب ''محبت ذات ہوتی ہے'' کھول کر اپنی نظروں کے سامنے کر لی تھی۔

''تم یہ پڑھ رہی تھیں یا مجھے پڑھا رہی ہو؟'' ساکشی نے اس کو گھورا تھا۔

''کیوں۔۔۔کیا ہوا؟'' وہ انجان بنی۔

''سب جانتی ہوں میں۔۔۔ ہم جب سے نوراتری کے میلے سے واپس آئے ہیں، تم اداس رہنے لگی ہو۔''

''ہوں، وہاں پر تم نے مجھ پر وار جو کیا تھا۔۔۔تو کیا اس بات پر میں اداس بھی نہ ہوں۔'' وہ ہنسی۔

''واہ جی! خوب جنتی ہیں آپ۔'' ساکشی نے اپنی آنکھیں نچا ڈالیں۔

''اور وہ وار کرنے کے لیے مجھ سے کہا کس نے تھا؟ ساکشی جب میں جیت جاؤں تو تم اپنی تلوار سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کرنا۔ کوئی تو ہو گا وہاں پر ایسا بہادر جو مجھے تم سے بچانے کے لیے آگے بڑھے گا۔۔۔اور وہ ہی میرے سپنوں کا راج کمار ہو گا۔''

''ہونہہ۔۔۔اور وہ راج کمار تم کو وہاں مل گیا تو اس کو وہیں چھوڑ کر تم پنڈال سے ہی نکل آئیں۔'' ساکشی نے باقاعدہ اس کی نقل اتارتے آخر میں لتاڑا تو وہ نگار چڑا گئی۔

''پگلی! کیوں تم مان نہیں لیتی ہو کہ۔۔۔تم کو اس سے پریم ہو گیا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتے ساکشی نے اس کے فرار کا راستہ مسدود کرنا چاہا تھا۔

''اللہ اکبر۔۔۔
اللہ اکبر۔۔۔

اور یہ ہی وہ وقت تھا جب فضا میں مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوا ٹھی۔

☆☆☆

لکھ بسم اللہ کرو سائیں، آپ کب آئے؟ بھلا ہوا ماسی جنت کا جو وہ اچانک ادھر کو آ نکلی تھی۔

سردار بانو کی مانو جان میں جان آ گئی۔

''ہوں، میں ابھی پہنچا ہوں......مگر مائی تم یہ بتاؤ، یہ عورت کون ہے اور گھر کے اندر کیسے گھس آئی۔''

اس نے اپنے سامنے کھڑی کھچڑی بالوں والی اس کالی کلوٹی بڑھیا کی جانب اشارہ کیا تھا۔

جوا پنے من ہی من بل کھائے جا رہی تھی کیونکہ سردار بانو کو کچھ بھی تھا۔ شارق عباس کے بیٹے سے ایسے زیرک دماغ ہونے کی امید ہرگز نہیں تھی۔

''اڑے سائیں! یہ سردار بانو ہے، میری سگی پھپھی کی بیٹی......بے چاری بے سہارا ہے۔ سوو ڈے صاب نے ترس کھا کر اس کو ادھر ملازمت پر رکھ لیا ہے۔'' ماسی جنت نے بتایا تو وہ سر ہلا گیا۔

''میں جاؤں صاب!'' سوئیٹ ڈش اٹھائے ماسی جنت ڈائننگ روم میں گھس چکی تھی، جب اپنی جان خلاصی ہونے پر اس نے فوراً جانے کی اجازت مانگ لی۔

''نہیں......''

''جی......'' وہ گھبرا گئی۔

''تم مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ جب میں یہاں کاریڈور میں آیا تو......ڈائننگ روم کی کھڑکی کے ساتھ کان لگائے تم کیا کر رہی تھیں؟''

اور سوال پر سردار بانو کا جی چاہا کہہ دے۔

''میں آپ کی آمد کا انتظار ہی تو کر رہی تھی صاب!''

لیکن جب وہ بولی تو لہجے کی منمناہٹ سننے سے تعلق رکھتی تھی۔

''آئے ہائے صاب جی! میں ٹھہری بے چاری بوڑھی عورت، ذرا سا چکر آ گیا تھا سو کھڑکی کا سہارا لے لیا۔''

تم اسی طرح چکر کھاتی رہنا، مگر ادھر......یہاں، اس گھر میں اگر تم نے کسی فرد کو بھی کوئی چکر دینے کی کوشش بھی تو کی......''

لب بھینچتے لفظ لفظ کو چبا کر ادا کرتا وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے اس پر کیا جتانا چاہتا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی اور اس وقت اس نے سدحان شارق کو بنا لحاظ کے کئی صلواتیں سنا ڈالی تھیں۔

اپنے بیڈ روم کی جانب پلٹ گیا تھا۔

''کیا تھا سدحان صاب! آپ بھی اندر جا کر آج وہی کھانا کھا لیتے۔ جس کو نوش کرنے کے بعد اندر ڈائننگ روم میں موجود ہر شخص بارش میں بھیگے مرغے کی طرح اپنا منہ اپنے پروں میں چھپائے بیٹھا تھا۔''

''ہی......ہی......'' سردار بانو نے مکاری سے قہقہہ لگایا۔

وہ سچ کہہ رہی تھی۔

کیونکہ واش روم بند تھا، اندر شارق عباس تھے اور باہر بیٹھے مہمانوں کی حالت بے حد خراب تھی۔

اور اس کی توقع کے عین مطابق کچھ ہی دیر بعد ایک دوسرے کے پیچھے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں تو وہ سکون سے قیلولہ کے ارادے سے بستر پر آ گری۔

یہ الگ بات تھی کہ شام کو شارق عباس کی طبیعت خرابی کی اطلاع سن کر سدحان صاحب نے ہمز کو طلب کر لیا اور ایسا برا کھانا بنانے پر اس کی خوب خبر لی۔

☆☆☆

''میں......میں نماز ادا کر لوں......'' وہ یک لخت گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ہاہاہا......'' اذان کے درمیان ہی ساکشی کی ہنسی گونجی تو وہ اندر جاتے جاتے رک گئی۔

''کیا بات ہے، تم اس طرح کیوں ہنسیں؟'' جانے کیوں اس کو اس کی ہنسی بری لگی تھی۔ سو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"میں اس لیے ہنسی میری بھولی سکھی کہ جب سے تم کو اس سے پریم ہوا ہے۔ تم نے نماز پڑھنی شروع کر دی ہے، جو نماز اس سے پہلے تم نے کبھی اللہ کے خوف سے نہیں پڑھی۔ اس کی محبت پانے کے لیے پڑھنی لگی ہو لیکن میں تم کو بتاؤں، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" یہ بات کہتے ساکشی کا لہجہ اس درجہ استہزائیہ تھا کہ اسے ٹھیس آ گیا تھا۔

"ایک منٹ رکو ساکشی!" جانے کے ارادے سے اس کو قدم آگے بڑھاتے دیکھ کر وہ سامنے آ گئی تھی۔

"یہ تم نے سوچ بھی کیسے لیا؟ نماز فائدہ کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ نماز تو خالق کے حضور میں کھڑے ہونا ہے۔ رہی خوف کی بات تو میں نماز اس کے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے رب کی پناہ طلب کرنے کی خاطر پڑھتی ہوں...... تاکہ اللہ مجھ کو شیطان کے شر سے بچا لے اور ایک غیر مذہب کے بندے کا خیال میرے من کے پاس بھی نہ ہو سکے۔" اک اک لفظ کو چبا کر ادا کرنے کے بعد وہ حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اور ساکشی اس کو اپنے گھر جانا جیسے بھول چکا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی سکھی ناراض ہو کر اندر گئی ہے۔

☆☆☆

"یہ اس گھر میں ہو کیا رہا ہے؟ شافعہ! کل کی پارٹی میں تم نے کسی صحافی کو بھی مدعو کر رکھا تھا کیا؟" وہ اس وقت ایرپورٹ جانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آیا تھا۔

جب جھنجلائے ہوئے انداز میں پاپا نے اپنے ہاتھ میں دبا اخبار ٹیبل پر پٹختے ہوئے شافعہ کو مخاطب کر لیا۔

کل رات پارٹی میں لی گئی ڈرنک کا خمار اب تک شارق عباس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا نظر آ رہا تھا۔

باپ کی آنکھوں میں دوڑتے سرخ ڈوروں سے نگاہ چرانے کے باوجود استہزائیہ مسکان کو وہ اپنے لبوں پر آنے سے نہ روک پایا تھا۔

"کیا ہوا پاپا؟ کہیں آپ کی کل کی پارٹی کی شہرت صحافیوں تک تو نہیں پہنچ گئی۔" شافعہ سے بھی پہلے سدحان بول پڑا تو شارق صاحب سٹپٹا گئے۔

اور سدحان صاحب کے لیے آملیٹ لاتی سردار بانو کو ان کے اس طرح سٹپٹانے پر اتنا پیار آیا تھا کہ اس نے دل ہی دل میں شارق عباس کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔

"اوہ، پلیز سدحان! کبھی تو خاموش رہ لیا کریں۔ ہر وقت کے طنز اچھے نہیں ہوتے۔ دیکھ نہیں رہے ہیں آپ، انکل کس قدر پریشان ہیں۔" بلا کی اداکاری کے ساتھ شافعہ اس کو ٹوکتی زہر سے بھی زیادہ بری لگی تھی۔

"او شٹ اپ ایڈیٹ۔" اپنی جلتی آنکھیں شافعہ کے چہرے پر گاڑے وہ چیخا تھا۔

"اور پاپا کی تمام پریشانیاں بڑھائی کس نے ہیں، تم نے...... نہ آئے روز گھر میں پارٹیز ہوتیں...... نہ ایسی پکچرز اخباروں کی زینت بنتیں......"

"امیزنگ...... یہ آپ کہہ رہے ہیں سدحان صاحب!" وہ دونوں شارق عباس کا خیال کیے بنا ہی شروع ہو چکے تھے۔

"پورا دن اور آدھی رات تک گھر سے باہر رہنے والے کسی مجنوں بیٹے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود کو کیئرنگ ظاہر کرنے کی ایکٹنگ بھی کرے، سمجھے آپ۔" وہ بھنا کر کہہ گئی۔

"تھینکس! ایکٹنگ میں کر رہا ہوں۔" براؤن ٹو پیس میں ملبوس سدحان سلگا تھا اس کی بات سن کر۔

"اور کل رات لان میں جو فلم تم نے بنوائی تھی اس کے بارے میں کیا خیال ہے......" اس نے دانت پیس کر پوچھا تھا۔

جبکہ اس کے اس بالکل ہیرو موافق اسٹائل پر قریب کھڑی ماسی سردار بانو مسکراہٹ چہرے پر آنے

سے نہ روک سکی تھی، لیکن وہ اس وقت گھبرا گئی۔ جب اس کی یہ مسکراہٹ اچانک سدحان کی عقابی نگاہوں میں آ گئی تھی۔

اور قبل اس کے وہ اس کی کلاس لینے کھڑا ہو جاتا بھلا ہوا شارق عباس کا جوان دونوں میاں بیوی پر ایک ساتھ چلا اٹھے تھے۔

''کیپ کوائٹ، یو بوتھ آر اسٹوپڈز......'' وہ دھاڑے۔ ''تم لوگوں کو نظر نہیں آ رہا، میں کتنے اسٹریس میں ہوں۔ ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ سدحان! میرے الیکشن قریب آ رہے ہیں۔ پانچ روز بعد میرا جلسہ ہے سانگھڑ میں...... ہماری مخالف پارٹی اسٹرانگ ہوتی جا رہی ہے اور ہم دن بدن اپنے ووٹ کھوتے جا رہے ہیں۔''

''تو پاپا! آپ کو یہ سب کل سوچنا چاہیے تھا کیونکہ یہ تصویریں تو اب نیوز پیپر کی زینت بن چکی ہیں...... آپ کی ریپوٹیشن آپ کے کریکٹر پر جو برا ٹر پڑنا تھا پڑ چکا...... سو اب ان ساری باتوں پر کڑھنے کا کیا فائدہ؟''

سپاٹ سے لہجے میں یہ سب کہنے کے بعد سدحان نے کرسی کی پشت پر پڑا اپنا براؤن کوٹ کھینچا تھا۔ اور اٹیچی کیس گھسیٹتا وہ ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا۔

ساڑھے گیارہ بجے کی اس کی لندن کی فلائٹ تھی سو اس کو ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، ایسا کون سا اس گھر میں جاسوس آ گیا ہے، سہیل جس کی یہ حرکتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلے جلسے کی تقریر میں گڑبڑ ہوئی اور وہ...... آج یہ تصویریں اخبار میں چھپ گئیں۔'' پیشانی پر سلوٹوں کا جال لیے وہ ابھی وہاں آ کر بیٹھے سہیل سے مخاطب ہوئے تھے۔

جبکہ سدحان کے وہاں سے دفع ہونے پر شافعہ نے سکھ کا سانس لیا تھا اور وہ بھی سہیل ہی کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

جو نیچی نگاہوں سے اس کی سمت دیکھتے مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے تم یاد آتے ہو......
کسی سنسان سپنے میں چھپی خواہش کی حدت میں
کسی مصروفیت کے موڑ پر
تنہائی کے صحراؤں میں......
یا پھر کسی انجان بیمار کی شدت میں
مجھے تم یاد آتے ہو
کسی بچھڑے ہوئے کی چشم نم کے نظارے پر
کسی بیتے ہوئے دن کی تھکن کے اوٹ میں
کسی بستی کی بارونق سڑک پر......
اور کسی دریا ویران جنگل کے کنارے پر
مجھے تم یاد آتے ہو
ہاں مجھے تم یاد آتے ہو......!

''سنو تو کیا اب وہ تم کو کبھی یاد نہیں آتا؟''

اس کا ایم بی اے میں ایڈمیشن تھا اور وہ ہاسٹل جانے کے لیے اپنے کپڑوں کی پیکنگ کر رہی تھی، جب اس کام میں اس کی مدد کرواتی ساکشی نے اچانک یہ سوال کر دیا۔

اپنی گرین شرٹ کی تہ لگاتا اس کا مرمریں ہاتھ ساکت پڑ گیا۔ صبیح چہرے پر اداسی لہرا گئی۔

وہ بھلا اب ساکشی کو کیا بتاتی کہ وہ اس کو بھلا ہی کب پائی تھی جو اس کو یاد کرنے کی نوبت آتی۔

وہ کالج میں ہی تھی جب اس کے لیے ڈھیروں پروپوزل آ گئے تھے، سب کے سب اس نے جانے کس کی آس پر ٹھکرا دیے۔

وہ شام کا ڈھلتا سورج دیکھ کر اس کو یاد آ جاتا تھا اور جب بارش ہوتی تب بھی...... اور جب کوئی اداس غزل سنتی تب تو بہت زیادہ۔ وہ کوئی بھی کام کرتی اس کی یاد، اس کا سایہ بنی رہتی اور تب اپنی بے بسی پر اس کی آنکھیں بھیگ جایا کرتی تھیں۔

''یا اللہ سائیں! میں جتنا اس کو بھول جانے کی دعا کرتی ہوں۔ اتنا وہ یاد آتا ہے، یہ کیا آزمائش ہے

میرے لیے۔ میں اس کا خیال بھی اپنے من میں نہیں لانا چاہتی۔ وہ میرے لیے شجر ممنوع کی طرح ہے۔"
وہ اکثر دعا مانگتے ہوئے رو پڑتی۔
اور آج ساکشی اس سے پوچھ رہی تھی کہ کیا وہ اسے کبھی یاد نہیں آتا۔

☆☆☆

"کچھ یاد آیا؟"
رتنم نے آج کچھ پرانی تصویریں اس کو واٹس ایپ کی تھیں۔ ان میں زیادہ تر تصویریں کراچی یونی کی تھیں اور دو تین تصویریں مٹھار جا میں لگنے والے نوراتری کے میلے کی تھیں۔ نوراتری نوراتوں کے اس جشن کو کہتے ہیں جو ہندو برادری کے لوگ ہر سال اکتوبر کے آغاز میں مناتے ہیں۔
ان تصویروں کو دیکھ کر اس کو کیا کچھ یاد نہیں آ گیا تھا۔ ایک تصویر میں وہ رتنم کی نکوار تھامے جیتن کے ساتھ کھڑا کسی بات پر مسکرا رہا تھا اور دوسری تصویر خود رتنم کی تھی۔ جس میں وہ اپنے چوڑیوں کے اسٹال پر بیٹھا، دو ناریوں کو چوڑیاں بیچتا نظر آ رہا تھا اور تیسری تصویر سدا رنگ کے ساتھ اس جھانسی کی رانی کی تھی جس میں ہوا کیلی سدا رنگ کی ٹھوڑی کو اپنی گھنگھرو سے بجی نکوار کی نوک پر اٹھائے ہوئے تھی۔
اس تصویر کو دیکھ کر وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا تھا۔
سدا رنگ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تصویر کے ذریعے وہ اس کو اپنے دل میں اتار لیتا۔
اسے اچھی طرح سے یاد تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی۔ جب ان تینوں نے یونی سے نیا نیا پاس آؤٹ کیا تھا۔ وہ کراچی یونیورسٹی میں اپنے اصلی نام کے بجائے اپنے شاعرانہ تخلص سدا رنگ کے نام سے مشہور تھا۔ تمام یونی فیلوز اس کی رومانٹک شاعری کے دیوانے تھے لیکن رتنم اس کا سچا فین و عاشق تھا۔
ایک ماہ بعد سدا رنگ کی آسٹریلیا کی فلائٹ تھی۔ اس کو مزید تعلیم کے حصول کے لیے دو سال کے لیے آسٹریلیا کوچ کر جانا تھا۔ ان ہی دنوں رتنم نے جیتن اور اسے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ سدا رنگ کا گاؤں بھی اسی علاقے میں تھا۔ وہ سو وہ تینوں بائے روڈ کراچی سے سفر کر کے پہلے سدا رنگ کے گاؤں پہنچے تھے۔
وہاں دو دن تک گھڑ سواری سے خوب لطف اندوز ہونے کے بعد وہ لوگ رتنم راج کے گاؤں مٹھار جا آ گئے۔
جس روز صبح کو وہ مٹھار جا پہنچے تھے، اسی رات گاؤں میں نوراتری کے میلے کی پہلی شب تھی۔ رتنم نے اپنے لیے بینگل اسٹال پہلے سے بک کروا دیا تھا۔ رتنم کے ساتھ ساتھ جیتن کا بھی میلے میں جانے کا ارادہ تھا۔
لیکن دونوں کے ارمانوں پر اس وقت اوس پڑ گئی تھی، جب سدا رنگ نے بھی ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔
اور تب بنا کسی لحاظ کے وہ دونوں ہی اس کو ساتھ لے جانے سے انکاری ہو گئے تھے۔
جب ہی ان دونوں کو راضی کرنے کی خاطر مجبوراً سدا رنگ کو وہ گیٹ اپ کرنا پڑا تھا۔
سانولے سلونے شہزادے کا گیٹ اپ۔
اپنی اور اس سندر راجکماری کی تصویر پر بھی اس کی خوب صورت آنکھیں حسرت و کمی سمیت لائی تھیں۔
ٹھیک اس وقت اس کی فلائٹ کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکی تھی۔ وہ تین روزہ لندن میں قیام کے بعد پاکستان واپس آ چکا تھا۔
اس بار لندن میں جیتن کے بیٹے ست کو دیکھ کر ایک خواہش اس کے دل میں زور پکڑ چکی تھی۔ اپنی زندگی میں ننھے سے کھلونے کی کمی کا احساس اس کو ایک فیصلہ کرنے پر مجبور کر گیا۔

☆☆☆

"جو چیز قسمت میں نہیں، اسے یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ اور ویسے بھی سب سے اہم بات، ہم دونوں کے مذہب الگ ہیں۔"
"دھرم کو درمیان میں مت لاؤ تم۔ پریم تو خود

ایک دھرم ہے...... اور تم کو ہمارے دھرم میں کیا برائی نظر آتی ہے؟''

''برائی مذہب میں نہیں ہوتی ساکشی۔ یہ تو اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے قابل نہیں...... ایسا ماننا ہے ہمارا جبکہ تم لوگ مختلف بتوں کو اپنا معبود مانتے ہو۔''

''ہم لوگ مختلف بتوں کو مانتے ہیں، ان کی پوجا کرتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور مسلمان مختلف قبروں پر چادریں چڑھاتے ہوئے۔'' ساکشی ہنسی۔ ''لنگر بانٹتے ہیں...... جیسے ہم پرشاد بانٹتے ہیں۔ ہم دیوی دیوتاؤں کے مندروں میں جا کر پراتھنا مانگتے ہیں اور تم لوگ اپنے اپنے پسندیدہ مزار پر جا کر منت مانگتے ہو۔ بات تو برابر ہوگئی، اللہ کو تو ہم بھی ایک ہی مانتے ہیں تم لوگوں کی طرح۔'' ساکشی نے اس قدر سخت الفاظ میں اس کو آئینہ دکھایا تھا کہ وہ چہرے پر خفت کی سرخی لیے لب بستہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

فوری طور پر ساکشی کی بات کا کوئی جواب اس سے نہ بن پایا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی، بہت سے مسلمان یہ سب کچھ کرتے پھرتے تھے، جن سب کا حوالہ ساکشی نے دیا تھا۔

''سوری یار! اگر تم کو برا لگا ہو تو...... میں نے تو بس وہی بات کہی جو نوٹ کی تھی۔'' کئی ساعتیں بیت جانے کے بعد ساکشی بالآخر گویا ہوئی تھی۔

''ورنہ میں تو خود اللہ سائیں سے مانگنے کی عادی ہوگئی ہوں، یہ شاید تمہاری دوستی کا اثر ہے۔ اب دیکھو ناں، میں نے اپنے دیاہ کی دعا کی تھی اس مہینے کے آخر میں۔ میرا دیاہ ہونے جا رہا ہے۔'' ساکشی نے ہنس کر کہا تو وہ مسکرا دی۔

''اے سن ہوا سہیلی!'' وہ اس کو رازدارانہ انداز میں پکارتے ہوئے قریب ہوئی۔

''کیا تم نے اللہ سے کبھی اس کو مانگ کر دیکھا ہے، اللہ سے اس کو ضرور مانگ کر دیکھنا ہوا سہیلی! کیونکہ جو بھی چیز اللہ سے مانگی جائے وہ ضرور ملتی ہے۔'' یہ ساکشی دیوی اس سے کہہ رہی تھی۔

ہوا سہیلی اس کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔

جبکہ اس نے ہمیشہ اللہ سے اس کے خیال کو اپنے دل سے نکالنے کی دعا کی تھی۔

کبھی بھی اس راج کمار کو اللہ سائیں سے مانگ کر نہیں دیکھا تھا ورنہ اللہ رب العزت کے بس میں کیا نہیں۔

☆☆☆

''آج آپ جلدی گھر آ گئے؟''

چاکلیٹ کلر کا کوٹ کندھے پر ڈالے، چاکلیٹ کلر کی پتلون اور سفید شرٹ میں ملبوس وہ اپنا لیپ ٹاپ تھامے، جوں ہی اپنے کمرے میں اندر داخل ہوا تھا۔

اس پر نظر پڑتے ہی فون پر کسی کے ساتھ باتیں کرتی بیڈ پر لیٹی شافعہ کے چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

''جی جناب! آج ہم جلدی آ گئے اور زہے نصیب کہ آپ بھی گھر پر دستیاب ہیں۔'' اپنا کوٹ صوفے پر ڈال کر وہ اس کے برابر آ لیٹا تھا۔ یہ اور بات تھی اس کو اپنے پاس لیٹتے دیکھ کر اک سایہ سا شافعہ ساریو کے چہرے پر آ کر گزر گیا تھا کہ جب سے سدحان اس مرتبہ میکسیکو سے واپس آیا تھا، وہ اس کے انداز میں اپنے لیے خاصا بدلاؤ محسوس کر رہی تھی۔

کل بھی اس نے خاصی مشکل سے اپنی جان چھڑائی تھی۔

''کیا خیال ہے شانی! آج رات ڈنر کرنے نہ چلیں؟'' کل شام کو آفس سے کال کر کے سدحان نے اس سے پوچھا تھا۔

''ڈنر پر...... اور وہ بھی میں اور...... آپ؟''

باوجود کوشش کے وہ اپنی حیرت چھپا نہ پائی تھی۔

''کم آن یار! ہم لوگ ڈنر پر نہیں جا سکتے۔ بیوی ہو تم میری۔'' یہ سدحان شارق اس سے کہہ رہا تھا۔

شافعہ کو اپنے چہرے کے آگے بھاپ اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔

''سوری سدحان! میں تمہارے ساتھ ضرور

چلتی، اگر آج میرے فرینڈز کے ساتھ...... میرا پروگرام نہ بنا ہوتا۔'' دانت پیس کر بے مروتی کے ساتھ انکار کرتی، وہ کال ڈسکنکٹ کر گئی تھی۔

اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اپنے سیل پر سہیل فاروق کا نمبر ملا لیا۔

''سہیل ویئر آر یو؟'' اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''یاد نہیں...... تمہیں پتا تو ہے۔ تمہارے سسر کے الیکشن نے میرے سر میں پتھر پکار رکھے ہیں۔'' وہ بیزار ہوا۔

''اور ادھر ان کے بیٹے نے میرا سر پکا رکھا ہے؟'' وہ جھنجلائی۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' اس کی بات سن کر سہیل چونک پڑا تھا۔

''سب ٹھیک تو ہے؟''

''ٹھیک ہی تو نہیں لگ رہا ہے مجھے کچھ۔ سدحان جب سے میکسیکو سے لوٹا ہے، میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے وہ۔ لگتا ہے پرانی محبت بھول گئی ہے اس کو۔'' وہ جلبلاتے ہوئے بتا گئی۔

''ہاہاہا......''

شافعہ کی بات کا مطلب سمجھ کر دوسری جانب زبردست قہقہہ پڑا تھا۔

''ہاؤ فنی سوئٹ ہارٹ! اینڈ آئی کانٹ بلیو دس۔ اپنی پرانی محبت کو سدحان شارق کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔ البتہ اس لڑکی کے تصور کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ کر تم کو اپنی زندگی میں کچھ جگہ ضرور دے سکتا ہے وہ......'' سہیل کو پکا یقین تھا۔

''ویل ریلیکس مائی لو۔ تم ہرگز پریشان نہ ہو، اگر وہ زیادہ گلے پڑنے کی کوشش کرے تو ٹکا دینا اس میاں مجنوں کو۔ شارق چاچو کو میں خود سنبھال لوں گا اور رہی یہ دنیا تو......ایک دیوانے کی موت کا جواز پیش کرنا اس دنیا کے سامنے کون سا مشکل کام ہے، ویسے بھی اپنے سرکل میں سدحان دیوداس کے نام سے مشہور ہے، کہہ دیں گے......

''اک لڑکی کے عشق میں ناکام ہونے پر اس دیوداس نے خودکشی کر لی۔'' سہیل فاروق کی جیلسی آج کھل کر سامنے آئی تھی۔ وہ سدحان سے کتنی نفرت کرتا تھا، یہ شافعہ ایوب کو آج معلوم ہوا تھا۔ پر وہ اداس کیوں ہوتی، کون سا وہ سدحان کو پسند کرتی تھی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟'' اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے پر جھولتی لٹ کو چھیڑتے ہوئے، سرگوشی کرتا چاند وہ اپنے حصار میں لے چکا تھا۔

وہ اس کی گرفت میں کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔

''بائی گاڈ سدحان......'' بمشکل اس کے حصار کو توڑتی دوسرے ہی لمحے وہ بیڈ سے نیچے اتر گئی تھی۔

اور جیسے اس کے ساتھ ہی روم میں چھایا فسوں اک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ گیا تھا۔

اس سرمئی نینوں والی شہزادی کی جگہ شافعہ کو اپنے سامنے پا کر سدحان کی خوب صورت آنکھیں بجھ کر رہ گئی تھیں۔

''میں...... میں آپ کے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔'' نگاہیں چراتی، بہانا بناتی وہ روم سے نکل گئی تھی۔

اور سدحان شارق کی بے خواب آنکھیں بیڈ روم کی چھت کو گھورتی رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

اس کو جو کچھ کرنا تھا، آج کی رات ہی کرنا تھا کیونکہ پرسوں شام کو شارق عباس کا سکھر میں جلسہ تھا اور کل شام کی فلائٹ سے وہ سکھر کے لیے نکل جاتے۔

سو تمام افراد کے سونے کا یقین ہونے کے بعد وہ دبے پاؤں اپنے کوارٹر سے نکل آئی تھی۔

ماسی سردار بانو کے کالے کلوٹے ہاتھوں میں جو سفید پنوں کا پلندہ تھا، وہ اس نے اپنے دوپٹے کے نیچے چھپا رکھا تھا۔

وہ بلی کی چال چلتی شارق عباس کی اسٹڈی میں

داخل ہو چکی تھی۔
''تھینکس گاڈ!'' اندر آنے کے بعد اس نے لائٹ نہیں جلائی بلکہ اپنے ہاتھ میں تھامے انڈرائیڈ سیل کی ٹارچ کو آن کر دیا۔ اس کو اس وقت دراصل اس فائل کی تلاش تھی جسے آج شام میں شارق عباس کو اس نے اسٹڈی روم میں لے جا کر رکھتے دیکھا تھا۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ فائل بالآخر ماسی سردار بانو کو رائٹنگ ٹیبل کی اوپر دراز میں کچھ اور کاغذات کے ساتھ پڑی مل گئی تھی جس میں وہ تقریر درج تھی جو پچاس ہزار لوگوں کے مجمع کے سامنے اسٹیج پر چڑھ کر سکھر کے جلسے میں شارق عباس کو کرنی تھی۔
درمیان سے تینوں کا غذات کھینچ کر اس نے بے حد سلیقے کے ساتھ اپنے ساتھ لائے تینوں پیپرز فائل میں فٹ کر دیے تھے۔
فائل کو واپس اپنی جگہ پر رکھنے کے بعد وہ گنگناتی اسٹڈی روم سے باہر نکل آئی تھی۔
آ جک اپنی فائل لے جا......
آ جک اپنی فائل......

☆☆☆

وہ کسی چوٹ کھائی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی سدحان کے بیڈروم سے نکلی تھی اور نیچے کچن میں آ گئی تھی۔
کھلتے ہوئے دماغ کے ساتھ بمشکل اس نے کافی بنائی، مگ پرچ میں پٹخے اور کچن کے دروازے سے باہر نکلتے نکلتے دفعتاً رک گئی۔
''اگر زیادہ گلے پڑنے کی کوشش کرے تو ٹپکا دینا اسے......'' سہیل کی آواز پاس سے ہی ابھری تھی۔
شافعہ کی پرسوچ نگاہیں بھٹک کر کچن کے نچلے کیبنٹ پر جا ٹھہری تھیں۔
''اس وقت کچن میں کون جا گھسا ہے؟''
قدموں کی چاپ پیدا کیے بنا وہ اسٹڈی روم سے نکل کر اپنی کوارٹر کی سمت بڑھ رہی تھی۔
جب کچن سے آتی کھٹ پٹ کی آوازیں سن کر چونک اٹھی تھی وہ۔
ہمز پچھلے کچھ دنوں سے چھٹی پر تھا۔ الطاف اور ماسی جنت اپنے اپنے کوارٹروں میں سو رہے تھے تو پھر اس وقت کچن میں کون ہو سکتا تھا۔ سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بجائے وہ اپنا زیرک دماغ استعمال میں لاتی، لان میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔
اور جیسے اس کے ساتھ ہی ماسی سردار بانو کی سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیل کر رہ گئیں۔
کیونکہ اندر کا منظر تھا ہی اتنا حیران کر دینے والا۔
کچن کے نچلے کیبنٹ سے شافعہ ایوب کو چوہا مار دوائی کا سیاہ ریپر والا چھوٹا سا پیکٹ برآمد کرتے دیکھ کر سنسنی کی اک تیز لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی تک دوڑ گئی تھی۔ مگر پھر اس دوائی کا چوتھائی حصہ وائیٹ مگ میں بھری پڑی شہد والی اس ایتھوپین کافی میں اسے ملاتے دیکھ کر وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔
''تو کیا یہ کافی سدحان شارق کے لیے ہے۔''
اور اس سے زیادہ سردار بانو کا ذہن مزید کچھ سوچ نہیں پایا تھا۔
اور قبل اس کے کہ شافعہ پلٹتی اور اس کو کھڑکی میں کھڑا دیکھ لیتی۔ اس کو فوراً وہاں سے ہٹ جانا پڑا تھا۔
''تمہارا کیا جاتا ہے سردار بانو؟ شارق عباس کا بیٹا ہے وہ، تمہارا کوئی اپنا تو نہیں ——اور ویسے بھی اتنا یاد رکھو، بڑے لوگوں کے گھروں میں ایسے چھوٹے چھوٹے ڈرامے ہوتے رہتے ہیں۔''
شافعہ ساریو کے وہاں سے جانے کے بعد اس نے خود کو تسلی دینی چاہی تھی لیکن جانے کیوں پھر بھی اس کا ضمیر مطمئن نہ ہوا۔

☆☆☆

کیا کیا روگ لگے ہیں دل کو، کیا کیا اس کے بھید
ہم سب سے کترانے والے، کون ہمیں سمجھائے؟
ایک اسی امید پہ ہیں، سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں، کون کہاں مل جائے

کافی کے دونوں مگ ٹرے میں سجائے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ جس وقت بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔

وہ ڈریسنگ کے قد آدم آئینے کے آگے کھڑا اپنے براؤن سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں کستا نظر آیا تھا۔

''کافی......''

اپنا مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے آگے بڑھ کر سدجان کا مگ اس کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

''تھینکس۔''

لیکن وہ اس وقت جھلا گئی تھی۔ جب دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کافی اس کے ہاتھ سے لینے کے بعد اس نے بے حد اچانک اس کا دوسرا ہاتھ تھام کیا۔

آج یہ مجنوں اپنی لیلیٰ کو بھلا کر میرے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔

شافعہ کی کوفت سوا ہوئی تو وہ دل ہی دل میں اس کو سنا گئی۔ جبکہ اس کے چہرے کے تار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لیتے وہ یک لخت جھکا تھا اور اس کے ہاتھ کو اپنے خوب صورت وسلگتے لبوں سے چھو لیا۔ ناگواری کی اک تیز لہر شافعہ کے وجود میں دوڑ گئی تھی قبل اس کے وہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتی۔

دفعتاً کسی نے بے حد وحشت ناک انداز میں ان کے بیڈ روم کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

''ایک منٹ، میں دیکھتا ہوں۔''

شافعہ کو پلٹتے دیکھ کر اس نے کہا تھا اور پھر آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

''صاب......صاب......''

سامنے ماسی سردار بانو کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے مائی؟'' دہلیز پر سردار بانو کو کھڑا دیکھ کر وہ جی بھر کے بدمزہ ہوا تھا۔

''صاب!...... وہ ...... جنت بی کو جانے کیا ہو گیا ہے، اس کی سانس اکھڑ رہی ہے۔ آپ...... آپ جلدی آ جاؤ صاب...... الطاف بھی اپنے کوارٹر میں نہیں تھا، جب ہی میں آپ کو بلانے یہاں آ گئی۔''

کن انکھیوں سے سدجان صاحب کے ہاتھ میں موجود کافی کے مگ کا جائزہ لیتی سردار بانو خاصی گھبرائی ہوئی و بدحواس نظر آ رہی تھی۔

''مائی جنت! کیا ہوا اس کو......'' جب کہ اس کی بات سن کر وہ چونک گیا۔ کچھ بھی تھا بچپن سے وہ مائی جنت کو اپنے یہاں کام کرتے دیکھ رہا تھا، سو اس عورت سے اک عجیب سی انسیت تھی اسے۔

''شافی...... جسٹ آ ویٹ...... میں ابھی آیا۔''

ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی شافعہ سے عجلت میں معذرت کرتا وہ سرعت کے ساتھ سردار بانو کے پیچھے ہی روم سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

رک جایئے صاب! مائی جنت کو کچھ نہیں ہوا۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہے۔''

لان کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد وہ سوئمنگ پول کے قریب سے گزر کر تیزی کے ساتھ مائی جنت کے کوارٹر کی جانب بڑھ رہا تھا۔

جب پیچھے سے آتی اس بڑھیا کی سنجیدہ سی آواز سن کر سدجان شارق کی دائیں کنپٹی کی رگ اچانک پھڑک اٹھی تھی۔

قبل اس کے وہ اس کی سمت پلٹتا، وہ بڑے دانتوں والی سانولی سی بڑھیا اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''صاب! ماسی جنت کی طبیعت خرابی کا بہانا کر کے میں آپ کو آپ کے کمرے سے اس لیے بلا لائی تا کہ آپ کو بتا سکوں کہ جو کافی کا مگ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس میں زہر ملایا گیا ہے۔''

''کیا بک رہی ہے مائی؟ تو ہوش میں تو ہے؟'' جوں ہی اس کی بات مکمل ہوئی، وہ کسی بھوکے شیر کی طرح اس کی جانب لپکا تھا۔

''اگر بروقت اپنا بچاؤ کرتی وہ دو قدم پیچھے نہ

ہٹ گئی ہوتی تو آج ضرور سدحان سائیں اس کا گلا دبا دیتے۔

پیشے کے لحاظ سے وہ بھلے ہی ایک بزنس مین تھا۔ مگر تھا تو وہ ایک جاگیردار کا بیٹا ہی ناں اور لگتا تھا آج اس کے جاگیردارانہ خون نے بھرپور جوش مارا تھا۔

''سائیں — میں — بکواس نہیں —''

''شٹ اپ نان سینس! تو میری سوچ سے کہیں زیادہ مکار ہے۔'' وہ لب بھینچے غرایا۔

''میں نے کہا تھا ناں تجھ سے — ادھر کسی کو، کوئی چکر دینے کی کوشش مت کرنا ورنہ تیری ان سانولی ہڈیوں کو شارق ولا کے لان میں گاڑ دوں گا۔ یہ کافی جو اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے — تو جانتی ہے میری بیوی بنا کر لائی ہے یہ کافی۔''

''سائیں — میں جانتی ہوں۔ پر میں جھوٹ نہیں بول رہی سائیں۔'' یہ مری مری آواز بڑی دقتوں کے بعد سردار بانو کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

ورنہ سدحان صاحب کا آج یہ غصہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خود کو کوس کر رہ گئی تھی کہ کیوں اس کی بھلائی کی خاطر اس نے اس بدھو باپ کے اکڑو بیٹے کو نیچے بلا لیا تھا۔ پیتا وہ یہ کافی اور مرتا شوق سے۔

''مجھے مارنے کے لیے میری بیوی نے اس کافی میں زہر ملایا ہے۔ یہ ہی مطلب ہے ناں تمہاری اس بکواس کا؟'' خوں خوار نگاہوں سے اس کو گھورتے وہ اس کی طرف بڑھا تو اس کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

''صاب ...... صاب ...... مجھے اپنی مری ہوئی ماں کی قسم ...... میں نے خود اپنی ان بوڑھی آنکھوں سے شافعہ بی بی کو کچن کے کیبنٹ سے چوہا مار دوائی نکال کر آپ کی اس کافی میں ملاتے دیکھا ہے۔'' مسلسل پیچھے کی طرف قدم اٹھاتی وہ کہنے سے باز نہیں آئی۔

اور اس بار پہلی مرتبہ مقابل کی شعلے اگلتی آنکھیں گم صم سا تاثر سمیٹ لائی تھیں۔

''شافعہ نے اس کافی میں کچھ ملایا ہے یا نہیں — '' کتنی ساعتیں چپ کا بت بنے رہنے کے بعد وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوا تھا۔ ''میں نہیں جانتا، پر اتنا جانتا ہوں کہ شارق ولا سے تم کو اپنا بوریا بستر محض دو دن کے اندر اندر گول کرنا ہوگا — سمجھیں مائی تم۔ دو دن کے بعد میں تم کو یہاں نہ دیکھوں۔'' وہ اس کی بھیگی کالی آنکھوں میں جھانکتے غرایا تو —

دوسرے ہی لمحے وہ سر پر پاؤں دھر کر وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

یہ اور بات تھی کہ اپنے کوارٹر میں آکر اس نے سدحان شارق کو خوب سخت سست سنا ڈالی تھیں۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے وہاں سے جانے کے بعد اس کی کہی باتوں پر غور کرتا وہ کتنی ساعتوں تک ہاتھ میں تھامے کافی کے مگ کو گھورتا رہا تھا۔

وہ ملازمہ جھوٹ بول رہی تھی یا ایسا اس کا دل کہہ رہا تھا مگر پھر بھی جانے کیوں دل کی گواہی کو نظر انداز کرتا وہ سیاہ و سلور گیٹ کی طرف آ گیا تھا۔

گیٹ کے پاس پڑی چیئر پر واچ مین نیند کے مزے لوٹنے میں مصروف تھا۔

کن انکھیوں سے سوئے ہوئے واچ مین کا جائزہ لینے کے بعد سدحان نے ہاتھ میں تھاما مگ گیٹ کے قریب بندھے پالتو کتے کے دودھ والے برتن میں انڈیل دیا تھا اور پھر اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اک چکر وہ کچن کا لگانا ہرگز نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

''آ گئے آپ؟'' اس پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرائی تھی۔

''ہوں۔'' وہ یک لفظی جواب دیتا بیڈ پر آ گیا۔

''آں ہاں — سدحان! کافی پی لی تھی آپ نے؟'' لائٹ آف کرنے کے ارادے سے اسے سائیڈ ٹیبل پر سجے لیمپ کی جانب ہاتھ بڑھاتا دیکھ کر پاس بیٹھی اس کی شریک حیات منمنائی تو وہ چونک گیا۔

''ہاں — کافی پی لی تھی میں نے اور بہت ہی مزے کی تھی۔'' اندھیرے میں سدحان شارق کی چہکتی آواز سن کر مسکراہٹ شافعہ سار یو کے لبوں

مسکراہٹ پر مکمل اٹھی تھی۔

"اچھا...... اور ماسی جنت کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس بار جانے کیوں وہ بے وجہ ہی کھلکھلائی تھی۔

"ہمم! جناب اٹس از فائن ناؤ...... میں نے ٹیبلٹ دے دی تھی۔ ماسی جنت کو...... سو وہ اب ٹھیک ہے...... اسے خود سے اچانک قریب کرتے وہ بتا گیا تو...... شافعہ کو مانو سانپ سونگھ گیا۔

"سدھا...... ن...... ایم......" کمرے کے سناٹے میں اگلے ہی پل شافعہ کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی تھی۔

"ایم سوری! ہوپ سو...... یو ڈونٹ مائنڈ...... مجھے نیند آرہی ہے۔"

"آ...... اٹس...... اوکے!" لمحے کے ہزارویں حصے میں سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اس کی معذرت قبول کرتا وہ لب بھینچ گیا تھا۔

جبکہ کسی بے جان گڑیا کی طرح آنکھیں میچے اس کے پہلو میں لیٹی شافعہ نے اسے اپنی جانب سے پشت موڑ کر کروٹ کے بل لیٹتے محسوس کیا تو سکھ کا سانس لیتے جھٹ سے آنکھیں کھول لیں۔

کوئی اژدھا تھا جو اس کو نگلتے نگلتے رہ گیا تھا۔

اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے وہ لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اور غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے اس کے پہلو میں لیٹا وہ شخص اپنے نصیب پر شکوہ کناں ہوا اٹھا تھا۔

وار اس قدر شدید کہ کوئی دشمن ہی کر سکے.

چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا......

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بھی بیٹھا ہے یا نہیں اس کا یقین کر لینے کی خاطر اپنا نازک ہاتھ ساتھ لیٹے شخص کے نتھنوں تک لے گئی۔

"مائی گاڈ......" شافعہ کو جیسے بچھو نے ڈنگ مارا تھا۔

گرم سانسوں کا لمس اس کی انگلیوں سے کیا ٹکرایا، اس کے پورے وجود سے گویا جان ہی نکل گئی۔

جبکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی حرکت پر اس کے برابر لیٹے وجود کی آنکھوں کے کونے جل اٹھے تھے۔

سدحان شارق کو اپنی بدنصیبی کا یقین آچکا تھا۔ اب سے کچھ دیر قبل نیچے وہ اس نوکرانی کی بات کو جھٹلا کر آگیا تھا۔ لیکن اس جھٹلائی ہوئی بات پر یقین کی مہر شافعہ کی اختیارانہ حرکت نے ثبت کر ڈالی تھی۔

"کتنے بدنصیب ہو تم سدحان شارق...... جس لڑکی کو تم نے چاہا...... وہ تمہاری زندگی میں شامل نہ ہو سکی...... اور آج اس کے تصور کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ کر نئی زندگانی کی ابتدا کرنی چاہی تو...... تمہاری شریک حیات تمہاری جان کی دشمن بن گئی؟"

"اسے کہتے ہیں پھوٹے ہوئے بھاگ......"

تم سے اچھا تو وہ مزدور ہی ہوگا جو دن بھر محنت کے بعد دو وقت کی روٹی کما کر لاتا ہوگا...... اور پھر چین کی نیند سو جاتا ہوگا۔

"کس کام کی تمہاری یہ وجاہت...... ہاں اور یہ بے پناہ دولت کس کام کی...... جب قسمت میں چین کی نیند تک نہیں...... تو پھر یہ تمام نعمتیں کس کام کی"

بے خواب آنکھوں میں حسرت کی نمی لیے وہ خود سے سوالات کیے بنا نہ رہ پایا تھا۔

وہ تمام رات اس وجیہہ شخص کی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

اک دیوار غم اٹھا لینا
پھر شب بھر اس سے گفتگو کرنا......
یہ محبت کہاں تھی سمجھوتا تھا
تم کو ضروری تھا بھلا خوں کرنا

☆☆☆

وہ مختلف چیزوں کے اٹھا پٹخ کی آوازیں ہی تھیں جن کو سن کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

آنکھ کھلتے ہی نگاہ سیدھی ڈریسنگ کے آئینہ سے جھانکتی اس شخص کی آنکھوں سے جا ٹکرائی۔

آف وائٹ ٹوپیس اور میرون کلر کی ٹی شرٹ میں ملبوس وہ شخص ہر سیکنڈ بعد ایک نیا باڈی اسپرے اٹھاتا کیپ ہٹا کر چیک کرنے کی ایکٹنگ کرتا اور پھر بڑے ہی آرام کے ساتھ دوسرے ہی پل ڈریسنگ ٹیبل پر وہ اسپرے پٹخ دیتا۔ مگر دفعتاً اس کا ہاتھ رک چکا تھا۔ کیونکہ جس مقصد کے تحت وہ یہ اٹھا پٹخ کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ مقصد پورا ہو چکا تھا۔

جہازی سائز بیڈ پر محوخواب شافعہ ساریو کی آنکھ کھل چکی تھی۔

"اٹھ گئے آپ......؟" آئینہ سے جھانکتی ان سرخ آنکھوں کا بغور جائزہ لیتی وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

"ہاں......اسٹرینج......ہم اٹھ گئے......"

اپنے سادہ سے سوال کا ایسا مبہم وطنز بھرا جواب سن کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

"میں آپ کو ناشتے پر جوائن کرتی ہوں......"

سدحان کے لبوں پر کھیلتی ہوئی استہزائیہ مسکان کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کی جانب بڑھتے ہوئے کہہ گئی۔

"بہت خوب......! مگر اچانک اس کو رک جانا پڑا تھا کیونکہ وہ یکدم سامنے آگیا تھا۔"

"تو کیا آپ...... اب ہمیں جوائن کر سکتی ہیں......" رتجگوں سے بجی اپنی بے تحاشا خوب صورت وساحر آنکھیں اس عورت کی آنکھوں میں گاڑ کر سفاکی سے کہتا وہ اس پر کیا جتا گیا تھا۔

شافعہ سن رہ گئی تھی۔ جبکہ اپنی بات کہنے کے بعد وہ اپنا کوٹ شانے پر ڈالے بیڈ روم سے نکل گیا تھا۔

اور اس کے جانے کے بعد اس کی بیوی نے اپنی دھڑکتی کنپٹیاں تمام لی تھیں۔ کچھ غلط ہو چکا تھا۔ اس پر وہیں کھڑے کھڑے انکشاف ہوا۔ اتنا غلط کہ اس کو ٹھیک کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی اسے ٹھیک کرنے کی شافعہ ایوب کو کوئی خواہش تھی۔

پھر بھی جانے کیوں اپنے آخری تیر کو ترکش میں سنبھالے نائٹی تبدیل کرنے کے بعد وہ نیچے آگئی تھی۔

"گڈ مارننگ انکل......"

وہ اپنے ہاتھ میں تھامی بٹر نائیف کی مدد سے دائیں ہاتھ میں موجود ٹوسٹ پر مارجرین لگانے میں مصروف تھا۔ جب اس کے ساتھ والی چیئر شافعہ نے آکر سنبھال لی تھی۔

"گڈ مارننگ بیٹا...... ہاؤ آر یو؟ شارق عباس جواباً اس کو وش کرتے مسکرائے سدحان بدستور اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے اک نگاہ غلط بھی اپنے ساتھ بیٹھی اس عورت پر ڈالنا گوارا نہیں کی تھی۔

"ایم فائن انکل! آپ کیسے ہیں؟" کن اکھیوں سے اپنے مجازی خدا کے چہرے پر پھیلے تاثرات کا جائزہ لیتے وہ بدقت مسکرائی تھی۔

"صاحب......صاحب......"

اسی وقت سردار بانو کے پیچھے بدحواس سا چوکیدار ڈائننگ روم میں اندر داخل ہوا تھا۔

"آپ جلدی سے باہر آجائیے صاحب۔"

"کیا بات ہے اللہ دتا...... سب ٹھیک تو ہے......" شارق صاحب چونک کر متوجہ ہوئے۔

"صاحب ڈوگی...... اور نوزی مر گئے...... پتا نہیں ان دونوں کو کیا ہوا...... وہ دونوں مر گئے...... آپ جلدی باہر آجاؤ...... صاحب۔" اللہ دتا خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم......؟" ڈوگی اور نوزی کے مرنے کی خبر سن کر شارق عباس ایک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اللہ دتہ کے عقب میں کھڑی سردار بانو کی نگاہ بے ساختہ ہی سدحان صاحب کی سمت اٹھ گئی تھی۔

جو بے حد پرسکون انداز میں بیٹھے تھے۔

گویا یہ خبر سن کر انہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

جبکہ ان کے برعکس مجھے بھی تو کچھ نہ کچھ بولنا چاہیے والی کیفیت سے دوچار ہوتی شافعہ ساریو...... "مائی گاڈ! یہ اس گھر میں ہو کیا رہا ہے۔" کہتی شارق عباس

کے پیچھے ہی ڈائننگ روم سے نکل گئی تھی۔

"اللہ دتا کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔"

"رکو تم......" کھچڑی بالوں والی اس بڑھیا کو بیرونی دروازے کی جانب قدم اٹھاتے دیکھ کر سدحان نے پیچھے سے آواز دی تھی۔

"جی صاب!" وہ مڑی نہیں مگر پھر بھی رک ضرور گئی۔

"میں نے کل رات کو جو تم سے کہا تھا...... وہ یاد ہے ناں؟"

"جی...... جی صاحب......"

"یہی بہتر ہے...... دو دن بعد میں تم کو شارق ولا میں نہ دیکھوں؟"

اپنی بات دہراتا وہ اس سے بھی پہلے ڈائننگ روم سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

"کوئی مجھے بتائے گا کہ...... شارق ولا میں ایسا کون سا جاسوس گھس آیا ہے...... جو ہر روز اک نئی افتاد کا سامان ہے ادھر...... نوزی اور ڈوگی پر نظر پڑتے ہی شارق عباس چراغ پا ہو اٹھے تھے۔

"ہر دن نیا تماشا ہو رہا ہے یہاں......" وہ کہے بنا نہ رہ پائے۔"

"کبھی ہماری پکچرز سوشل میڈیا پر وائرل ہو رہی ہیں...... کبھی مہمانوں کے کھانے میں کچھ ملا دیا جاتا ہے۔ تو کبھی میرے جلسے کی تقریر میں گڑبڑ کر دی جاتی ہے۔ مگر آج تو حد ہو گئی ان معصوم کتوں کو......"

"مجھے...... مجھے لگتا ہے...... میرا نمک لڑ گیا ہے تم لوگوں کے ساتھ...... یقیناً اس گھر کا کوئی بہت ہی پرانا ملازم...... اس جاسوس کے ساتھ مل کر یہ سب حرکتیں کر رہا ہے......" لان میں کھڑے تمام ملازمین پر وہ ایک ساتھ چلائے تو سب کی گردنیں جھک گئیں اور نگاہیں بھی

"اپنے جملے کی تصحیح کر لیجیے پاپا۔"

اگلے ہی لمحے وہ سب کے سب اپنا سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہاں ابھی ابھی آئے سدحان صاحب کی اگلی بات نے ان سب کو چونکا دیا تھا۔

"اس گھر کا کوئی پرانا ملازم نہیں...... بلکہ...... اس گھر کا کوئی نیا فرد اس جاسوس کے ساتھ مل کر یہ سب حرکتیں انجام دیتا پھر رہا ہے۔"

"سدحان...... تمہارا مطلب......؟" شارق عباس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"واٹ ڈو یو مین...... مسٹر سدحان......" جبکہ اس اچانک کیے گئے وار پر اپنے سسر کے قریب کھڑی شافعہ ایوب اچھل ہی پڑی تھی۔ "مقصد کیا ہوا آپ کی اس بے تکی بات کا......؟" اپنے ساتھ کھڑے اس شخص کو اس نے تیوریاں چڑھا کر گھورا تھا۔

"مقصد!" وہ جو لبوں پر چبھتی ہوئی مسکراہٹ لیے اس کو تک رہا تھا یک لخت اس کے روبرو آ کھڑا ہوا اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا۔

"مطلب و مقصد یہ شافعہ بی بی...... کہ زنجیروں کے ساتھ بندھے یہ معصوم...... پالتو کتے کچن میں جا کر کیبنٹ سے چوہا مار دوائی نکال کر کھانے سے تو رہے...... ظاہر ہے وہ دوائی وہاں سے کسی نے نکال کر ان کی کافی...... آئی مین دودھ میں ملائی ہو گی۔ جب ہی تو وہ دودھ پینے کے بعد یہ دونوں معصوم کتے مر گئے...... لفظ "کافی" کو کھینچ کر ادا کرتا وہ ملازموں سے بھرے لان میں کھڑی شافعہ کو دو کوڑی کا ہی تو کر گیا تھا۔

"سدحان شارق!" وہ چلا کر رہ گئی۔ اپنی پول اس قدر جلد کھل جانے کا یقین جو نہیں تھا اسے۔

"انکل...... انکل سن رہے ہیں...... آپ بس اک اسی الزام کی کسر رہ گئی تھی...... میں اب اس گھر میں ایک پل نہیں ٹھہروں گی......" حواسوں میں آ کر شارق عباس سے مخاطب ہوئی تھی۔

"شٹ یور ماؤتھ بلڈی بچ...... سدحان چیخا۔

"تم کیا اس گھر میں نہیں رکوں گی...... میں خود تم کو اب یہاں مزید ایک سیکنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتا...... سو

گیٹ لاسٹ فرام مائی ہاؤس......'' شافعہ کی بات کے جواب میں وہ مٹھیاں بھینچ کر اتنی قوت کے ساتھ دھاڑا تھا کہ گردن کی رگیں پھول گئیں۔

''سدحان...... بی ہیو یور سیلف......'' کب سے خاموش کھڑے شارق عباس ہڑبڑا کر سامنے آ گئے۔ ''تم ہوش میں تو ہو......؟''

''پاپا......'' قبل اس کے پاپا اپنا جملہ مکمل کرتے...... اس کی پکار پر نگاہ جو اٹھی تو وہ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔

دونوں باپ بیٹے کی نظریں لمحہ بھر کے لیے آپس میں باہم ٹکرائی تھیں...... اور اس کے ساتھ ہی جیسے شارق عباس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''کیا نہیں دیکھا تھا آج انہوں نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں...... رتجگے تو خیر ان بے خواب آنکھوں کا مقصد ٹھہرے۔ لیکن شکست، کرب، بے بسی، بے کسی مایوسی و رنج اور سب سے بڑھ کر وہ نمی جو اس وقت ان سرخ آنکھوں کی سطح پر اچانک ابھری تھی۔

''سدحان......'' شارق صاحب کے لبوں پر اس کا نام پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

''پاپا...... میں...... اس عورت کو اب اپنی زندگی میں ایک پل بھی مزید برداشت نہیں کر سکتا......''

''سدحان...... سدحان...... تم جو کہو گے وہی ہوگا۔ تم پلیز میرے ساتھ اندر چلو...... مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' شارق عباس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ اس کا بازو تھام کر اسے اندر لے جانے لگے۔

''نہیں پاپا!'' سدحان نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''میں اس گھر میں اب دوبارہ تب ہی قدم رکھوں گا...... جب یہ مکار عورت یہاں سے دفع ہو چکی ہو گی...... سنا آپ نے۔''

''اینڈ...... یو گو ٹو ہیل......'' پاپا کی بات کا جواب دینے کے بعد اس نے انگلی تان کر شافعہ کو متنبہ کیا تھا اور پھر اپنی گاڑی نکال لے گیا۔

''ہونہہ! مائی فٹ......!'' اس کے جانے سے بھی پہلے شافعہ اپنے روم میں آ گئی تھی۔ وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہی تھی سو پیکنگ کرنے لگی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا...... شافعہ نے سدحان کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے'' شارق عباس نڈھال سے اپنی اسٹڈی میں آ گئے۔

''اور اگر وہ کافی سدحان پی لیتا تو؟'' انہوں نے اپنی کنپٹیاں تھام لی تھیں۔

''اچھا ہے شافعہ اس گھر کو چھوڑ کر چلی جائے۔ مجھے اب اس کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں......'' وہ زیر لب پھنکارے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ شافعہ کے علاوہ بھی کوئی اور تھا جو شارق ولا سے اپنا بوریا بستر گول کرنے کی تیاریوں میں تھا ہاں اور وہ تھی مائی سردار بانو کل شام سے پہلے وہ شارق ولا کو چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔

ویسے بھی اس کا کام یہاں سے اب ختم ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''میں اس مسٹر رانجھے...... دیوداس کا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں......''

''مائی گڈنیس......'' سہیل نے فون پر ہی اطلاع سنتے قہقہہ لگایا۔ وہ شارق عباس کے کام کی وجہ سے لاڑکانہ میں رکا ہوا تھا۔

''سوئیٹ ہارٹ واؤ! صبح صبح یہ گڈ نیوز...... آئی لو یو۔'' دوسری جانب وہ چہک ہی تو اٹھا تھا۔

''لو یو ٹو ناظم صاحب!'' وہ بھی کھل کھلائی تھی۔

''ویل وہ تم کو ڈائیورس تو دے دے گا ناں؟'' سہیل کو جانے کیوں اس بارے میں وہم سا لاحق تھا۔

''آف کورس! بقول اس کے گیٹ لاسٹ فرام مائی ہاؤس۔ اس کا مطلب تو یہی نکلتا ہے وہ مجھ سے مکمل طور پر بیزار ہو چکا ہے۔''

''سو گڈ! الس مین...... اس رانجھے دیوانے کے ففٹی پرسنٹس شیئرز کی مالک بن گئیں تم اب......؟''

"جی جناب، اینڈ ہمارے دل کے پورے مالک ہوئے آپ۔"

"اور تم میری زندگی کی مالک ہو شافی...... آئی کانٹ ٹیل یو میں نے یہ اک اک لمحہ کانٹوں پر لوٹتے بسر کیا ہے...... ادھر وہ دیوداس تمہاری جان چھوڑے گا ادھر ہم دونوں شادی کرلیں گے......"

سہیل فاروق اپنے دل کی بات زباں پر لے آیا تھا۔

اور شافعہ ایوب کی مراد تھی۔

☆☆☆

ایسے کملایا ہوا رہتا ہے، من شام کے بعد
جیسے اکثر کوئی ہوتا ہے چمن شام کے بعد
تو تو خوش ہے نا مجھے شب کے حوالے کر کے
دیکھ جا آ کے دل کا چلن شام کے بعد

وہ گھر سے آفس تو آ گیا تھا لیکن کام کی جانب دل مائل نہ ہوسکا کیونکہ جس طرح کی سچویشن میں وہ گھر سے ادھر آیا تھا وہ کافی تھی...... سدحان نے آج کی تمام میٹنگز اپنی سیکریٹری سے کہہ کر کینسل کروادی تھیں۔ اندر کی گھٹن مزید بڑھی تو وہ بارہ بجے کے قریب آفس سے ہی اٹھ آیا اور گھر جانے سے قبل اس نے شافعہ کے شارق ولاز سے نکل جانے کی تصدیق پہلے کی تھی۔

سدحان کی گاڑی پورچ میں رکی تو شارق عباس جو صبح سے اسٹڈی روم میں بند تھے پہلی بار باہر آئے تھے اور ماسی جنت سے کہہ کر انہوں نے لنچ ٹیبل پر لگوادیا۔ شام سات بجے کی ان کی سکھر کی فلائٹ تھی سو اس لیے وہ کچھ وقت سدحان کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ لیکن اس نے لنچ کرنے سے ہی انکار کردیا تھا۔ جب سے وہ آفس سے آیا تھا کمرے میں بند تھا۔

"سدحان! تم لنچ کرنے نیچے نہیں آسکتے تو کھانا اوپر بھجوادوں۔" پاپا نے اس کال ملائی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے پاپا۔"

ڈریسنگ روم سے باہر آکر سدحان نے کال ریسیو کی تھی۔

"سدحان پلیز میری خاطر!......" انہوں نے اسے بچوں کی طرح پکارا گئے۔

"میری شام کو سکھر کی فلائٹ ہے لاسٹ جلسہ نہ ہوتا تو میں فلائٹ کینسل کروادیتا۔"

"پاپا! آپ اپنی فلائٹ کیوں کینسل کروا رہے ہیں۔ میں مرا تو نہیں جارہا اس عورت کے غم میں......" خس کم جہاں پاک لب بھینچتے ہوئے سدحان نے جملہ مکمل کیا تھا اور کال منقطع کردی۔

شارق عباس نے کھانا ٹیبل سے ہٹانے کا اشارہ کردیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے اور پھر شام کو ایئرپورٹ کے لیے نکلنے سے آدھا گھنٹہ قبل شام کی چائے لان میں لگوانے کے بعد سدحان کو اک بار پھر کال ملائی تھی۔

"سدحان! میں چائے پر تمہارا ویٹ کررہا ہوں تم نیچے لان میں آجاؤ۔"

"سوری پاپا! میرا موڈ نہیں ہے۔" بیک گراؤنڈ میں بجتے سیڈ میوزک کی وجہ سے سدحان کی آواز بمشکل سنائی دی تھی۔

شارق عباس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

☆☆☆

"یہ چائے سے سدحان سائیں کے بیڈروم میں دے آؤ۔" شارق صاحب نے قریب کھڑی سردار بانو کو حکم دیا۔

"جی اچھا صاحب۔" سردار بانو نے جھک کر چائے کی ٹرے اٹھالی تھی اور یہ وہ وقت تھا جب اس کی نظریں پاس کھڑی ماسی جنت سے جاٹکرائیں۔ ماسی جنت کے چہرے پر چھائی تفکر کی لکیروں سے نگاہ چراتی وہ ٹرے اٹھائے سدحان صاحب کے روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تھی تب اس نے تین دن کی بڑھی ہوئی شیو میں سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس سدحان کو بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں پایا تھا۔ اس

کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں اور وجیہہ چہرے پر بکھرے گہرے حزن کا جائزہ لیتی سردار بانو چونکے بنا نہ رہ پائی تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھے آنکھیں بند تھیں چہرے پر اداسی اور دل گرفتی کی کیفیت تھی۔

جو بھی تھا چاک گریباں کا تماشائی تھا
تو نہ ہوتی تو یہ تدبیر رفو کرتا کون؟
ایک ہی ساگر زہر آب محبت کافی تھا......!
دوسری بار تمنائے سیہ کرتا کون......؟

لوگ مجھے دیکھ کر رانجھے اور فرہاد کی مثالیں بیان کرنے لگ جاتے ہیں...... شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ میں ان جیسا دیوانہ ہوں پر وہ نہیں جانتے کہ دیوانگی اور وحشت میں بہت فرق ہوا کرتا ہے۔ تمہارے دیدار کی لگن میرے دل کی رگوں میں وحشت بن کر اتر گئی ہے یہاں تو یہ عالم ہے کہ

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

تم ہی بتاؤ اے! جھانسی کی رانی میں نے تم کو کہاں نہیں ڈھونڈا اور تم تو وہاں بھی نہیں ملیں جہاں ہم پہلی و آخری مرتبہ ملے تھے۔ کیا ضروری ہے اس بار ہم پورے چاند کی روشنی میں ملیں کیا ضروری ہے اس مرتبہ بھی جب ہم ملیں تو ہم دونوں کے پاؤں کے نیچے صحرا کی ریتلی زمین ہی ہو...... کیا ضروری ہے کہ جب ہم ملیں تو جنگجو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں ہمارے اردگرد سنائی دیتی ہوں......؟ جان سدحان یہ ضروری تو نہیں کہ جب ہم روبرو ہوں دونوں کی تلواریں اعلان جنگ کرتی نظر آئیں اس بار تم سراپا سادگی و سپردگی بن کر بھی تو سامنے آسکتی ہو۔ کیا اب دنیا میں معجزے نہیں ہوتے......

یا پھر اللہ سائیں نے معجزے کرنے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ سچ ہے...... تمہارے سولہ سنگھار تو اس رات بھیگی چاندنی میں دیکھ چکا ہوں اور آج تم کو سادگی میں دیکھنے کی دعا مانگ رہا ہوں۔ میں بھی کتنا پاگل ہوں ہر روز تمہارے سامنے آنے کی التجا کرتا ہوں جو بیکار ہے بابا ٹھیک کہتے ہیں ویسے اب تک تو تم کسی کی بیوی یا پتنی بھی بن چکی ہوں گی جس طرح میں شافعہ کو اپنی بیوی بنا کر شارق ولا لے آیا تھا۔

''ہاں'' شافعہ جس کو میں کچھ بھی نہیں دے پایا کہ میرا یہ دل تو اس رات تمہاری تلوار کی نوک پر آ گیا تھا اور رہا یہ کھوکھلا وجود تو اس کی میری نگاہ میں کچھ وقعت ہی نہیں ہے۔''

اک بے باک آنسو سدحان کو بھگوتا ہی چلا گیا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب کسی بت کی طرح خواب گاہ کی وسط میں کھڑی سردار بانو کے ہاتھ کپکپائے تھے اور چائے کی ٹرے چھوٹ کر کارپٹ پر جا گری۔ برتن ٹوٹنے کی آواز پر سدحان صاحب نے چونک کر اپنی دونوں آنکھیں کھول دی تھیں۔

''یو نان سینس!''

کارپٹ پر جھکی سردار بانو پر نگاہ پڑتے ہی وہ چلا اٹھے۔

''تم...... تمہاری جرأت بھی کیسے ہوئی میرے بیڈ روم میں قدم رکھنے کی......؟'' سدحان اس کے قریب آ کر دھاڑا تو مارے بوکھلاہٹ کے ٹوٹے ہوئے مگ کا ٹکڑا اس کی سانولی ہتھیلی میں اتر گیا۔

''سنا نہیں ایڈیٹ! تم نے گیٹ لاسٹ فرام ہیئر......''

اسے اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیتے ہوئے سیاہ سوٹ میں ملبوس اس دیو داس کے لہجے میں اتنی حقارت تھی کہ باوجود کوشش کے سردار بانو اپنے آنسوؤں کو رخساروں پر بہنے سے نہ روک پائی تھی دوسرے ہی لمحے وہ روتی ہوئی اس کے کمرے سے دوڑ گئی۔

جبکہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا اس کی چال کی پھرتیوں پر غور کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

ہم تو خوش تھے کہ چلو دل کا جنوں کچھ کم ہے
اب جو آرام بہت ہے تو سکوں کچھ کم ہے
اس نے دکھ سارے زمانے کا مجھے بخش دیا

پھر بھی لالچ کا تقاضا ہے کہ کہوں کچھ کم ہے
وہ کہاں سے نکلی تھی کہاں جا رہی تھی، نہیں جانتی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں کے آگے چھائی دھند نے ہر منظر دھندلا دیا تھا وہ لاؤنج سے نکل کر بھاگتی ہوئی اپنے کوارٹر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر اپنے کوارٹر میں پہنچتے ہی اس کے آنسوؤں کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی تھی اور پھر سسکتے ہوئے اپنا خوب صورت چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔ زخمی ہتھیلی سے بہنے والا سرخ خون سانولی سی نازک کلائی کو لکیروں کی صورت بھگو چکا تھا مگر اس کو جیسے کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔

وہ رو کیوں رہی تھی......؟ اس کے آنسو اتنی شدت سے کیوں بہہ رہے تھے؟ کیا اسے شارق عباس کے بیٹے کے ڈانٹنے کا اتنا دکھ ہوا تھا...... نہیں بلکہ ایک بہت ہی پرانا خواب جس کو وہ شجر ممنوع سمجھ کر کب کا بھلا بیٹھی تھی آج وہ ہی خواب حاصل زیست بن کر اس کی آنکھوں کو اچانک چندھیا گیا تھا۔

ایسا ہی کچھ تو سردار بانو کے ساتھ ہوا تھا۔

کہا تھا کس نے کہ وحشت میں چھاپیے صحرا
کڑی ہے دھوپ تو سر پہ تاپیے صحرا
بس اک ذرا سے اجڑنے پر زعم کتنا ہے
یہ دل بضد ہے کہ اس کو ماپیے صحرا

☆☆☆

وہ آدھا دن اور پوری رات بنا کچھ کھائے پیے اس نے اپنی خواب گاہ میں جاگتے ہوئے تھی۔ صبح کو تیار ہو کر وہ نیچے آگیا ایک ٹوسٹ کے ساتھ آدھا کپ سونف والی چائے پی اور شارق ولا سے نکل گیا۔

آفس پہنچ کر اس نے پہلی فرصت میں اپنے وکیل کو کال کی تھی۔

اگلے پچیس منٹ بعد ہی ایڈوکیٹ ثاقب میمن اس کے شاندار آفس میں موجود تھے۔

سدحان نے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ثاقب میمن کو اپنے اور شافعہ کے ڈائیورس پیپر تیار کرنے کا آرڈر دیا تھا۔

''بٹ سر اتنی ارجنٹ......؟''

''اپنے کام سے کام رکھیے۔ مسٹر ثاقب......'' سدحان کا لہجہ تلخ بھرا تھا۔ آپ سے جو کام کرنے کے لیے کہا ہے بس وہی کیجیے......''

''سوری سر!''

''یہ تو آپ جانتے ہوں گے اس ڈائیورس کے بعد آپ کے ففٹی پرسنٹ شیئرز کی مالک آپ کی مسز شافعہ سار یو بن جائیں گی۔''

''آئی ڈونٹ کیئر! مسٹر میمن! میں بس اس ریلیشن کو جلد از جلد ختم کر دینا چاہتا ہوں۔'' یہ بات کہتے ہوئے اس کے لہجے میں کوئی لچک نہیں۔

ثاقب میمن نے رک کر بغور اس شاندار شخص کو دیکھا جسے دولت کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور ہوتی بھی کیوں کیونکہ اس کے پشتوں کی چھوڑی ہوئی اتنی جائیداد سدحان شارق کے نام تھی کہ اگر وہ ساری عمر بھی بیٹھ کر کھاتا تو بھی ہرگز کم نہیں پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

غم سے ملی نہ دل کو رہائی تمام شب
ہم نے تمہاری منائی تمام شب
دل کی خلش نہ مانی اگرچہ ہم
دیتے رہے اپنی صفائی تمام شب

وہ تمام شب اس نے آنسو بہاتے کاٹی تھی۔ جس کے لیے سسک سسک کر اپنی ہتھیلیاں بھی اللہ سائیں کے سامنے پھیلائیں تھیں وہ دعا پھول بننے کے بجائے ببول بن گئی تھی۔

کیا ضروری تھا وہ اسے کل شام اس حال میں ملتا؟

مگر کیا یہ ضروری تھا کہ وہ یہاں شارق ولا میں آجاتی لیکن وہ یہاں آگئی تھی اور آج اس کو یہاں سے چلے جانا تھا۔

تمام رات جاگنے کے سبب صبح کی نماز قضا کر بیٹھی تھی یہی وجہ تھی ناشتے کے دوران اس سے سامنا نہ ہو کا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے لیے آملیٹ

ماسی جنت نے بنایا تھا یا سرے سے اس نے آج آملیٹ کھایا ہی نہیں تھا۔

سردار بانو کی آنکھ بارہ بجے کھلی تھی اپنا اک نیا سوٹ نکال کر وہ اس چھوٹے سے غسل کھانے میں جا گھسی نہانے سے پہلے وہ اپنی ہتھیلی پر بینڈ ایج کرنا نہیں بھولی تھی کل سدحان شارق کے روم سے ٹوٹے ہوئے کپ کے ٹکڑے چنتے ہوئے اس کو یہ چوٹ لگی تھی۔ جسے اس نے ماسی جنت سے چھپالیا تھا۔

☆☆☆

ایڈووکیٹ ثاقب میمن کو اپنی بات سمجھانے کے بعد وہ آفس سے اٹھ آیا تھا کیونکہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس وقت اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سو آج بھی اس نے اپنی شام کو ہونے والی میٹنگ کینسل کروادی تھی۔

☆☆☆

آسمانی بلیو اور گلابی رنگ کے لان کے بے حد قیمتی واشا کشش سوٹ میں ملبوس اپنے گیلے بال پشت پر پھیلائے وہ واش روم سے باہر نکلی تھی جب۔

گرما گرم بریانی کی دو پلیٹیں تھامے ماسی جنت کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

''آجائیں بی بی جلدی سے،'' ماسی جنت نے تپائی پر پلیٹیں رکھتے ہوئے اسے بلایا۔

آج شارق ولا میں کوئی نہیں تھا سو یہ دعوت بارش کی خوشی میں ماسی جنت نے منائی تھی۔

مجھے بھوک نہیں دیوار میں لگے چھوٹے سے آئینہ اسٹینڈ پر سے اپنا ہیئر برش اٹھاتی وہ اداس لہجے میں انکار کرگئی۔

''کیا بات ہے بی بی آپ نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا......؟'' ماسی جنت اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ ''صبح ناشتہ بھی نہیں کیا آپ نے اور اب..... دوپہر کا کھانا کھانے سے بھی انکار کر رہی ہیں بی بی آپ مجھے کچھ اداس لگ رہی ہیں؟''

''ماسی جنت! میں اور اداس......؟'' اس نے رک کر آنکھیں نچائیں۔

''آپ کو اداس میں کس خوشی میں نظر آنے لگی۔'' مصنوعی ہنسی اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے وہ کھل کھلائی تھی۔

☆☆☆

ایسا گم ہوں تیری یاد کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

جس سے مجبور ہو کر اس نے چینج کرنے کا ارادہ ترک کیا اور ماسی جنت کو ڈھونڈتا ہوا اس کے کوارٹر تک آگیا تھا۔

''مائی جنت! ایک کپ چائے کا فٹافٹ۔''

کمرے میں داخل ہونے سے قبل ہی اس کا جملہ اس کے لبوں پر دم توڑ چکا تھا اور قدم دہلیز کے باہر جم گئے کیونکہ کوارٹر کے اندر سے آتی ہوئی منظر میں بجتی گھنٹیوں جیسی ہنسی کی آواز سن کر وہ حیران ہی ایسا ہو گیا تھا۔

''آپ مجھے ٹال رہی ہیں بی بی......؟''

آبشاروں جیسی کھل کھلاہٹ کے جواب میں ماسی جنت کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''میں دیکھ رہی ہوں، آپ کل شام سے اداس ہو......''

''ہاں'' کل شام جب سے آپ سدحان سائیں کے کمرے میں ان کے لیے چائے لے کر گئی تھیں کیا سدحان سائیں نے آپ کو کچھ کہہ دیا تھا کل......؟''

اور کمرے کے باہر کھڑے سدحان کو یاد جود کوشش کے ذہن لڑانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ کل شام آخری بار اس کے کمرے میں چائے لانے والی سردار بانو تھی کوئی بی بی نہیں۔

اگلے ہی پل اس نہج پر سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں دھما کا سا ہوا تھا۔

''کم آن ماسی جنت مجھے کچھ نہیں کہا آپ کے سدحان سائیں نے...... میں تو بس ذرا سی گم صم تھی وہ بھی اس لیے کہ آج شارق عباس کا لاسٹ جلسہ ہے سکھر میں اور اس کی کوریج مجھے دیکھنی تھی بٹ......

بارش کی وجہ سے انٹرنیٹ ایکٹو نہیں۔"
"سیل پر......!"
"ہا! اللہ کری سائیں کھٹی ونی......"
(ہاں، اللہ کرے شارق سائیں جیت جائیں)
مائی جنت اس بار شاید مسکرائی تھی۔
"اور میری دعا ہے کہ اللہ کرے میرے بابا اسحاق نظامانی جیت جائیں۔"
مندروں میں بجتی گھنٹی جیسے والی وہ بی بی بولی تو مائی جنت کے کوارٹر کی چوکھٹ پر کھڑے سدحان شارق کے جبڑے آپس میں جڑ گئے۔ لمحے کی ہزارویں ساعت وہیں کھڑے کھڑے اسے اپنی اور اپنے سیاست دان باپ کی عقل پر ماتم کرنے کا ہی تو جی چاہا تھا جنہیں اس درجہ آسانی کے ساتھ بے وقوف بنا دیا گیا تھا۔
سدحان کو اس سردار بانو پر تو اول روز سے ہی شک تھا۔ جب اس دن انگلینڈ سے آنے کے بعد اس نے شارق ولا کے کوریڈور میں قبضے رکھا تھا اور اس کی سانولی سی بڑھیا کو ڈائننگ روم کی کھڑکی کے ساتھ کان لگائے کھڑا پایا تھا وہ چونکا تو اسی روز گیا تھا مگر بعد میں شافعہ اور اپنی مس انڈر اسٹینڈنگ کی وجہ سے اور اپنی گم شدہ محبت کے غم میں کھو کر اس مکار ملازمہ پر دھیان نہ دے سکا۔
حالانکہ بابا کے جلسے کی تقریر چینج ہونے والا واقعہ بے حد چونکا دینے والا تھا۔ شافعہ کا باپ ایوب ساریو الیکشن تو نہیں لڑ رہا تھا جو وہ تقریر شافعہ کو چینج کرنے کی ضرورت پڑتی۔ یقیناً یہ کام بھی اس بہروپیا بن کر یہاں آ کر رہنے والی اسحاق نظامانی کی اس بیٹی سردار بانو کا ہی تھا۔ اس انکشاف کے ہوتے ہی سدحان کی مٹھیاں بھنچ گئیں دوسرے ہی لمحے دن فائیو اپنی سیل پر ڈائل کرتا اس لڑکی کو ابھی اور اسی وقت پولیس کے حوالے کرنے کا پکا ارادہ کرتے وہ اس چھوٹے سے کوارٹر میں داخل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

غور کیا تو معلوم ہوا
وہ روبرو آیا تھا......!
جس کو ہم اپنا وہم سمجھے تھے
وہ تم تھے تمہارا سایہ تھا

کمرے کے وسط میں کھڑی اس لڑکی کا نازک سا دل اس کے پہلو سے اچھل کر اس کے حلق میں کیوں آ گیا تھا۔ براؤن کلر کا وہ ہیر برش جس سے وہ اپنی پشت پر پھیلی ناگنوں کو سلجھانے کا ارادہ رکھتی تھی ہاتھ سے چھوٹ کر پیروں کے پاس کیوں جا گرا تھا؟
ایش گرے ٹو پیس میں ملبوس وہ راجپوتوں جیسی آن بان رکھنے والا شہزادہ بے حد اچانک اس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا تھا مگر آج ہی کیوں؟ آج یہاں...... اس وقت...... اس کا آنا ضروری تھا کیا......؟ بس کچھ ہی دیر میں تو وہ یہاں سے چلی جانے والی تھی...... انٹرنیٹ ایکٹو ہوتے ہی وہ اپنے لیے اوبر (uber) ہائیر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر اچانک سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا تھا۔
"سائیں......؟" مائی جنت کا منہ شام کو گھر لوٹنے والے مالک کو اس وقت اپنے سامنے پا کر کھل گیا تھا۔

☆☆☆

ذرا غروب ہو تو میں رکوں
تجھے ڈھونڈ رہا ہوں آفتاب میں
کبھی کھیل کھیل میں ہی مجھے
ذرا آملو کسی خواب میں

کوارٹر میں اندر داخل ہونے سے قبل مارے اشتعال کے جس کا برا حال تھا کمرے کی دیوار پر لگے آئینہ کے پاس کھڑے وجود پر نگاہ پڑتے ہی حیرت سے بت کیوں بن گیا تھا وہ......؟ وہ بھول گیا تھا کہ وہ سردار بانو کو پولیس کے حوالے کرنے میں ادھر آیا تھا۔
ساتوں آسمان آن واحد میں ہی سدحان شارق کی نگاہوں کے سامنے کیوں گھوم گئے تھے؟ اس کے پیروں کے نیچے جو زمین کا حصہ تھا، وہ گردش میں کیوں آ گیا تھا؟ اسے اس پل اس کا اپنی بصارتوں پر اعتبار کرنا مشکل کیوں ہو گیا تھا......؟

وہ جوگن جو اسے منشار جا کے صحرا میں ملی تھی اور اسے اپنی آنکھوں سے دیوانہ بنا گئی تھی۔ جس کے لیے ہر رات وہ رتجگوں کو اپنی پلکوں پر بنتا تھا۔

اس کے لیے "ہاں" اس کے لیے...... ایسا کون سا ریگستان تھا اس نے جس کی خاک نہیں چھانی تھی۔ اور وہ اسے ملی بھی تو کہاں پر؟ خود اس کے اپنے گھر میں......! شارق ولا میں؟

یہ آخری خیال اس راج کماری کو تلاش کرتے سدحان شارق کے من میں کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ کسی محل میں رہائش پذیر ہونے کے بجائے چھوٹی سی اس کٹیا میں رہتی ہوگی۔

اور بھلا یہ خیال اسے آتا بھی کیسے کہ راج کماریاں کب محل چھوڑ کر سرونٹ کوارٹرز میں رہا کرتی تھیں۔

ساقیا اک نظر جام سے پہلے
ہم کو جانا ہے کہیں شام سے پہلے

اپنی ساحر آنکھیں بارش میں نہائے اس گلاب پر جمائے۔ وہ دم بہ خود لب بستہ کھڑا تھا۔

یہاں تک کہ اس دیوانے کی نگاہوں کی لو سے بارش میں بھیگے اس گلاب کا چہرہ جل اٹھا تھا۔

سرمئی آنکھیں جھک کر جھک گئیں۔ اور کٹاؤ دار لب کچھ کہنے کی کوشش میں کپکپا گئے۔

سجدہ اسحاق کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود کو کیسے ان لو دیتی آنکھوں کی تپش سے پگھلنے سے بچا پائی۔ گھنی پلکوں سے ٹوٹنے والے آنسو رخساروں پر پھسلے۔

سدحان کی آنکھیں جل اٹھیں۔ یہ کوئی وہم نہیں تھا بلکہ اس "ہوا کیل" کو سادگی میں دیکھنے کی مانگی جانے والی دعا کی قبولیت تھی۔ اسے اس وقت یقین آگیا تھا وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہاں کوئی خواب نہیں تھا یہ۔

"سا...... ئیں......" گھبرائی گھبرائی سی ماسی جنت دفعتاً ان دونوں کے درمیان آ کھڑی ہوئی تھی۔

مگر سدحان کو اس کی آواز تک سنائی نہ دی نگاہ بھٹک کر چارپائی کے سرہانے رکھے اس اپسرا کے ہتھیاروں پر گئی اور پلٹنا بھول گئی بلیک کانٹیکٹ لینس، تکیے کے قریب پڑا گھنگری رنگ بالوں والا وگ لمبے لمبے دانتوں والا فریم اور براؤن ٹون والی بیس کٹ کو دیکھ کر وہ چونکا تھا نہ ٹھٹکا تھا۔

البتہ خوب صورت ہونٹوں کی تراش میں پھیلنے والی مسکراہٹ کا نزول شب کے آنچل پر ٹمٹماتے جگنو جیسا تھا اور۔

یہی وہ لمحہ تھا جب کچھ فاصلے پر کھڑی سجدہ اسحاق کا وجود پانی پانی ہو گیا تھا۔

لب کے نچلے کونے پر تازہ غسل کی وجہ سے مہکتا پانی کا قطرہ گال پر پھسلنے والے آنسو کے ساتھ مل گیا تھا۔

اور اس منظر کی سندرتا کی تاب نہ لاتے ہوئے سدحان شارق کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماسی جنت کی موجودگی کی پرواہ کیے بنا ہی آگے بڑھ کر اپنا من اس چندر مکھی شہزادی کے قدموں میں وار دیتا، جو آج بھی اپنے بے پناہ حسن سے اسے ساکت کر گئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج وہ تلوار نہیں چلا رہی تھی بلکہ آنسوؤں کی آری سے اس راجپوت شہزادے کے دل کو ذبح کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ حالانکہ اک لفظ بھی تو وہ اس سے نہیں بولا تھا۔

پھر بھی وہ کٹی چلی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کے آنسوؤں سے ہار کر وہ خاموشی سے دروازے کی جانب پلٹ گیا تھا۔

"صاب..... سدحان صاحب میری بات سنیے" ماسی جنت بڑبڑا کر اس کی سمت لپکی تھی۔

سجدہ اسحاق اس شخص کے جانے کے بعد کسی بے جان گڑیا کی طرح دوزانو پر بیٹھتی چلی گئی تھی سدحان کی خاموشی نے اس کے ملال و ندامت کو بڑھا دیا تھا اپنا نازک اور خوبصورت چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ پوری شدت کے ساتھ رو رہی تھی۔

یہی اک لمحہ جو دریافت کر لیا میں نے
وصال جاں ہے یہی اور فراق جاں ہے یہی

تم ان میں سے ہو جو فتح مند ٹھہرے
سنو کہ وجہ غم دل شکست گاں ہے یہی

اس کو آج یہاں سے چلے ہی جانا تھا تو کیا ضروری تھا وہ آج کو اس کو اپنے اصلی روپ میں دیکھ لیتا۔ کچھ ہی دیر بعد بارش کو تھم ہی جانا تھا۔ نیٹ ورک ایکٹو ہوتے ہی سجدہ نے اوبر (Uber) کو شارق ولا کی لوکیشن سمجھا دی۔ اپنے کپڑوں کا اٹیچی کیس تو وہ کل ہی تیار کر رکھ چکی تھی۔

☆☆☆

''سائیں میں سچ کہتی ہوں بی بی جس جگہ پڑھتی ہیں وہاں یونی (یونیورسٹی) کے لڑکے لڑکیاں آپس میں مل کر کوئی پھلم (فلم) بنا رہے ہیں اور بی بی کو اس پھلم (فلم) میں کسی ملازمہ کا کردار ادا کرنا تھا...... یہ ہی سبب تھا جو اس کی تیاری کرنے بی بی ادھر آگئیں ان کا کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ سائیں میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

بارش تھم چکی تھی سو کوارٹر سے نکلنے کے بعد وہ لان کی بھیگی سڑھیوں پر آبیٹھا تھا۔

جب اس کی جانب سے صفائی دینے ماسی جنت اس کے پاس آبیٹھی تھی۔

''بہت خوب'' بلیک اور سلور ٹائل والی سڑھیوں پر بیٹھا وہ حیران ہوئے بنا رہ پایا تھا۔

کس درجہ چالاک تھی وہ اپنے پلان کی ہوا تک ماسی جنت کو لگنے نہیں دی تھی اس نے اتنا تو جان لیا تھا وہ کہ پاپا کو الیکشن میں ہرانے کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔

اس نے ہر وہ کام کیا تھا جس سے پی ڈی ایس پارٹی اپنے ووٹ گنوا سکتی تھی لیکن اس کام کے لیے اس نے ماسی جنت کو کس طرح اپنے اعتماد میں لیا ہوگا یہی وہ نکتہ تھا جہاں پر آکے وہ سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن ماسی جنت نے اس کی الجھن دور کر ڈالی تھی۔

مضبوط ہاتھ کی مٹھی لبوں پر جمائے وہ اپنی پیاسی نگاہیں کوارٹر کے دروازے پر ٹکائے ہوئے تھا۔

جہاں سے اس کھلاڑی کو نکل کر باہر آنا تھا۔ وہ سڑھیوں کے درمیان بیٹھا اس کا ہی تو منتظر تھا وہ صدیوں سے بس اس کا انتظار ہی تو کر رہا تھا۔ پورے پچیس منٹ بعد بالآخر جان لیوا انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔

جونہی شارق ولا کے باہر اوبر (uber) کا ہارن سنائی دیا اپنا براؤن اٹیچی کیس گھسیٹتی وہ باہر آتی دکھائی دی تھی۔

اس نے آج باہر آتے ہوئے مائی سردار بانو کا روپ نہیں دھارا تھا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں تھی، آسمانی شیفون کے ڈوپٹے سے اپنے لمبے گھنے بال چھپائے گہری نیلی سندھی کڑاہی والی چادر نازک شانوں کے گرد لپیٹے وہ سراپا حزن دکھائی دیتی تھی وہ جو کچھ یہاں کرنے آئی تھی کر کے جا رہی تھی تو پھر یہ آنسو اور یہ ملال کس لیے......؟

اس ہوا سہیلی کو دیکھ کر افق پر چھائے بادل پھر بہک گئے تھے، ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی بوندوں کی بوچھاڑ اس کے آسمانی آنچل کو بھگو گئی تھی۔

شارق والا کا وسیع پورچ وے پار کرنے کے بعد ہی وہ بیرونی گیٹ تک پہنچ پاتی مگر وہاں تک پہنچنے سے پہلے اسے لان کی سڑھیوں کے قریب سے گزرنا تھا اور یہ قلیل سا سفر اس کے لیے کسی پل صراط سے کم ہرگز نہیں تھا کیونکہ سڑھیوں کے درمیان براجمان اس شخص کی گہری نظریں۔

اپنی پلکیں جھکائے ہونے کے باوجود وہ اپنے چہرے پر بھی محسوس کر سکتی تھی بہر حال سدحان شارق کی لو دیتی نگاہوں کو نظر انداز کرتی بالآخر وہ اس پل صراط کو پار کر ہی گئی۔

سدحان شارق کی بے تاب نگاہیں اس کے گلابی پیروں کے ساتھ لپٹی تھیں۔

جب چار قدموں کے فاصلے پر جا کر اس نے اس کو رکتے دیکھا تھا۔

''آئم سوری......'' فار ایوری تھنگ...... بھیگے سے لہجے میں وہ گویا ہوئی۔

وہ اس کی معذرت سن کر حیران ہوا۔

آج سے چار سال پہلے ایسا ہی ایک معذرتی جملہ ادا کرنے کے بعد وہ مٹھار جا میں لگے میلے کے پنڈال سے باہر نکل گئی تھی۔ اور آج چار سال بعد شارق ولا سے نکلنے سے قبل بھی اس نے یہی ایک جملہ ادا کیا تھا۔

''کیا یہ ہی ایک معذرتی جملہ تھا جو ہمیشہ ان دونوں کے درمیان آن ٹھہرا تھا۔ وہ کہاں جانتی تھی کہ کتنی ہی ان کہی باتیں تھیں جو وہ ان کتاؤ دارلبوں سے سننا چاہتا تھا۔

کتنی ان کہی شدتیں تھیں جو اس کی ساعتوں کی نذر کرنا چاہتا تھا۔

البتہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے لبوں کو حرکت ضرور دی تھی۔

''گیٹ کھول دو اللہ دتا.....'' سدحان نے چوکیدار کو حکم دیا تو اللہ دتا گومگو سا اس بے تحاشا حسین لڑکی کو حیرت سے تکنے لگا۔

''بھلا یہ سوہنی چھوکری......'' اندر کب آئی، جو اب باہر جا رہی تھی۔ بہر طور اپنی حیرت سے سنبھل کر سدحان صاحب کے اشارے پر آگے بڑھ کر اسے گیٹ وا کرنا پڑا تھا۔

''سجدہ بی بی! اللہ نگہبان۔'' پاس بیٹھی مائی جنت کے ہونٹ ہلے تھے۔

''سجدہ بی بی......؟'' تو اس ہوا سہیلی کا نام سجدہ تھا۔ سدحان کی خواب ناک آنکھیں اس نازک پشت پر جمی تھیں، دفعتاً گیٹ سے قدم باہر نکالتے ہوئے وہ اپنی صراحی دار گردن اس سمت موڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

سیڑھیوں کے درمیان بھیگتے شخص کی ساحر آنکھوں کے ساتھ ان سرمئی جاموں کا تصادم لمحہ بھر کا تھا۔

اور یہی ایک لمحہ سدحان شارق کے ہوش اڑانے کے لیے کافی ثابت ہوا۔

خماری سی خماری تھی۔ وہ کب کی وہاں سے جا بھی چکی تھی مگر وہ بے خود سا سیڑھیوں کے درمیان ہی نیم دراز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

برستی بارش میں ٹریفک کے اژدھام سے بچ بچاتی گاڑی پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کے ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے جا رکی تھی۔ بھیگی پلکوں پر اشکوں کی نمی لیے وہ گاڑی سے اتر آئی تھی۔

شارق ولا میں اس نے پورے پانچ ہفتے قیام کیا تھا۔ اپنے پاپا اسحاق نظامی کو ایم پی اے کا الیکشن جتوانے کے لیے اس نے ہر وہ کام کیا تھا جو سیاست کی دنیا کے اندر شارق عباس کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکتا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی تھی یا نہیں، اس کا فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا تھا۔

اس دوران سجدہ نے اپنی یونی کی کلاسز بھی مس کی تھیں۔ وہ ایم بی اے کے لیکچرز بس آن لائن سنتی رہی تھی۔ آج سے دو دن پہلے تک وہ بلا کی مطمئن تھی لیکن اس کا اطمینان اس شام سدحان شارق کی خواب گاہ میں جانے کے بعد بکھرا تھا۔

وہ شخص جس کے لیے اس نے آدھی آدھی رات کو اٹھ کر اللہ سائیں کے سامنے اپنی ہتھیلیاں پھیلائی تھیں۔

وہ شخص جس کی خاطر سجدہ نظامانی نے اپنی جانب بڑھتے ہر قدم کو ٹھکرایا تھا۔

وہ شخص اس کے باپ کے حریف شارق عباس کا بیٹا نکل آئے گا۔ یہ وہ آخری بات تھی جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ وہ تو بس اللہ سے معجزہ کر دکھانے کی دعا مانگا کرتی تھی اور اللہ نے معجزہ کر کے دکھا بھی دیا تھا۔

اس نے دعا کی تھی جب وہ اس کو ملے تو مسلمان ہو چکا ہو اور جب وہ اسے ملا تو پیدائشی مسلمان ہی تھا۔

سجدہ نے ایک معجزے کے تحت اس کو پایا تھا اور کھو بھی دیا تھا۔ وہ دیوانہ وار اسے چاہتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے قابل فخر و قابل تسکین تھی مگر وہ شارق عباس کو الیکشن میں ہرانے کے مقصد سے شارق ولا میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ بات جاننے کے بعد بھلا وہ

اسے خاک اپنانے کے بارے میں سوچتا۔

☆☆☆

"سدحان ابھی تک گھر نہیں لوٹا؟" گرے نائٹ سوٹ میں ملبوس قیمتی سگار کے گہرے کش لیتے، وہ لان میں آئے تھے۔

"نہیں سائیں۔" الطاف کی گردن نفی میں ہلی تھی۔

شارق عباس کی نظریں بے ساختہ اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ کی سمت اٹھ گئیں۔ رات کے پورے دو بج رہے تھے۔

کمیل کی جانب سے دھوکا ملنے کے بعد شارق عباس کو اب صحیح معنوں میں سدحان کی قدر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اکلوتا بیٹا تھا ان کا، جس کو اس سے قبل کمیل فاروق کی وجہ سے وہ اکثر نظرانداز کرتے رہے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ بھی کہ سدحان کو سیاست میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی جبکہ کمیل نہ صرف سیاست میں لگاؤ رکھتا تھا بلکہ پی ڈی ایس پارٹی سے ملنے والے ٹکٹ پر اس نے حال ہی میں ہاتھم کی سیٹ جیتی تھی۔

اسی سبب سدحان کے حصے کا پروٹوکول شارق عباس، کمیل کو دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ مگر اس کی اصلیت کا اب اس مقام پر آ کر انہیں پتا چلا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ آج کل سدحان کو لے کر بے حد حساس ہو رہے تھے۔

شارق عباس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح کہیں سے ڈھیروں خوشیاں خرید کر وہ اپنے بیٹے کی جھولی میں ڈال دیتے تاکہ وہ اپنی تمام اداسیاں بھلا کر ہنس پڑتا۔

"آپ کا ملایا ہوا نمبر کسی اور کال پر مصروف ہے۔"

آپریٹر کی آواز سماعت کرتے شارق کی پیشانی پر چھائی فکر کی لکیریں مزید گہری ہو گئی تھیں۔

تب ہی سدحان کی گاڑی شارق ولا کی گیٹ سے اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔

"سدحان میری جان!" وہ جیسے ہی گاڑی سے باہر آیا، شارق عباس ان کی جانب لپکے۔

"اسٹرینج پاپا..... آپ اب تک جاگ رہے ہیں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"میں تمہارا ویٹ کر رہا تھا؟ اور یہ کیا ہوا؟" ان کی نظر اچانک اس کی پیشانی پر بندھی سفید پٹی پر پڑی تو وہ چونک گئے۔

"نتھنگ پاپا---" وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر بولا۔ "یوں ہی ذرا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا میرا۔"

"سدحان..... دھیان کہاں تھا تمہارا ڈرائیو کرتے ہوئے۔" اس کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے وہ اس پر برسے تو وہ زیرلب مسکرا دیا۔ اب باپ کو کیا بتاتا کہ دھیان میں تو وہی دشمن جاں بسی رہتی ہے، ایسے میں سامنے کا منظر بھلا نظر کب آتا ہے۔

"ایسا کب تک چلے گا آخر پاپا کی جان---- تم کب تک میری غلطی کی سزا خود کو دیتے رہو گے۔" اپنے دھیان میں کہتے ہوئے اس کا خوبرو چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام گئے۔" وہ تب بے حد اچانک سدحان کے لب ہلے تھے۔

"پاپا! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"واٹ---- آئی مین؟" اپنے اس قدر جذباتی انداز کے جواب میں ایسا خوش گوار اور غیر متوقع جملہ سن کر ساعت کے ہزارویں حصے میں شارق عباس پر شادی مرگ سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

"کیا کہا تم نے سدحان؟" انہوں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"مجھے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم جہاں چاہو وہاں شادی کر سکتے ہو۔" اسے اجازت دیتے شارق عباس ہنس پڑے تھے۔

"تھینکس پاپا۔" وہ اپنی مسکراہٹ دبا گیا تھا۔

"لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" وہ رک کر کہہ گیا۔

"مدد؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تمہاری

خوشیوں کی خاطر کسی کے سامنے مجھے اپنی جھولی بھی پھیلانی پڑی تو میں شوق سے پھیلالوں گا مائی سن۔" پاپا کا لہجہ بھرا گیا۔ "بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"پاپا! کیا آپ میرا پروپوزل لے کر سردار اسحاق نظامانی کے گھر جاسکتے ہیں؟" سدحان نے دھماکا کردیا۔

"واٹ......؟" وہ حیران ہی ہوگئے تھے اس کی بات سن کر۔

"تم...... تم جانتے ہو......" کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد ان کا لہجہ سرسرایا تھا۔ "سیاست میں میرا سب سے بڑا حریف ہے وہ شخص سدحان...... ابھی اس نے مجھے ایم پی اے کی سیٹ سے ہرایا ہے۔"

"آئی نو پاپا......" اس کا لہجہ پسپائی اختیار کرگیا تھا۔ "لیکن اس سب کے باوجود اگر میں کہوں کہ سردار اسحاق نظامانی کی بیٹی ہی وہ لڑکی ہے جس کی خاطر آپ کا بیٹا مدت سے صحراؤں کی خاک چھانتا رہا ہے...... تو کیا آپ یقین کرلیں گے میری اس بات کا؟"

"سد...... حان......" اور اس بار گنگ ہونے کی باری شارق عباس کی تھی، جو ٹکر ٹکر اکلوتے بیٹے کی صورت دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

"سا کشی رہنے دو ابھی سجدہ کو چینج مت کروانا۔ ہارون اسے نیچے بلا رہا ہے۔"

"سب ٹھیک تو ہے بھابھی؟" دلہن بنی سجدہ کو ڈریسنگ روم کی طرف لے کر جاتے ہوئے سا کشی کے قدم رک گئے تھے۔

"ہمم...... سب ٹھیک ہے۔" تو مپہ بھابھی معنی خیزی کے ساتھ مسکرائی تھیں۔ سجدہ نظامانی پر دلہن بن کر بلا کا روپ آیا تھا۔ میرون اور گولڈن کلر کے راجھستانی شرارے میں بھی سونے کے بھاری زیورات پہنے کرل کیے گئے لمبے بال پشت پر چھوڑے وہ آج پناہ حسین لگ رہی تھی۔

اب سے ٹھیک دو گھنٹے قبل ہی تو اس کا نکاح ہوا تھا۔ سجدہ نہیں جانتی تھی، یہ سب کیونکر ممکن ہو پایا تھا۔ اس کو تو بس بھابھی کی زبان سے اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس نکاح کو عمل میں لانے کے لیے سردار اسحاق نظامانی کو رضا مند کرنے کے خاطر شارق عباس کو باقاعدہ پاپڑ بیلنے پڑے تھے، جناب ویسے ہی پاپڑ جیسے شارق عباس کو الیکشن میں ہرانے کے لیے سجدہ نظامانی نے بیلے تھے اور یہ بات یقیناً شارق عباس سے چھپالی گئی تھی جب ہی تو وہ اس رشتے پر سردار اسحاق نظامانی کو راضی کرنے کے خاطر ان کی اوطاق پر چلے آئے تھے۔

لیکن وہ اس وقت ششدر رہ گئے، جب بنا کسی لحاظ کے سردار اسحاق نظامانی نے یہ رشتہ جوڑنے سے انکار کردیا تھا۔

"بابا سائیں، آپ انکار کیوں کررہے ہیں؟ شارق چاچا سائیں خود چل کر آئے ہیں اور وہ ہمارے لیے قابل احترام ہیں۔ اسحاق نظامانی کے ساتھ بیٹھے ہارون نظامانی چپ نہ رہ سکے تھے۔

"ہاں بیٹا بہت اچھے۔ میں شارق ابڑو کے ساتھ رشتہ جوڑ لوں، تاکہ کل کو میرے خلاف الیکشن میں اس کا بیٹا اٹھ کھڑا ہوا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا اسحاق بھاؤ! اس بات کا یقین میں آپ کو دلاتا ہوں کہ میرے صاحبزادے کو سیاست میں رتی برابر دلچسپی نہیں ہے۔"

شارق عباس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سدحان کی خوشیوں کی خاطر وہ اسحاق نظامانی کے سامنے اپنی جھولی پھیلانے سے بھی گریز نہ کرتے۔

"یہ تو تم ابھی کہہ رہے ہو ابڑو صاحب!"۔ سردار اسحاق نظامانی مسکرا کر کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ ہارون نظامانی کا چہرہ بجھ گیا اور شارق عباس نامراد وہاں سے لوٹ آئے۔

☆☆☆

سردار نظامانی اپنی ہٹ کا بہت پکا ہے سدحان۔ میں آج پھر ٹھن گیا تھا۔" پاپا کی بات سن کر اپنے لیے پلیٹ میں بریانی نکالتا اس کا ہاتھ رک گیا تھا اور چہرہ

یک لخت پھیکا پڑ گیا تھا۔

"تو کیا آج پھر انہوں نے انکار کر دیا پاپا؟" سر جھکائے جھکائے سدحان نے پوچھ لیا۔

"ہوں...... انکار کر دیا اس نے۔"

"کیا کہا انہوں نے۔" سدحان ابڑو کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"کہتا ہے، میں تم لوگوں کے ساتھ رشتہ داری جوڑ لوں تا کہ میرے خلاف الیکشن میں میرا داماد اٹھ کھڑا ہو۔"

"او پس......" اس نے اپنے لب کچلے۔ "آپ کو بتانا تھا پاپا کہ مجھے سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"بتایا تھا یار۔ مگر اس کو یقین نہیں آیا۔"

"ہم......" وہ بریانی کی پلیٹ پرے کھسکاتے ہوئے اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ریسٹ کروں گا پاپا۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" کھانے سے اس کا دل یکا یک اچاٹ ہوا، سو انکار کر دیا۔ وہ بیرونی دروازے کے سمت بڑھ گیا تھا جبکہ مائی جنت اور شارق عباس اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔

☆☆☆

تیرا چہرہ تو ہے آئینہ جیسا
کیوں نہ دیکھوں اسے ہے دیکھنے جیسا

ہاتھوں کا تکیہ بنائے صوفہ کم بیڈ پر وہ نیم دراز تھا۔

ہم اچانک ملے تھے جب پہلے
پل نہیں وہ بھولنے جیسا

خواب ناک آنکھوں کے سامنے وہ من موہنی صورت آکھڑی ہوئی تو اس نے سگریٹ سلگالی۔

تم کہو تو میں پوچھ لوں تم سے
ہے سوال اک پوچھنے جیسا

سدحان نے گہرا کش لیتے اپنی آنکھیں موند لیں۔

"میں تم کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ جان من ! اسحاق نظامانی کو اپنی ضد سے باز آنا ہو گا ورنہ مٹھن والا کی شہزادی کو اٹھا کر بھی لا سکتا ہوں میں۔" لب بھینچتے ہوئے اس نے انتہا پر آ کر سوچا تھا۔

دوست مل جائیں گے کئی لیکن......
نہ ملے گا کوئی میرے جیسا......

جگجیت سنگھ کی جادو بھری آواز اس کی خواب گاہ میں سُر بکھیر رہی تھی۔

جبکہ نیچے لان میں ٹہلتے ہوئے شارق عباس ایک فیصلہ کر چکے تھے۔ ہاں سردار اسحاق نظامانی کے یہاں اپنی طرف سے میڑ لے جانے کا فیصلہ۔ (میڑ سندھی میں لوگوں کے اس مجمع کو کہتے ہیں جو کسی روٹھے ہوئے کو منانے کی خاطر اس کی طرف لے جایا جاتا ہے)۔

اور اس بار شارق عباس کے میڑ لے جانے پر سردار اسحاق نظامانی کو ان کی بات ماننا ہی پڑی تھی۔

اور دوسری طرف تو جیسے ان کی ہاں کی دیر تھی۔ شارق عباس ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے فوراً شادی کی تاریخ طلب کر بیٹھے۔

"ہماری لڑکی کے ڈیڑھ ماہ بعد ایم بی اے کے سمسٹرز ہیں سو فی الحال رخصتی نہیں کروا سکتے۔" اسحاق نظامانی کہہ گئے۔

"کوئی بات نہیں سائیں...... آپ رخصتی ڈیڑھ ماہ بعد کر دیجیے گا۔ فی الحال اگلے جمعہ کو نکاح کی تاریخ رکھ دیتے ہیں۔" شارق عباس کے پاس گویا ہر مسئلے کا حل موجود تھا اور اس مرتبہ سردار نظامانی کو آخر کار ہتھیار پھینکنے ہی پڑے تھے، یوں مٹھن والا میں سردار زادی سجدہ نظامانی کے بیاہ کی شہنائیاں گونج اٹھی تھیں۔

"میں نے کہا تھا ناں تم سے سجدہ! اللہ سائیں سے جو بھی چیز مانگی جائے وہ ضرور ملتی ہے۔" سا کشی خوش خبری سنتے ہی اس کے ساتھ آ کر لپٹ گئی تھی۔

جبکہ سجدہ اسحاق کے آنسو ہیرے کی کنی کی مانند آنکھ کی پتلیوں میں دمک کر رہ گئے تھے۔

بعض دفعہ خوشی کے آنسوؤں کو بہنے کے لیے

رستہ نہیں ملتا ناں؟

سنتے ہیں کہ مل جاتی ہے ہر چیز دعا سے
اک روز تمہیں مانگ کے دیکھیں گے خدا سے

گوٹھ مٹھن والا کی شہزادی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

اور مسکرا تو گوٹھ راہو جا کا راج کمار بھی اٹھا تھا، جب اس کو زندگی کی نوید سنا دی گئی تھی۔ گوٹھ راہو جا کی ہر گلی کو پھولوں اور چراغوں سے سجا ڈالا تھا اس نے۔

سدحان شارق کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس ہوا سہیلی کے استقبال کی خاطر اپنا دل فرش راہ کر بیٹھتا۔

آج جمعہ کی شام کو ان کا نکاح ہوا تھا۔ دو گھنٹے قبل ہی بارات واپس گئی تھی، جب نومیہ بھابھی سجدہ کو بلانے اس کے کمرے میں آ گئی تھیں۔

☆☆☆

''ڈیر بھابھی! ہارون بھیا سجدہ کو نیچے کیوں بلا رہے ہیں؟ سیلفی لینی ہے کیا انہیں دلہن کے ساتھ۔'' ساکشی نے اپنے دانت نکوسے۔

''نہیں جی۔'' نومیہ ہارون اٹھلائی۔ ''سیلفی تمہارے ہارون بھیا کو نہیں، سجدہ کے سیاں کو لینی ہے اس کے ساتھ۔''

''ہائے دیا...... میں مرگئی۔'' ساکشی نے دیدے منکائے جبکہ دلہن بنی سجدہ بھابھی کی بات سن کر اچھل ہی تو پڑی تھی۔

''کہ...... کیا مطلب؟'' وہ منمنائی۔

''مطلب یہ کہ اپنی بارات کو راہو جا پہنچا کر آپ کے دولہا سیاں نہ صرف مٹھن والا واپس آ چکے ہیں بلکہ اس وقت ہماری حویلی کے گیٹ کے باہر کھڑے اپنی دلہنیا کا انتظار کر رہے ہیں۔'' سجدہ کی نازک ٹھوڑی کو پیار سے چھوتے ہوئے بھابھی نے اطلاع بہم پہنچائی تو مارے حیرت کے بے چاری دلہنیا کو غش آتے آتے رہ گیا۔

☆☆☆

''میری چھوٹی سی بہنا۔''

سہج سہج چلتی وہ بھابھی اور ساکشی کی سنگت میں سیڑھیاں اتر کر جوں ہی نیچے صحن میں پہنچی تھی۔

بادامی کلف لگے، کڑک سوٹ میں ملبوس سندھی ٹوپی سر پر سجائے ہارون ادا سائیں آگے بڑھے تھے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''ماشاء اللہ میری گڑیا بہت پیاری لگ رہی ہے۔'' سجدہ کی پیشانی پر لب رکھتے ہوئے وہ مسکرا دیے تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''سجدہ! سدحان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے مجھ سے دو گھنٹے کی اجازت لی ہے، وہ تم کو نوراتری کا میلا دکھانا چاہتا ہے۔'' اس کا ہاتھ تھامے حویلی کی اوطاق کی طرف بڑھتے ہوئے ہارون ادا نے اس سے کہا تھا۔

☆☆☆

تو سامنے ہے تو پھر کیوں یقین نہیں آتا
یہ بار بار جو آنکھیں مل کے دیکھتے ہیں
بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو روبرو تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

پورے چاند کی رات میں برقی قمقموں سے سجے گیٹ کے اس پار اس نے جوں ہی قدم رکھا تھا، نازک پاؤں میں سجی سونے کی پائل جھنجھنا اٹھی تھی۔ نگاہ سامنے جو اٹھی تو پلٹنا بھول گئی۔

وہ حیران ہی اتنی ہو گئی تھی، سامنے کا منظر دیکھ کر۔

مہکتی چاندنی میں گولڈن اینڈ وائٹ کامبی نیشن کی راجھستانی شیروانی میں سر پر شان سے کلاہ سجائے وہ راجپوتوں کی سی آن بان رکھنے والا شہزادہ کسی دیو مالائی کہانیوں کے کردار کی طرح اپنی براؤن گھوڑی کی لگام تھامے کھڑا تھا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں سجدہ کو اس ایڈونچر پر ہنسی ہی تو آ گئی تھی اور وہ جو سوچ کر آئی تھی کہ سدحان شارق اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا تو اس کو اپنے اندازے کو جھٹلانا پڑا، آخر وہ کیوں بھول گئی تھی کہ وہ دونوں اس جدید دور میں قدیم شہزادے شہزادی کی روحیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی قدامت پسند تھے اور روایت پرست بھی۔

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کرکے دیکھتے ہیں
اس چندر مکھی راج کماری روپ کی چھب نے آج اس شہزادے کے حواسوں پر برق سی گرادی تھی۔

میرون اور گولڈن شرارہ سوٹ میں بھاری زیورات اور سلیقے کے ساتھ کیے گئے برائیڈل میک اپ میں سیاہ زلفوں کو اپنے شانوں پر گرائے، وہ اس کو دیوانہ ہی تو بنا گئی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی جیتی جوہی کی لگام تھامے کسی ٹرانس میں چلتا وہ اس تک آرکا تھا اور یہ وقت تھا جب اس شہزادے کی پیاسی و بے تاب نگاہیں اس سجی سنوری سردار زادی کے دلکش چہرے پر لودے کر رہ گئی تھیں۔

کہانیاں ہی سہی سب مبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تو تعبیر کرکے دیکھتے ہیں
سدحان شارق کی خواب ناک نگاہیں بھٹکی تھیں اور ان سرمگی جاموں سے جا ٹکرائیں۔

دونوں کی نظریں آپس میں کیا ملیں۔ رات چاند کی پیشانی چومتے ہوئے گنگنا اٹھی۔ ستاروں نے ہاتھ بڑھایا اور کائنات وجد میں آگئی۔

سامنے کھڑی اس نروس سی لڑکی کے نازک سے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔
کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کر، کبھی شب کے پھول کو چوم کر
یوں ہی ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو
میرے ساتھ میرے حبیب آ ذرا دل کے اور قریب آ
تجھے دھڑکنوں میں اتار دوں کہ بچھڑنے کا ڈر نہ ہو
ایک ایک لفظ کو بوجھل مخمور لہجے میں ادا کرتا، وہ سجدہ کے دل کے تار چھیڑ گیا تھا۔

نومبر کی خنک بھری فضاؤں میں اپنے ماتھے پر پسینے کے چمکتے موتی سنبھالتی سجدہ اسحاق کی لمبی پلکیں جھک گئی تھیں۔

''آئی لو یو مائی سویٹ ہارٹ۔'' اس ادا پر نثار ہوتے سدحان کو ایک لمحہ لگا تھا اس کو اپنے حصار میں لینے میں۔

''آئی رئیلی لو یو۔'' وہ جذب سے کہہ گیا۔
رات نے یک لخت اپنا مہکتا آنچل ان دونوں کے اوپر پھیلا دیا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں ان دونوں دیوانوں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے حالانکہ وہاں پر تھا ہی کون؟ سدحان شارق اور اس چندر جیسی شہزادی کے ملن کے گیت گاتے آکاش کے تاروں اور گنگناتے چاند کے سوا اں وہاں پر کوئی نہیں تھا۔

''آئی مس یو...... آئی مس یو...... آئی مس یو آ لاٹ۔'' جانے کتنی صدیاں بیتی ہوں گی جب جوہی کی ہنہناہٹ کی آواز سن کر وہ ہڑبڑا کر اس سے الگ ہوئی تو وہ جھک کر سرگوشی کر گیا۔

''آئی مس یو الاٹ سدحان شارق۔'' قبل اس کے کہ وہ اپنے من کی بات کو ہونٹوں پر لے آتی۔ اس شخص کے اگلے جملوں کو سن کر سجدہ اسحاق کی تمام شرم اور جھجک ہوا ہی تو ہو گئی تھی۔

''آئی سوری...... آپ کے جانے کے بعد میں نے سردار بانو کو بے حد مس کیا۔''

''واٹ...... واٹ......'' اسے اک ساعت ہی لگی چھوئی موئی گڑیا سے جنگلی شیرنی کا روپ دھارنے میں۔

''کیا کہا ابھی آپ نے۔'' جارحانہ انداز میں سوال کرتی وہ ایک تیکھی سی گھوری ڈال کر بولی۔

''ارے کمال ہے، سنا نہیں آپ نے۔'' وہ بھی بن کر پوچھ گیا۔

''میں نے کہا، شارق ولا چھوڑ کر جانے کے بعد میں نے سردار بانو کو بے حد مس کیا۔''

''اچھا...... اتنا مس کرتے رہے سردار بانو کو تو نکاح بھی اس کے ساتھ ہی کر لیتا تھا۔''

''ہاہاہا......'' جلبلا کر مشورہ دیتی وہ اسے قہقہہ لگانے پر ہی تو مجبور کر گئی تھی۔

''بھئی...... میں نے تو اسی کے لیے پرپوزل بھجوایا تھا مٹھن والا کے وڈیروں کی طرف...... لیکن معلوم ہوا ادھر حویلی میں سردار بانو نامی کوئی ہستی نہیں رہتی بلکہ سردار صاحب کی ایک ہی بیٹی ہے...... سو میں نے کہا، سجدہ اسحاق بھی چلے گی۔'' مسکراہٹ کو اپنے لبوں پر رد کتے ہوئے وہ اسے سلگا ہی تو گیا۔

"واہ جی، سجدہ اسحاق بھی چلے گی...... ایسے ہی مان گئے جناب...... جیسے اتنے ہی سیدھے ہیں ناں آپ؟"

"او کے مان لیا اتنے سیدھے نہیں...... لیکن سردار بانو جیسے جینئس بھی نہیں کہ ہمز کے بنائے ہوئے کھانے میں پیٹ خراب کی دوائی ملائیں اور وہ کھانا نہ کھانے پر دوسروں کو صلواتیں بھی سنائیں۔" شرارتی مسکان کو لبوں کی تراش میں چھپائے اس کی آنکھوں میں جھانکتے وہ اسے آئیں بائیں شائیں کرنے پر ہی تو مجبور کر گیا۔

"او بس...... مارے گئے۔" وہ بے ساختہ اپنی زبان دانتوں تلے دبا گئی تھی۔

"تو کیا اس روز آپ نے وہ تمام صلواتیں...... آئی مین...... آپ نے میری ساری باتیں سن لی تھیں۔" اس کے استفسار میں بوکھلاہٹ جھلکی۔

"جی ہاں۔" وہ مسکرایا۔ "میں نے ساری باتیں سن لی تھیں، جس طرح آپ نے اس شام میری تمام باتیں چپکے چپکے سن لی تھیں۔"

"وہ میں نے کہاں......؟" وہ چالاکی سے دامن بچا گئی۔ "وہ تو اس سردار بانو نے سنی تھیں، آپ کی تمام باتیں......"

"ہاں مگر......" سدحان نے اس کا مہندی سے سجا ہاتھ تھام لیا۔ "اور پھر تم کو چوٹ یہاں لگی تھی۔" کہتے ہوئے اپنے لب ہتھیلی کے اس حصے پر رکھ دیے جہاں اس روز ٹوٹے ہوئے کپ کا ٹکڑا کھب گیا تھا۔

اور تب سجدہ اسحاق اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"تم اس روز کمرے سے روتی ہوئی کیوں بھاگ گئی تھیں سجدہ؟" دفعتاً سنجیدگی کے ساتھ استفسار کرتے وہ اچانک اپنی سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ گیا۔

سجدہ کی پلکیں لرز اٹھیں اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ گویا ہوئی تھی۔

"کیونکہ...... کیونکہ میں آپ کو اس روز پہچان گئی تھی سدحان......" لفظ کٹاؤ دار لبوں پر گنگنائے۔

"میں پہچان گئی تھی اس شام آپ کو...... کہ آپ وہی ہو۔" کھوئے کھوئے لہجے میں مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"میں وہی...... میں سمجھا نہیں؟" اس کی تھوڑی کو انگلی کی نوک پر اٹھاتے ہوئے وہ سرمئی آنکھوں میں جھانک گیا۔

"آپ جانتے ہیں...... میں نوراتری کے میلے میں ہوا سہیلی کے دل پر اپنی تلوار سے گھاؤ لگنے والے راج کمار کی بات کر رہی ہوں۔"

دوسرے ہی لمحے سجدہ اسحاق کا اعتراف اس کے من میں پھول کھلا گیا۔

"اسٹرینج......؟" سدحان شارق کھل کر مسکرا دیا۔

"ہم دونوں ایک ہی جذبے کے اسیر تھے...... اور ایک دوسرے کے سامنے رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے......"

"ہوں...... مگر اس گیٹ اپ میں مجھے پہچان لینا، آپ کے لیے ایک چیلنج ہی تھا ناں......" وہ بھی جیسے انجوائے کرتے ہنسی۔

"آئم ایگریڈ......" سدحان نے سر ہلایا۔

"بٹ میں حیران ہوں، تم مجھے کیوں پہچان نہیں پائیں سجدہ!" سدحان اپنے دل میں مچلتے ہوئے سوال کو زبان پر لے آیا۔

"میں آپ کو کیسے پہچان لیتی؟" وہ حیران ہوئی۔ "جبکہ نوراتری کے میلے میں آپ نے بھی تو اپنا گیٹ اپ چینج کر رکھا تھا ناں۔"

"او بس...... وہ تو تم لوگوں کی وجہ سے میں نے گیٹ اپ چینج کیا تھا۔ بٹ یار! اتنا زیادہ فرق تو نہیں، بس رنگ ہی ذرا سانولا تھا میرا...... ورنہ بڑھی ہوئی شیو میں تو کتنی بار سامنا ہوا تھا شارق ولا میں تمہارے سامنے۔"

"اچھا جی...... اور وہ رکھشا تلک جو لگا کر آ گئے تھے آپ میلے میں؟" وہ اٹھلائی۔

"تو کیا اس تلک کی وجہ سے......؟" اس بار بت بننے کی باری سدحان کی تھی۔

"تو کیا سجدہ تم...... آئی کانٹ بلیو دیٹ......

مائی گڈنیس......"

"تو تم مجھے......"

"جی ہاں۔ میں آپ کو ہندو سمجھی تھی اور ہر نماز میں آپ کے خیال کو اپنے دل سے نکال دینے کی دعا اللہ سائیں سے مانگا کرتی تھی۔" اس نے خود پر گزری تمام روداد سنا ڈالی تو وہ ہنس دیا۔

"او مائی گاڈ......اور تم مجھے بھول نہ پاؤ، یہی ایک دعا میں دن میں بے شمار مرتبہ مانگا کرتا تھا۔ اللہ سائیں وہ ہوا سہیلی میرے خیال کو اپنے دل سے کبھی نہ نکال پائے۔"

شرارت بھری مسکراہٹ، وجیہہ چہرے پر سجائے وہ شخص انکشافات کر رہا تھا۔

اور سجدہ اپنی پلکوں کو نم ہونے سے نہ روک پائی تھی۔

اس کو یاد آئی اپنی وہ بے بسی کہ جتنا اللہ سائیں سے اس شخص کے خیال کو دل سے نکال دینے کی دعائیں مانگا کرتی تھی، اتنی ہی شدت سے وہ اسے یاد آتا تھا۔

تو کیا یہ سدحان شارق کی دعاؤں کا اثر تھا، جو وہ اسے کبھی بھلا نہ پائی تھی۔

"جان سدحان! اب یہ آنسو کیوں؟" اس کی آنکھ کے کنارے مچلتا موتی اپنی انگشت کی پور پر اٹھاتے اس نے سوال کیا۔

"آئم سوسوری......" پلکیں جھکائے وہ منمنائی تھی۔

"سوری بٹ کس لیے؟" مقابل نے بھنویں اچکائیں۔

"شارق ولا میں آ کر جو سب میں نے کہا...... اس......"

"اوں ہوں......" اس کی بات کو درمیان سے ہی کاٹ دیا گیا تھا۔

"مائی ڈیئر ڈارلنگ! جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اچھے کے لیے کرتا ہے۔ اگر آپ شارق ولا نہ آئی ہوتیں تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ ہماری ہوا سہیلی سردار اسحاق نظامانی کی بیٹی ہے۔"

دلکشی کے ساتھ مسکراتے ہوئے وہ آگے بڑھا تھا اور اس کے نازک اندام وجود کو اٹھا کر جوہی کی پشت پر بٹھا دیا۔

"تو کیا آج نوراتری کے میلے میں تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینے کا ارادہ ہے جناب کا؟" معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتی سجدہ نے اسے چھیڑا تھا۔

"یہ بھی خوب کہی آپ نے۔" اس کے پیچھے جوہی کی پشت پر سوار ہوتے ہوئے وہ ہنسا تھا۔

"بھلا ہمیں مقابلے میں حصہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟" اس چندر بنسی راج کماری کی گھنیری زلفوں میں اپنا وجیہہ چہرہ چھپاتے وہ بوجھل سرگوشی میں گویا ہوا تھا۔

"کیونکہ ہم تو بنا مقابلے میں حصہ لیے آپ کے دل پر کمند ڈال چکے ہیں۔"

"آں تو...... کیا ہم متھار جا نہیں جا رہے؟"

اپنے پیچھے بیٹھے شخص کے لہجے کے بوجھل پن پر گھبراتی وہ بات بدل گئی۔

"نو سویٹ ہارٹ بلکہ میں تو آپ کو گوٹھ راہو جا کی سیر کرانے لے جا رہا ہوں......اینڈ یو ڈونٹ وری ہم صبح ہونے سے قبل لوٹ آئیں گے......" سدحان نے آرام سے اس کو اطلاع باہم پہنچائی۔

"را...... راہو جا......؟" وہ سٹپٹا گئی۔ "مطلب میں سمجھی نہیں۔"

"مطلب......" جواباً وہ چہکا۔

"چلی پیا حویلی ہوا سہیلی چاند سہیلی چلی پیا حویلی ہوا...... سہیلی...... ہوا سہیلی۔"

اس کے کان میں پڑے گولڈن جھمکے کو پیار سے چھیڑتے ہوئے وہ گنگنایا۔

سجدہ اسحاق خود میں سمٹ سی گئی۔ جبکہ اس جھانسی کی رانی کی اس پیاری سی ادا پر سدحان شارق کی جوہی کو اتنا پیار آیا تھا کہ اگلے ہی لمحے وہ بھی سڑک پر سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی تھی کیونکہ اسے ہوا سہیلی کو پیا حویلی پہنچانے کی جلدی تھی۔

جہاں شارق عباس ابڑو ان دونوں کے استقبال کے لیے جشن کا سماں کیے ہوئے تھے۔

☆☆

نمرہ احمد

حالم

چھبیسویں قسط

صبح کی روشنی میں مندر کی بتیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ اس کے کھنڈراتی ستون زرد اور میلے سے لگتے تھے۔ سیاحوں کی ایک بڑی تعداد مندر کے احاطے میں بکھری تھی۔ زیادہ تر سیاح مختلف کروز شپس پہ آئے تھے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو براستہ سڑک یہاں پہنچے تھے۔ لوگ تصاویر اتارتے... ویڈیو زولاگز بناتے... گائیڈز کا رٹا رٹایا بیانیہ سنتے ہوئے گروپ کی صورت مندر کے اندر جا رہے تھے اور شاید صرف ایک وہی تھی جو اس بلند قامت عمارت کے باہر بورسی کھڑی تھی۔

اس نے سیاہ اسکرٹ کے اوپر شطرنج کی بساط جیسا چیک والا سیاہ سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ سفید ہیٹ کھلے بالوں پہ جما تھا اور ماتھے پہ بل تھے۔ گردن اونچی اٹھائے وہ ناقدانہ نظروں سے کھنڈر کو دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں قدیم زمانے کی چیزوں میں دلچسپی نہیں ہے؟" وہ اس کے کندھے کے پیچھے آ کھڑا ہوا اور آہستہ سے بولا تو تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ وہ پی کیپ پہنے، سن گلاسز لگائے، جیکٹ کی آستین پیچھے کو موڑے کھڑا مطمئن نظر آتا تھا۔

''نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے قدیم زمانوں میں واپس جانے کا۔''

''واپس جانے کی بات کون کر رہا ہے؟ میں تو اس کے اندر جانے کا کہہ رہا تھا۔''

''ایک ہی بات ہے۔ مجھے کوئی بھی ایسی چیز اپنے گرد نہیں پسند جو مجھے قدیم زمانے کی یاد دلائے۔''

''یونو... میری ورکشاپ سے دو گلیاں چھوڑ کے ایک سائیکاٹرسٹ کا کلینک ہے۔ میری مانو تو...''

''تم بور کیوں نہیں ہوتے؟'' وہ اکتا کے بولی تھی۔ ''ہم اتنے دن سے ایک کروز شپ میں مقید ہیں۔ میرے کمرے کی گول کھڑکی کے سامنے بیٹھ کے ہم سارے پلان بناتے اور ان پہ عمل کرتے جا رہے ہیں۔ ایک ہی منظر' ایک ہی ماحول سے تم تنگ نہیں آتے؟''

وہ سادگی سے مسکرایا اور کندھے اچکائے۔

''نہیں۔ کیونکہ میرے اندر تم سے زیادہ اسٹیمنا ہے۔''

مندر کے قریب وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور وہ سوچتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اور تمہارے اندر مجھ سے زیادہ دوسروں کی کمزوریوں پہ نظر رکھنے کی عادت بھی ہے۔ تمہاری کمزوری کیا ہے؟''

''اگر اسے ڈھونڈنا اتنا آسان ہوتا تو میں تمہارے ساتھ کام نہ کر رہا ہوتا۔'' پھر اس نے رخ موڑ لیا۔ ''تمہاری نیلوفر حاتم ادھر آ رہی ہے۔ ساتھ الماس بھی ہے۔ میں اندر جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے مت آنا۔''

تنبیہ کر کے وہ آگے بڑھ گیا۔

پیچھے نیلوفر اور الماس چلتی آ رہی تھیں۔ نیلوفر اپنی دوستوں کے جھرمٹ میں ہنستی مسکراتی چل رہی تھی۔ البتہ الماس پونی والا سر جھکائے فون پہ ٹائپ کرتے ہوئے قدم اٹھا رہی تھی۔

''یہ تاریخی مندر اتنے یاد نہیں رکھے جائیں گے جتنی تم یاد رکھی جاؤ گی' نیلوفر!''

ان عورتوں کا گروہ تالیہ کے قریب ہی رک گیا تھا۔ کسی ایک نے خوش آمدی انداز میں نیلوفر کو سراہا تو اس کی گردن فخر سے مزید بلند ہو گئی۔ سرخ کوٹ اور ڈریس پینٹ میں ملبوس نک سک سے تیار نیلوفر نے مسکرا کے اس عمارت کو دیکھا۔

''میرے پاس صوفیہ رحمن سے بدلہ لینے کے بہت طریقے تھے۔'' وہ تفاخر سے گردن اٹھائے کہہ رہی تھی۔ اس کے بلو ڈرائی شدہ بال ہوا سے پیچھے کو اڑ رہے تھے۔ ''میں اس سے پیسے لے سکتی تھی' اس کی مخالف پارٹی میں شامل ہو کے اس کے خلاف تقریریں کر سکتی تھی' مگر نہیں....''

اس نے مسکرا کے اپنے گرد دائرہ صورت کھڑی عورتوں کو دیکھا۔

''میں کچھ بھی کرتی' اس کا اثر چند دن میں ختم ہو جاتا کیونکہ اپنی ذات پہ لگنے والا الزام لوگ برداشت کر لیتے ہیں' مگر مرے ہوئے باپ کی عزت پہ حرف آئے تو لوگ اس کھنڈر جیسے بن جاتے ہیں۔''

الماس نے فون سے سر اٹھایا اور مسکرا کے گفتگو میں حصہ لیا۔

''جو کتاب میری ماما نے لکھ دی ہے نا' اس کا اثر صوفیہ رحمن کی سات نسلوں تک جائے گا۔ تصور کریں' کتاب شائع ہو گی دا تو سری عبدالرحمن کے بیڈروم سیکرٹ' ہر بچہ بڑا' منسٹر اور چپڑاسی تک پڑھ لے گا۔'' وہ محظوظ انداز میں عورتوں کے گروہ سے کہہ رہی تھی۔ تالیہ چپ چاپ کھڑی سن رہی تھی۔

''صوفیہ کو آفس لے جانے والا ڈرائیور روز جن خاموش نظروں سے دیکھے گا...... وہ پارلیمان آئے گی تو اس کی پیٹھ پیچھے سیاستدان سرگوشیوں اور معنی خیز مسکراہٹوں سے جو کہیں گے.... اس کی بچیاں اسکول جائیں گی تو گیٹ کے چپڑاسی سے لے کر

اسکول کے بچوں تک' سب ان کو یہ بتائیں گے کہ تمہارا نانا یہ اور یہ کیا کرتا تھا۔'' وہ ایک نقشہ کھینچ رہی تھی۔

''کہتے ہیں انتقام وہ ڈش ہے جس کو جتنا ٹھنڈا کر کے پیش کیا جائے' اتنا بہتر ہوتا ہے۔''

قریب میں چند سیاح ان کی باتیں سننے رک گئے تھے۔ مجمع لگتے دیکھ کے نیلوفر نے آواز مزید بلند کی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ ہر سیاستدان کے حق میں یا خلاف ایک ایک باب شامل کر دوں' مگر ان کو پہلے سے مطلع کر دوں تاکہ وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ ان کو میرا ساتھ دینا ہے.. یا... (کن انکھیوں سے تالیہ کو دیکھا) یا میرے خلاف چلنا ہے کیونکہ اس وقت ان سب کی عزت میرے ہاتھ میں ہے۔''

قریب کھڑے ایک معمر آدمی نے کانوں کو دوبارہ چھوا۔

''عزت ذلت خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے' محترمہ۔ اس کو انسانوں کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔''

''جب ایک ماہ بعد میری ماما سی این این اور بی بی سی پہ بیٹھ کے انٹرویوز دے رہی ہوں گی نا مسٹر' تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمیں کسی کی عزت کو ذلت میں بدلنے کے کتنے حربے آتے ہیں۔'' الماس تلخی سے چیخ کر بولی تو وہ آدمی سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

تالیہ ابھی تک خاموش کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی جو عورتوں کے جھرمٹ میں کھڑی' اونچی گردنوں سے چھوٹی باتیں کر رہی تھیں۔

اب تک تالیہ کو لگتا تھا کہ وہ پیسے اور انتقام کے لیے یہ سب کر رہی ہے اور اندر سے وہ دکھی ہو گی' اسے تکلیف بھی ہو گی۔ مگر اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ نیلوفر یہ سب لطف اٹھاتے ہوئے کر رہی ہے۔ یقیناً اس نے وان فاتح کے بارے میں بھی ایک باب شامل کر لیا تھا۔ جب کتاب آئے گی تو اس کے نازیبا الزامات ہر ٹاک شو میں دہرائے جائیں گے۔ فاتح کے بچے سنیں گے۔ صوفیہ کی بیٹیاں دیکھیں گی۔ بڑے لیڈرز کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی چھوٹی عورتوں کو براہ راست جواب نہیں دیا کرتے۔ اور یہ عورتیں اسی چیز کا فائدہ اٹھا کے چند دن تک ان پہ کیچڑ اچھالتی رہتی ہیں۔ صوفیہ اور فاتح' دونوں کی فیملیز کو یہ کیچڑ چپ چاپ برداشت کرنا پڑے گا۔

وہ دونوں ابھی تک بول رہی تھیں مگر تالیہ سے مزید نہیں سنا گیا۔ وہ مڑی اور کھنڈر کی طرف بڑھ گئی۔

ہر اٹھتا قدم بوجھل ہو رہا تھا۔

لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ سورج کی چمک تیز ہو گئی تھی۔

تالیہ تیز تیز چلنے لگی۔ اس کے ماتھے پہ پسینہ آنے لگا تھا۔

سرما کی دھوپ بہت شدید تھی۔

وہ جلد از جلد اندر جا کے پناہ ڈھونڈنا چاہتی

تھی۔
وہ نیلوفر کو جانتی تھی۔ اگر اس نے فاتح کے بارے میں کوئی باب لکھا تھا تو اس میں تالیہ کا ذکر بھی ہوگا اور جن الفاظ سے ہوگا... کیا اس کے بعد وہ اسی عزت سے بی این کے آفس جا سکے گی؟ وہ سب اس کو کیسی عورت سمجھیں گے؟ الزام لگانے والا بھلے ثبوت نہ دے' لیکن وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی بات دہرا دہرا کے ضرور بٹھا دیتا ہے۔ یا اللہ... اس کی اتنے مہینوں کی کمائی عزت اب واقعی ایک عورت کے قلم کی محتاج تھی؟

کھنڈر باہر سے یوں تھا جیسے طویل برآمدہ ہو جو ستونوں کی مدد سے کھڑا ہو۔ وہ گم صم سی اس کی دیواروں کو دیکھنے لگی جو منقش تھیں۔ وہاں پتھروں پر نقاشی کے ذریعے تصویری کہانیاں رقم کی گئی تھیں۔ مگر تالیہ ــ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ ستونوں کے درمیان سے گزرتی آگے بڑھنے لگی....

(دولت اسے کہتا تھا کہ اس کی عزت حکومت کے ہاتھ میں ہے۔)

ستون بہت سے تھے اور ایسے لگتا تھا کبھی ختم نہیں ہوں گے...

(اگر وہ صوفیہ کا کام نہیں کرے گی تو وہ اس کے جرائم کو سرِ عام کر کے اسے رسوا کر دیں گے۔)

دیواروں پہ تصویریں ہی تصویریں تھیں۔ قدیم مصری باشندوں کے خاکے' جو ایک دوسرے کو کچھ کہتے دکھائی دیتے تھے.... فرعونوں کے خاکے.... منقش علامتیں.... نشانیاں.... پہیلیاں....

(اور اگر وہ کتاب نہ روک سکی تو نیلوفر اس سے دوبارہ سر اٹھا کے بات کرنے کا فخر چھین لے گی۔ اس کی عزت ہر طرف سے مجروح ہوئی تھی۔)

اس نے گردن اٹھائی اور چھت کو دیکھا۔ وہ تصویری کہانیاں چھت پہ بھی نقش کی گئی تھیں۔ فرعونوں کی داستانیں.... قدیم زمانے کا سحر.... یا شاید... کوئی ملعون سا اثر تھا...

اس کو وہ آواز پھر سے سنائی دینے لگی......

گیلے جوتوں سے فرش پہ چلنے کی آواز.... اٹھتے قدم.... ایک...... دو......

(میرے پیچھے مت آنا۔ میں اندر جا رہا ہوں)

اور اس سب کے پس منظر میں اس کی آواز گونجی تھی۔

وہ جہاں تھی' وہیں کھڑی رہ گئی۔

جہان نے مندر میں آنے کے بعد یہ بات تین دفعہ کہی تھی۔

وہ یونہی کہہ رہا تھا یا یہ جہان سکندر کی کوئی اور پہیلی تھی!

وہ تیزی سے اندر کو لپکی۔

زرد خستہ حال دیواروں سے بنی راہداریاں اندر کو جا رہی تھیں۔ یوں جیسے وہ کسی زیرِ زمین شہر میں آ گئی ہو۔

اندر اندھیرا تھا اس لیے جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں جو راستہ دکھاتی تھیں۔

قدیم ملاکہ کا تاثر.... اس کا خوف.... وہی ملعون سی فضا...

وہ متوحش سی ادھر ادھر دیکھتی راہداریوں میں آگے بڑھ رہی تھی.... اور پھر......

یکے بعد دیگرے دو فائرز کی آواز آئی۔ وہ جہاں تھی' وہیں ششدر کھڑی رہ گئی' پھر اگلے ہی لمحے آواز کی سمت دوڑی۔

ایک کمرے میں جہاں کسی فرعون کی قبر تھی' بہت سے لوگ موجود تھے۔ یہ نیلوفر اور اس کی خواتین کا گروہ تھا۔ گائیڈ ہکا بکا کھڑا تھا' خواتین چیخ و پکار کر رہی تھیں' اور نیلوفر گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی تھی۔ سینے پہ ہاتھ تھا اور چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ الماس اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے ششدر سی کھڑی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ حواس باختہ سی اندر آئی۔

''معلوم نہیں کون تھا... مگر اس نے پستول اندر کیا اور فائر کھول دیا۔''

''وہ نیلوفر کا نشانہ لے رہا تھا۔ شکر کہ وہ بروقت

نیچے ہو گئیں۔"
"کون تھا؟ کسی نے اس کو دیکھا؟"
"نہیں۔" نیلوفر نے جھرجھری لے کر نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے صرف اس کا پستول چوکھٹ سے نظر آیا۔"
"ماما ...." الماس سفید چہرے کے ساتھ ہراساں سی بولی۔ "صوفیہ رحمن .... آپ کو مروانے کی کوشش کر رہی ہے۔"
وہ دنگ تھی۔ اردگرد کھڑے لوگ بھی حواس باختہ تھے۔ کوئی پولیس کو کال کر رہا تھا' کوئی ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔
"بالکل۔ یہ صوفیہ ہی ہے۔"
نیلوفر، الماس کا سہارا لے کر اٹھی اور لباس پہ لگی مٹی جھاڑی۔ چہرہ سفید تھا مگر بدقت اس نے گردن کڑائی۔
"وہ سمجھتی ہے کہ مجھے مروا دے گی تو کتاب نہیں چھپے گی۔" نیلوفر کی نظریں چوکھٹ پہ کھڑی تالیہ سے ملیں تو تالیہ فوراً بولی۔
"آپ ٹھیک ہیں' نیلوفر؟"
نیلوفر نے فق رنگت سے اثبات میں سر ہلایا۔
"اب تو تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ صوفیہ کیسے میری جانی دشمن بنی ہوئی ہے۔" اس نے تالیہ سے تائید چاہی تھی۔
"بالکل۔ یہ تو حد ہو گئی ہے۔" وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔
"مجھے صوفیہ رحمن سے اس بے وقوفی کی توقع نہ تھی۔ اب وہ آپ کو مروا بھی دیں تو کتاب چھپ ہی جانی ہے۔ یعنی جب کتاب آپ کے گورے پبلشر کے پاس چلی گئی ہے.... تو آپ کو مروانا بے سود ہے!"
اس نے نیلوفر کی چند دن پہلے کہی بات کا حوالہ دیا۔ ابھی تک ہر جگہ نیلوفر نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کی کتاب کوئی گورا پبلشر چھاپ رہا ہے۔
"ہاں۔ بالکل۔" نیلوفر نے بدقت اعصاب پہ قابو پاتے ہوئے کہنا چاہا۔ الماس البتہ بالکل گم صم کھڑی تھی۔ لوگوں کا رش بڑھتا دیکھ کے تالیہ دھیرے سے وہاں سے ہٹ گئی۔ اس کا رخ بندرگاہ پہ کھڑی کروز کی جانب تھا۔
"کیا ایک دفعہ تم کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ لے سکتے ہو؟ ایک دفعہ؟"
وہ اپنے کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھولتی اندر داخل ہوئی تو حسب توقع وہ صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ جمائے آرام سے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کے سر اٹھایا۔
"نہیں۔"
وہ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ رکھے غصے سے تن فن کرتی اس کے سامنے آرکی۔
"تمہیں اس پہ گولی چلانے کی کیا ضرورت تھی؟"
"ساکن... زینب جم... وہ بلینکس تھے۔"
"مجھے پتا ہے وہ بلینکس تھے مگر تم کم از کم مجھے اعتماد میں تو لے سکتے تھے۔"
جواب میں صوفے پہ بیٹھے آدمی نے سادگی سے مسکرا کے اسے دیکھا۔
"آئی لائیکس سرپرائز!"
تالیہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ پھر سامنے والے صوفے پہ آ کے بیٹھی اور گہرا سانس لیا۔
"پوچھ سکتی ہوں کہ اس کا مقصد کیا تھا؟"
"تم کروز شپ میں بور ہو گئی ہو۔ میں تمہارا ٹائم بچا رہا تھا۔ اب یہ کون جلد مکمل ہو سکے گا۔"
"تم... تم میرے پلان کے مطابق کیوں نہیں چلتے؟" وہ زچ ہو گئی تھی۔ "کبھی تم الماس سے میری برائی کر دیتے ہو... کبھی تم پھولوں میں بگ ڈال کے ان کو بھیج دیتے ہو جو فوراً پکڑا جاتا ہے اور......"
بولتے بولتے وہ رکی۔ چونک کے اسے دیکھا۔ "تم چاہتے تھے کہ وہ بگ پکڑا جائے۔ ہے نا؟"
وہ کچھ نہیں بولا۔ صرف مسکرا دیا۔
تالیہ نے کراہ کے آنکھیں بند کیں۔
"تم نے جان بوجھ کے اتنے بھونڈے طریقے

سے بگ بھیجا تھا۔ تم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون اس کو پکڑتا ہے۔ کون ہے جو نیلوفر کی ٹیم کا ہوشیار لیلغا ہے۔" پھر خفگی سے اسے دیکھا۔ "مگر مجھے یاد پڑتا ہے کہ بگ پکڑے جانے پہ تم اچھے خاصے شرمندہ بھی تھے۔"

وہ اسی انداز میں مسکراتا رہا۔

"چیزیں وہ نہیں ہوتیں جیسی وہ دکھائی دیتی ہیں' تالیہ حانم۔ تم مجھے اتنا ہی جان سکتی ہو جتنا میں چاہوں' جیسے میں چاہوں۔"

پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "الماس کو کال کرنے کا بہترین وقت ہے۔"

طویل گھنٹی کے بعد فون اٹھالیا گیا تھا۔ الماس کی آواز سے لگتا تھا کہ اسے سانس چڑھی ہوئی ہے۔

"جی زینپ؟"

"الماس جنم...... صبح بخیر۔ مجھے مترجم کے بارے میں بات کرنی تھی۔"

"ہاں جی۔ کیا فائنل ہوا مترجم سے؟"

"وہ کل سے کام شروع کر سکتی ہے۔ لیکن تاخیر کی تو وہ ترجمہ نہیں کرے گی۔ دوسرے کسی مترجم پہ مجھے اتنا بھروسہ نہیں ہے۔ اگر میرے پاس مسودہ ہوتا تو میں کل پہ کام شروع کروادیتی لیکن......" وہ سوگواریت سے کہہ رہی تھی۔ "مجھے نہیں لگتا کہ ہم وقت پہ اس کتاب کا ترکش ترجمہ لاسکیں گے۔ شاید آپ کے الیکشن کے بعد....."

"زینپ.... بات سنیں۔" الماس پھولے تنفس کے درمیان قطعیت سے بولی۔ تالیہ نے پلکیں اٹھا کے جہان کو دیکھا جس نے ہونٹ گول کر کے زیرلب کہا تھا۔ "ٹولڈیو۔"

"زینپ اگر آپ ایک نان ڈسکلوژر ایگریمنٹ اور کانٹریکٹ بنا کے اس کو نوٹرائزڈ کروائیں' اس پہ اپنے اور اپنے باس کے سائن لیں' ساتھ میں اپنے اور باس کے پاسپورٹ کی کاپیز اٹیچ کر کے مجھے بھیج دیں تو میں مسودہ آپ کو ترکی آنے سے پہلے دے دوں گی۔"

"اوہ...وہ تو میں کر دوں گی الماس' لیکن یہ کاغذات فیڈ ایکس کرنے میں بھی دو سے تین دن....."

"آپ فیڈ ایکس مت کریں۔ ہم ویسے بھی کروز پہ ہیں۔ آپ مجھے ان کی اسکینڈ کاپی بھیج دیں۔ میں آپ کے دستخط شدہ کاغذات دیکھ لوں تو مسودہ آپ کے حوالے کر دوں گی۔" وہ سمجھ داری سے کہہ رہی تھی۔

تالیہ مراد نے کھل کے گہری سانس لی۔

"ڈن۔ میں شام تک ڈاکومنٹ نوٹرائزڈ کروا کے بھیجتی ہوں۔ چند گھنٹے لگیں گے۔ مگر مترجم نے آنا ہے اور....."

"صبح سے پہلے مسودہ آپ کے ڈیسک پہ ہوگا۔" وہ قطعیت سے بولی تھی۔

کال ختم ہوئی تو چند لمحے وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ مسکراہٹ بھی یوں چہرے پہ ثبت تھی جیسے وہ مسکراتے ہوئے برف کا بت بنی ہو۔ پھر بے اختیار اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ برف کے مجسمے کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ...وہ مان گئی۔ فائنلی...... فائنلی...... کتاب ہمارے ہاتھ لگنے والی ہے۔" وہ بدقت بول پائی۔

"اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ اس کتاب کا بوجھ مزید نہیں اٹھانا چاہتی۔ وہ ابھی فوراً ٹویٹ کر کے دنیا کو بتائے گی کہ کتاب وہ ایک سے زیادہ پبلشرز کو بیچ چکی ہے تاکہ اس کی جان لینا صوفیہ کے لیے بے سود ہو۔"

"ہاں مگر اس پہ گولی چلانا بری بات تھی۔ میں آتشی اسلحے کے ساتھ کبھی کام نہیں کرتی۔"

"اتنے لمبے مکالمے مت بولو اور کانٹریکٹ کا سوچو۔ ایک ترکش قانونی اعتبار سے فول پروف کانٹریکٹ تمہیں کوگل پہ نہیں ملے گا۔"

جواب میں تالیہ نے چہرے پہ خوش آمدی مسکراہٹ سجائی اور آگے ہوئی۔

"تھینک یو۔ تمہاری وجہ سے کام بہت آسان ہو گیا۔ اچھا سنو...... تم کسی ترک وکیل کو جانتے ہو جو ہمیں کانٹریکٹ بنا دے؟"

"ڈونٹ بی کیوٹ۔ میں کبھی ترکی نہیں گیا اور میں کسی ترک وکیل کو نہیں جانتا۔" رکھائی سے کہہ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "کانٹریکٹ تم خود بناؤ گی۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ باقی اس پہ نوٹری کی مہر، جعلی دستخط، پاسپورٹ کا پیز، وہ میں بنا لوں گا۔ مگر کانٹرکٹ میں کیا لکھنا ہے، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔"

پل بھر میں وہ ازلی بے نیاز انسان بن چکا تھا۔ تالیہ نے مصنوعی خوش اخلاقی ترک کر کے خفگی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

ایک دن کے اندر بنا بنایا کانٹریکٹ اسے صرف ایک شخص سے مل سکتا تھا اور اس شخص کو کال کرنے کے لیے اپنی انا پہ پیر رکھنا ضروری تھا۔

"وعلیکم السلام چے تالیہ......! آپ کی ناراضی ختم ہو گئی؟"

وہ جہاز کے عرشے پہ بچھی مصنوعی گھاس پہ کھڑی تھی۔ فون کان سے لگا رکھا تھا اور ماتھے پہ بل تھے۔ شپ پھر سے چل پڑا تھا اور تیز ہوا اس کے بالوں کو پیچھے کی طرف اڑا رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ خشک سے انداز میں بولی۔ "جتنے گلے مجھے تم سے ہیں، اتنے ہی تمہیں مجھ سے ہیں۔"

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ بلکہ میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے لیے مجھے اس سے زیادہ کرنا چاہیے تھا مگر میں واقعی سمجھا تھا کہ آپ ٹھیک ہیں اور اپنی مرضی سے حکومتی افسران کے ساتھ ہیں کیونکہ آپ وان فاتح کو وہ کیک بھیج رہی تھیں اور......"

"ایک منٹ ...ایک منٹ!" سنہری دھوپ میں کھڑی تالیہ کی آنکھیں اچنبھے سے چھوٹی ہوئیں۔ "کون سے کیکس؟"

"نہیں مجھے گلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ میرے انٹرویوز نہ دیکھیں، میری بک لانچ میں شرکت نہ کریں، میرے......"

"چھوڑو اپنے غموں کو۔ مجھے بتاؤ کون سے کیکس؟" وہ ایک دم فون پر دھاڑی۔ ایڈم لمحے بھر کو ہکا بکا رہ گیا۔ اس کا انداز یکا یک قدیم ملاکہ کی شہزادی والا ہو گیا تھا جو شاہی مورخ کا ہاتھ کٹوا سکتی تھی۔

"وہ...... وہ آپ ہر روز وان فاتح کے گھر کیک بھیجتی ہیں نا۔"

"نہیں ایڈم۔ میں ان کو کیوں کیک بھیجوں گی؟" وہ چونکی۔ "کوئی میرے نام سے ان کو کیک بھیج رہا ہے کیا؟ تمہیں کیسے معلوم؟"

"نہیں شک تھا کہ آپ کم از کم وان فاتح سے رابطے کی کوشش کریں گی اور تحقیق کروانے پہ پتا چلا کہ آپ ان سے کیکس کے ذریعے رابطے میں ہیں۔ تب ہی تو ہمیں لگا کہ آپ ٹھیک ہیں۔"

"اور تم نے یقین کر لیا؟ کوئی کسی کے نام سے کچھ بھی بھجوا سکتا ہے آج کل۔"

"نہیں۔ داتن نے چیک کیا تھا آپ کے کریڈٹ کارڈ سے آرڈر پلیس ہوا تھا۔ اور ہر روز آپ نیا آرڈر کرتی تھیں۔ کیا یہ آپ نے نہیں کیا؟" وہ خود بھی پریشان ہو گیا۔

"آف کورس نہیں۔ شاید یہ دولت صاحب کی کوئی چال ہو۔"

"عصرہ نے ٹوئیٹ بھی کیا تھا ایک دن آپ کا کیک۔ آپ کا نام لکھ کے۔ آپ نے نہیں دیکھا؟"

"عصرہ...... یہ ضرور عصرہ بیگم کا کوئی چکر ہے...... اور اس نے مجھے ٹوئیٹر سے بلاک کر رکھا ہے۔ میں دوسری آئی ڈی سے دیکھ لیتی اگر مجھے عصرہ کو اسٹاک کرنے میں دلچسپی ہوتی۔" اس کے ماتھے پہ شکنیں پڑ گئی تھیں۔ "سنو... تم داتن سے کہو، وہ ان کیکس کو ٹریک کرے اور......"

"چے تالیہ آپ کو داتن سے خود بات کرنی پڑے گی کیونکہ آپ تعلقات درست کیے بغیر پہلے

جیسے روابط کی توقع نہیں کر سکتیں۔" وہ قطعیت سے بولا تو وہ چپ ہو گئی۔ چند لمحے کے لیے اسے سب بھول گیا تھا۔

"مگر میں اپنے طور پہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیونکہ میرے اور آپ کے تعلقات میرے خیال میں درست ہو چکے ہیں۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔

وہ مسکرائی نہیں۔ مگر اسے غصہ بھی نہیں آیا۔ بس اداسی سے دور تک سانپ صورت پھیلے نیلے دریا کو دیکھے گئی۔

"پچ تالیہ۔" اس کی خاموشی پہ وہ سادگی سے بولا۔ "کیا نئے دوست ہم سے زیادہ اچھے ہیں؟"

"وہ تو میں نے یونہی کہا تھا۔" جلدی سے بولی اور ادھر ادھر دیکھا۔ شکر وہ پیچھے نہیں کھڑا تھا۔

"اوکے۔" وہ جیسے مسکرا دیا تھا۔ "میں کیکس کا راز پتا کرتا ہوں۔ اور آپ......"

"ایڈم مجھے وہ کانٹریکٹ چاہیے جو ترکش ایجنسی نے تمہیں بھیجا تھا۔ وہ تمہارے پاس ہو گا ای میل میں' ہے نا؟" وہ تیزی سے بولی تو ایڈم لمحے بھر کو چپ رہ گیا۔

"تو آپ نے مجھے کام کے لیے فون کیا تھا؟"

"ظاہر ہے' کام کے لیے کیا تھا' ورنہ تم اتنے انٹرسٹنگ انسان نہیں ہو جو کوئی تمہیں گپ شپ کے لیے کال کرے۔"

وہ جل کے بولی تو وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"کام بھی ان ہی کو کہا جاتا ہے جن پہ مان ہوتا ہے۔ میں اسی پہ خوش ہوں۔ کانٹریکٹ ای میل کر رہا ہوں۔ یہ میری پہلی ای میل ہو گی جو اتنے عرصے میں آپ پڑھیں گی۔"

(ای میلز۔) وہ چونکی تھی۔ ایڈم نے فون بند کر دیا تھا اور تالیہ.... وہ پول کے کنارے ایک چیز پہ آ بیٹھی اور اپنی ای میل کھولنے لگی۔ ڈلیٹڈ فولڈر میں تمام ای میلز موجود تھیں جو اتنے دن سے وہ مٹائے جا رہی تھی۔ اس نے پریشانی اور اداسی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کو کھولنا شروع کیا۔

داتن اسے بتا رہی تھی کہ وہ اس کے لیے فکرمند ہے۔ مگر اس نے معلوم کیا ہے کہ وہ وان فاتح کو کیک بھیجتی ہے' یعنی وہ ٹھیک ہے۔ لیکن وہ داتن سے رابطہ کیوں نہیں کر رہی؟ اس کی ہر ای میل ان ہی اداس سوالوں سے پر تھی۔

ایڈم بھی ان ہی کیکس کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی کامیابیاں بھی بتا رہا تھا۔ یہ بھی کہ فاتح اس کے گھر جاتا تھا۔ اور یہ بھی کہ ایڈم اسے اپنی زندگی میں واپس دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کب آئے گی؟

اور فاتح.... اس کی ای میلز کم تھیں اور مختصر بھی اور ان میں بھی ایک بات تھی۔ کہ وہ اسے کیکس کیوں بھیجتی ہے؟ یہ کوئی ناراضی ہے؟ یا غصے کا اظہار؟ وہ بغیر بتائے ملک سے باہر چلی گئی' کیوں؟ وہ اس کی واپسی کا منتظر ہے۔ اور وہ اسے مزید خط نہیں لکھے گا۔ مگر وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ وہ صوفیہ کی کسی بات کا اعتبار نہ کرے۔ صوفیہ دیانت دار عورت نہیں ہے۔

دوپہر اس کے گرد پگھل رہی تھی اور وہ سرما کی دھوپ میں جہاز کے عرشے پہ گم صم سی بیٹھی تھی۔

وہ ان ای میلز کو اس لیے نہیں پڑھنا چاہتی تھی کہ وہ اس کا دل موم کر دیں گی۔ پیچھے رہ جانے والوں سے بندھی ڈور اسے ایک دفعہ پھر کمزور کر دے گی اور وہ اپنے کام پہ فوکس نہیں کر پائے گی۔ مگر انہیں پڑھنے کے بعد دل تو کیا روح تک اداس ہو گئی تھی۔

اسے یہ ای میلز نہیں پڑھنی چاہیے تھیں۔ اسے پیچھے والوں سے ابھی تک ناراض رہنا ہے۔ اسے ان کی کوئی بات نہیں سننی۔

تالیہ نے کانٹریکٹ جہان کو فارورڈ کر دیا اور پھر چیئر کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اوپر چھتری تنی تھی جو اسے تیز دھوپ سے بچا رہی تھی۔ اس نے ہیٹ چہرے پہ رکھ کے آنکھیں موند لیں اور خود کو نیند کے دریا میں اترنے دیا..... نیچے..... اور نیچے..... پانی اس کے کندھوں تک آ گیا..... اور پھر سر کے اوپر.....

وہ سرما کی دھوپ میں سو چکی تھی۔

اس کے خواب عجیب سے تھے۔ گزشتہ دنوں کے تمام واقعات ان میں دکھائی دے رہے تھے۔

نیلوفر' الماس' دولت..... وہ جیل ..... اور پھر یکا یک منظر بدلا.....

لکڑی کا فرش تھا..... اس پہ دو سفید پیر جوتوں میں مقید نظر آ رہے تھے...... کالے ربڑ کے جوتے..... جو گیلے تھے...... فرش پہ ارد گرد پانی کے قطرے بھی گرے ہوئے تھے ..... داہنے پیر کے ٹخنے پہ کمان صورت کھرنڈ بنا تھا... زخم پرانا تھا..... اور وہ پیر پیچھے کو اٹھ رہے تھے ..... گیلے جوتوں سے چیں چیں کی آوازیں آ رہی تھیں......

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ ہیٹ نیچے جا گرا۔ وہ چیز پہ سیدھی ہو بیٹھی۔

اس نے نہیں دیکھا کہ ہیٹ کو ہوا کا تیز جھونکا اڑا کے سوئمنگ پول پہ لے جا کے پٹخ رہا ہے۔ وہ بس عجیب خوف کے عالم میں اٹھی اور نیچے جاتے زینے کی طرف لپکی۔

وہ ان پیروں کو پہچانتی تھی..... وہ ان جوتوں کو بھی پہچانتی تھی.....

وہ تیز دھوپ سے اندر زینے کی طرف آئی تھی تو یہاں اندھیرا سا تھا۔ بصارت کو ایڈجسٹ ہونے میں کچھ دیر لگنی تھی۔ تالیہ نے اندھا دھند زینے اترنے چاہے۔ پیر کو ٹھوکر آئی اور وہ منہ کے بل آگے کو گری۔

بر وقت ریلنگ تھام لی مگر چوٹ لگ چکی تھی۔

وہ وہیں زینے پہ بیٹھتی چلی گئی اور دائیں پیر کو اٹھا کے دیکھا۔

ٹخنے پہ ریلنگ کے کسی نوکیلے حصے سے کٹ لگ گیا تھا۔

سرخ کمان کی صورت کا کٹ۔ اس میں سے خون رس رہا تھا اور وہ بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ہر زخم پہ کھرنڈ بنتا ہے۔ چند دن میں اس پہ بھی بن جائے گا۔ اور پھر؟ پھر کیا ہونے جا رہا تھا؟

☆☆☆

سہہ پہر اتر رہی تھی اور وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی گول کھڑکی کے آگے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ دائیں پیر پہ پٹی بندھی تھی۔ اور چہرہ بے تاثر تھا۔

سامنے پی کیپ والا آدمی لیپ ٹاپ گود میں رکھے بیٹھا کیز پریس کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ کانٹریکٹ کافی اچھا ہے۔ اس میں جو قانونی طرز کی ترک اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں وہ ہم خود سے نہیں بنا سکتے تھے۔'' کہتے ہوئے اس نے اسکرین سے نظر اٹھا کے تالیہ کو دیکھا۔ وہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ نظریں اپنے زخمی پیر پہ تھیں۔

''ٹیٹنس شاٹ لگوایا تھا؟''

تالیہ نے نظریں اٹھائیں اور سر کو اثبات میں جنبش دی۔ بولی کچھ نہیں۔

''کانٹریکٹ کو میں نے ایڈیٹ کر دیا ہے۔ اس کے امیج بنا کے کنارے پیلے کر دیے ہیں تاکہ یہ اسکینڈ تصاویر لگیں۔ زینب اور مولوت بے کے دستخط بھی ڈیجیٹلی کیے ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ ہاتھ سے کیے ہوں۔'' وہ فخر سے بتا رہا تھا۔

تالیہ نے پھر سے اپنے پیر کو دیکھا۔ (ایسا زخم کتنے دنوں میں کھرنڈ میں تبدیل ہوتا ہے؟)

''میں نے دونوں دستخط نیلے رنگ میں کیے ہیں مگر ایک بال پوائنٹ والے رائل بلیو اور دوسرے کو ڈارک بلیو میں کیا ہے۔ لٹریری ایجنسی کے دو اہم عہدیدار اب ایک ہی قلم تو استعمال نہیں کریں گے۔ اور ہاں..... دونوں دستخطوں میں سیکنڈ نیم بڑے حروف میں لکھا ہے کیونکہ ترک اپنا دوسرا نام (سر نیم) ہمیشہ بڑے ہجوں میں لکھتے ہیں۔''

وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی تو اس نے لیپ ٹاپ میز پہ رکھا اور آگے ہو کے بیٹھا' پھر غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم میرے کام کی تعریف نہ کرو۔ مجھے پتا ہے تم میری غیر موجودگی میں یہ کام کر دو گی' لیکن کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''یہ میرا پی ٹی ایس ڈی نہیں ہے۔'' وہ اپنے

زخمی پیر کو دیکھ رہی تھی۔
"ہر پی ٹی ایس ڈی کا شکار شخص یہی سمجھتا ہے۔"
"نہیں۔" اس نے چہرہ اٹھا کے جہان کو دیکھا اور قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ قدموں کی آواز جو مجھے آئی ہے.... وہ میری hallucination نہیں ہے۔ وہ سب میرے ساتھ پیش آنے والا ہے۔ میرے خواب اکثر امید لاتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی وہ وارننگ بھی ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کچھ برا ہونے جا رہا ہے۔"
"میری سائیکاٹرسٹ والی آفر ابھی تک برقرار ہے۔ فی الحال تم جاب پہ فوکس کرو۔ تمہیں الماس کو یہ کانٹریکٹ بھیجنا ہے۔" اس نے جتا کے یاد کرایا تو تالیہ نے سر جھکا اور لیپ ٹاپ اٹھا لیا۔
"کچھ برا ہونے والا ہے۔" وہ جھرجھری لے کر اب ٹائپ کرنے لگی تھی۔
"تمہارے پریشان ہونے سے کیا وہ نہیں ہوگا؟" اس نے سختی سے تنبیہ کی تو تالیہ نے سر ہلایا اور جلدی جلدی ٹائپ کرنے لگی۔ کانٹریکٹ اتنی مہارت سے بنایا گیا تھا کہ الماس کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی آپشن نہیں ہوگا۔
رات تک مسودہ اس کے پاس ہوگا' اسے یقین تھا۔

☆☆☆

ایک اور رات نیل کے دریا پہ اتری اور منروا کروز کی رفتار مزید سست پڑ گئی۔ منروا کے قریب دریا میں دو تین چھوٹی کشتیاں بھی تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔
باہر جتنا سناٹا اور سکون تھا' منروا کے اندر اتنی ہی گہما گہمی اور رونق تھی۔
شپ کے گراؤنڈ فلور پہ ایک طویل راہداری کی صورت بیکری بنی تھی۔ وہاں قطار میں شوکیس لگے تھے جن کے اندر رکھے کیک' ڈیزرٹ' اور سوئیٹس قریب آتے مسافروں کو للچا رہے تھے۔
اس نے پٹی والے پیر پہ نرم سلیپر پہن رکھے تھے اور سر پہ اونی ٹوپی تھی جس سے کالے بال نکل کے گردن سے نیچے گر رہے تھے۔ وہ جہاز کے سرد ہوتے موسم کی مناسبت سے پوری تیار لگ رہی تھی۔

سردی اچانک ہی آئی تھی مگر موسم کو خوشگوار کر گئی تھی۔
"ایک چاکلیٹ فج .... ایک چاکلیٹ بون بون ......" وہ شوکیس کے اندر سجے کیکس کی طرف اشارہ کرتی سیلز گرل سے کہہ رہی تھی۔ دو ورکرز دستانے والے ہاتھوں سے اس کی بتائی پیسٹریز اور سوئیٹس ٹوکری میں بھرتے جا رہے تھے۔
وہ خواب' پیر کا زخم' ایڈم کی باتیں..... کچھ دیر کے لیے وہ سب بھول کے صرف اس مسودے کو سیلیبریٹ کرنا چاہتی تھی جو الماس اسے ای میل کرنے والی تھی۔ مسودہ مل جانے کے بعد ساری رات تالیہ نے اس کو پڑھنا ہی تھا اور اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ کھانے والی تفریح بھی چاہیے تھی۔
اس کی آزادی کا ٹکٹ' وہ کتاب اس کو ملنے والی تھی۔ وہ واقعتاً خوش ہونا چاہتی تھی۔
وہ بھری ہوئی ٹوکری لیے کمرے میں پہنچی تو وہ پہلے سے اپنے مخصوص صوفے پہ بیٹھا تھا۔ چاکلیٹس کی خوشبو تالیہ کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی منہ تک بھری ٹوکری دیکھ کے جہان نے تعجب سے ابرو اٹھائے۔
"یہ سب تم کھاؤ گی؟"
"ایک آدھ پیس تم بھی لے سکتے ہو۔ میں آج اچھے موڈ میں ہوں۔" فراخ دلی سے آفر کی اور کمرے کی سینٹر ٹیبل پہ ٹوکری رکھی۔ پھر چیزیں نکال نکال کے ان کو پلیٹس میں سجانے لگی۔ چاکلیٹ کی مہک سارے کمرے کو معطر کر گئی۔
"کوئی نارمل انسان اتنی چاکلیٹ نہیں کھا سکتا۔"
"چاکلیٹ میری پہلی محبت ہے۔ حالات نے ہم دونوں کو فاصلہ رکھنے پہ مجبور کر دیا مگر کبھی کبھی ہم روایات توڑ کے مل لیتے ہیں...." وہ مسکرا کے کہہ رہی تھی جب موبائل کی مخصوص ٹون بجی۔ تالیہ نے جلدی سے فون نکالا اور دھڑکتے دل سے الماس کی ای میل کھولی۔
"اس نے ایم ایس ورڈ فائل بھیجی ہے۔" ای میل کھولنے سے پہلے سائن نظر آ گیا تو چہک کے

بولی اور ای میل پڑھنے لگی۔

''ڈیئر زینب۔ آپ کا کانٹریکٹ مجھے بالکل مناسب لگ رہا ہے۔ اور ہمارے لیے یہ قابلِ قبول ہے۔ چونکہ آپ کو کل ترجمہ شروع کروانا ہے' اس لیے میں نے ایک بہترین حل نکالا ہے۔

میں آپ کو مسودے کے پہلے پانچ ابواب بھیج رہی ہوں۔ آپ ہمارے ترکی آنے تک ان کو ٹرانسلیٹ کروائیں۔ ہم خود آ کے' کانٹریکٹ سائن کر کے' پوری کتاب آپ کو دے دیں گے۔ یوں دن بھی ضائع نہیں ہوں گے۔ اور کتاب وقت پہ بھی آ جائے گی۔ الماس۔''

تالیہ کی مسکراہٹ یوں غائب ہوئی جیسے اسے کسی نے تھپڑ دے مارا ہو۔ وہ منہ کھولے فون اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ قاتلانہ جملے کے جذباتی اثر سے نکل کے الماس نے ایک دانش مندانہ حل نکالا تھا اور وہ حل میز میں سجی ساری شیرینیوں کو کڑوا کر گیا تھا۔

''یہ کیا؟'' اس نے ہکا بکا سا چہرہ اٹھایا۔

''ڈیم اِٹ۔'' جہان نے زور سے بوٹ سے میز کو ٹھوکر ماری اور اٹھا۔ وہ جیسے سخت بدمزہ ہوا تھا۔

''پہلے پانچ ابواب میں سے دو تو وہ پہلے ہی بھیج چکی ہے اور وہ ابواب نیلوفر کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ہیں۔ کسی کو ان سے دلچسپی نہیں ہے۔ ہمیں درمیان اور آخر کے ابواب چاہیے تھے۔''

''اب ہم کیا کریں؟'' وہ واپس اسکوائر ون پہ آ کھڑے ہوئے تھے۔

''تم یوں کرو......'' وہ سوچ سوچ کے کہنے لگا۔ ''تم اس کو ای میل کرو' اور اس کو پیار سے سمجھاؤ کہ.... کیا کر رہی ہو؟''

''مجھے بھی سرپرائزز اچھے لگتے ہیں۔'' وہ دانت پیس کے کہتی ہیڈ فون کان پہ لگا رہی تھی۔ اس کی رنگت گلابی پڑ چکی تھی۔

''تالیہ... اس کو یوں کال مت کرو۔ پہلے سوچ سمجھ کے پلان کرو' پھر....''

''مشورہ مانگا ہے کیا؟'' اس نے کیز دباتے ہوئے سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔

اس کا انداز دیکھ کے وہ احتیاطاً چپ ہو گیا۔

دوسری طرف سے الماس کا ہیلو سنائی دیا۔ تالیہ نے کال اسپیکرز پہ لگا دی تھی۔

''زینب... ای میل مل گئی؟'' وہ خوش گوار انداز میں بولی۔

''الماس یہ تو پانچ ابواب ہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''جی۔ جب تک آپ ان کا ترجمہ کروائیں گی' ہم....''

''الماس آپ نے میرا نان ڈسکلوژر ایگریمنٹ پڑھا ہے؟ پڑھا ہے یا نہیں؟''

''جی میں نے....''

''اس پہ میرے اور میرے باس کے سائن ہیں۔ جانتی ہیں ہم دونوں کون ہیں؟'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ ''ہم ترکی کے ٹاپ لٹریری ایجنٹ ہیں اور اس ایگریمنٹ میں ہم دونوں نے نیلوفر خانم سے حلفیہ وعدہ کیا ہے کہ اس مسودے کو لیک نہیں کریں گے اور اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارا لائسنس کینسل ہو جائے گا۔ یعنی دوبارہ بھی لٹریری پریکٹس نہیں کر سکیں گے۔ آپ کو اندازہ ہے کہ بغیر مسودہ دیکھے میرے باس نے (آواز غصے سے بلند ہونے لگی)... جو کہ یورپ کے ایک نامور ایجنٹ ہیں... جو ہارپر کولنز اور رینڈم ہاؤس جیسے اداروں کے ساتھ کام کرتے ہیں.... اس آدمی نے بغیر مسودہ دیکھے میرے قول پہ اعتبار کر کے اتنا بڑا ڈاکومنٹ سائن کر کے دے دیا.... کیونکہ میں نے کہا تھا کہ صبح تک آپ مسودہ بھیج دیں گی۔''

''زینب.... میں.....''

''میرے باس نے اتنی بڑی بڑی کتابیں چھاپی ہیں کہ ان کے لیے ایک سیاسی کتاب اتنا میٹر نہیں کرتی جتنی ان کی کریڈیبلٹی میٹر کرتی ہے۔ صبح جب میں ان کو بتاؤں گی کہ میری کلائنٹ نے مجھ پہ اعتبار نہ کرتے ہوئے پورا مسودہ نہیں بھیجا' تو پورا آفس مجھے کس نظر سے دیکھے گا؟ سب جانتے ہیں کہ ہم اپنے دستخطوں کے ساتھ نان ڈسکلوژر آپ کو دے چکے ہیں۔ کل کو آپ

کانٹریکٹ نہ کریں اور کوئی اور کتاب لیک کر دے‘ تو ہمارے لائسنس تو کینسل ہو گئے نا؟"

"نہیں۔ زینپ.... میری بات سنیں۔"

"میں نے پورا مسودہ اس لیے مانگا تھا کیونکہ کل اس کتاب کی ٹیبل ریڈ ہونی تھی۔ میرے باس‘ مترجم اور میں نے ایک میز پہ بیٹھ کے پوری کتاب پڑھنی تھی۔ مترجم ایک آرٹسٹ ہوتی ہے۔ اس کو پوری کتاب دی جاتی ہے‘ کانٹریکٹ کیا جاتا ہے‘ وہ اپنی مرضی سے ابواب کا جہاں سے چاہے ترجمہ کرتی ہے۔ پہلے مشکل ابواب کا۔ پھر آسان کا۔ ہمیں وہ کتاب ترتیب سے دے گی‘ لیکن ہم اس کو بچوں کی طرح قسطوں میں ہوم ورک نہیں دے سکتے۔ سارے یورپ میں پتا کر لیں۔ کوئی مسودہ دیکھے بغیر نان ڈسکلوژر سائن نہیں کرتا مگر ہم نے کر لیا۔"

"زینپ.... اصل میں آخری ابواب کی پروف ریڈنگ ابھی ہونا تھی‘ اس لیے...."

"الماس مجھے نہیں معلوم آپ کے کیا مسائل ہیں مگر میں صبح آفس میں کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ میں ایک عورت ہوں جو مردوں کی دنیا میں نام بنانے نکلی ہے۔ یہاں سب میرے ناکام ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ آپ یوں کریں‘ آپ میرے نان ڈسکلوژر کی ای میل ڈیلیٹ کر دیں۔ میں باس کو کہوں گی کہ میں نے وہ بھیجا ہی نہیں تھا۔ اور آپ مجھے مسودہ نہ بھیجیں۔ میں اس کتاب کو چھاپنا چاہتی تھی لیکن اگر ہمارے درمیان اعتبار ہی نہیں ہے تو ہم اس کام کو کرتے ہی نہیں ہیں۔ آئی ایم سوری اگر میں نے کچھ سخت کہہ دیا ہو مگر میرا سارا کیریئر داؤ پہ لگ چکا ہے اور میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ ایگا جلار (گڈ نائٹ)۔"

اس نے آخری فقرہ سوگواریت سے کہہ کے کال کاٹ دی اور گہری سانس لیتے ہوئے سرخ تمتماتا چہرہ اٹھایا۔

وہ جو اتنی دیر سے چپ چاپ صوفے پہ بیٹھا تھا‘ کھنکھارا۔

"اب میں بول لوں؟" احتیاط سے پوچھا۔

"کیا واقعی مترجم اپنی مرضی سے بغیر ترتیب کے ترجمہ کرتا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا۔"

"اور ٹیبل ریڈ؟ وہ تو ٹی وی ڈراموں کے اسکرپٹ کی نہیں ہوتی؟"

"اللہ کرے اس کو یہ بات نہ معلوم ہو۔" وہ گہرے گہرے سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یا تو اس نے الماس کو بالکل کھو دیا تھا یا پھر الماس وہ کرنے والی تھی جو اسے کرنا چاہیے تھا۔

ای میل کی ٹون بجی تو تالیہ نے بے چینی سے میل کھولی۔

الماس نے معذرت کے بعد لکھا تھا کہ اس نے صرف اس لیے مسودہ نہیں بھیجا تھا کیونکہ ابھی وہ آخری ابواب کو پروف کر رہی تھی۔ اسے زینپ پہ مکمل اعتبار ہے۔ اس لیے اب وہ پورا مسودہ بھیج رہی ہے۔

تالیہ نے اٹیچ شدہ فائل کھولی تو چار سو پچاس صفحات کی فائل کھل گئی۔

پوری کتاب.... ملائیشیاء کی حساس ترین اور اسکینڈلیس ترین کتاب اس کے فون میں تھی۔ اس کی ساری کلفت دور ہونے لگی۔ بالآخر وہ مسکرائی۔

"میں نے کبھی کتابیں شوق سے نہیں پڑھیں۔ مگر یہ وہ پہلی کتاب ہوگی جس کو میں اتنے شوق سے پڑھنے جا رہی ہوں۔" وہ کشن لے کر سینٹر ٹیبل کے ساتھ جا بیٹھی جس پہ انواع و اقسام کے میٹھے کھانے سجے تھے۔

جہان نے اپنے موبائل پہ فائل کھولی اور اسی صوفے پہ ٹیک لگا کے فون چہرے کے سامنے کیے مطالعے کا آغاز کیا۔

"میں تمہاری تعریف نہیں کرنا چاہتا مگر ویل ڈن‘ تالیہ حانم۔"

صفحات چار سو پچاس تھے اور رات ابھی شروع ہوئی تھی۔

وہ میز کے ساتھ قالین پہ کشن کے سہارے بیٹھی، فج کا ٹکڑا کھاتے ہوئے کتاب میں غرق تھی۔
نیلوفر کی ابتدائی زندگی کے ابواب تلخ تھے یا ان کو شاید تلخ بنایا گیا تھا۔
(چاکلیٹ فج کتاب کے اولین صفحات کے ساتھ اس کے حلق کے اندر جا رہی تھی۔ اس کا ذائقہ تلخ تھا اور شکر کے دانے دانتوں کے بیچ محسوس ہوتے تھے۔ جیسے ڈھیروں کڑواہٹ کو ذرا سی شکر ڈال کے میٹھا بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔)
"اس نے اپنے بچپن اور نوجوانی کے ایام کو زبردستی دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ سو بورنگ۔"
وہ صوفے پہ ٹیک لگائے بیٹھا موبائل سے کتاب پڑھتے ہوئے تبصرہ کر رہا تھا۔ دفعتاً وہ آگے کو جھکا اور ایک چاکلیٹ میکرون اٹھا کے منہ میں رکھا۔
"جوانی کے ابواب میں نیلوفر نے اپنی جتنی تعریفیں لکھی ہیں، ان کے باوجود مجھے یہ ایک انتہائی کمزور عورت معلوم ہو رہی ہے جو ایک طاقتور آدمی اور اپنی خواہشات کے دباؤ میں آ کر فوراً جھک جاتی ہے۔"
وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔
باہر رات اب دوسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی۔
دریا پرسکون تھا اور دورا کا دکا کشتیاں تیرتی نظر آتی تھیں۔
وہ اب نیلوفر اور عبدالرحمٰن کی شادی کے گزرے ماہ و سال کا حال پڑھ رہی تھی۔
"ایک عورت اتنی ایکس رینیٹڈ بک اپنی کم عمر بیٹی کے ساتھ کیسے لکھ سکتی ہے؟" وہ ناگواری سے پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ نیلوفر کی طلاق اور اس کے بعد کے ابواب بھی شادی کے ابواب سے زیادہ مختلف نہ تھے۔
تیسرا پہر شروع ہوا اور جہان نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ منہمک سی کتاب کے مطالعے میں گم تھی۔ وہ جو پڑھ رہی تھی، ویسے ہی تاثرات اس کے چہرے پہ تھے۔
"ایک سوال پوچھوں؟" وہ سوچ کے کہہ رہا تھا۔
"ابھی نہیں۔ ہمیں صبح سے پہلے اس کو مکمل کرنا ہے۔" تالیہ نے موبائل سے نظریں ہٹائے بغیر اس کو چپ کروا دیا۔ اس نے پہلو بدلا اور واپس پڑھنے لگا۔ صوفیہ رحمٰن کی کردار کشی پہ لکھے باب کو نگلنے کے لیے اس نے منی چاکلیٹ چیز کیک کا ٹکڑا اٹھا لیا تھا۔
آخری ابواب نیلوفر کی بے چارگی بھری حالیہ زندگی کی کہانی سناتے تھے۔ کیسے اسے کئی سال سے صوفیہ کی طرف سے دھمکیاں دی جاتی رہیں، مگر وہ ڈٹی رہی۔ ان ابواب میں فاتح سمیت دوسرے کئی سیاستدانوں کی کردار کشی بھی کی گئی تھی۔ تالیہ کا نام بھی کئی دوسری خواتین کے ساتھ درج تھا اور اسے پڑھتے ہوئے وہ ماتھے پہ بل ڈالے ہوئے تھی۔
چار سو پچاس صفحات کی کتاب ختم ہوئی تو کھڑکیوں کے باہر روشنی پھیل رہی تھی۔ تالیہ نے چہرہ اٹھایا تو اس کی آنکھیں مسلسل مطالعے سے گلابی پڑ رہی تھیں۔ وہ بڑے صبر سے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ اس نے کافی دیر ہوئی موبائل رکھ دیا تھا۔
"تم نے پڑھ لی؟"
"تمہارے برعکس مجھے کتابیں پڑھنے کی عادت ہے، اس لیے میری رفتار تیز ہے۔" وہ بے تاثر سا لگ رہا تھا۔ اسے کتاب نے اس طرح 'متاثر' نہیں کیا تھا جیسے تالیہ کو کیا تھا۔ وہ ابھی تک گہرے صدمے کے زیر اثر تھی۔
"یہ کیا تھا؟" اس کا انداز حواس باختہ سا تھا۔
"مانا کہ میں صوفیہ رحمٰن کی مخالف رہی ہوں مگر اس کا باپ اب اتنا بھی شیطان نہیں تھا جتنا اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔"
"مجھے نہیں معلوم اس میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ لکھا ہے۔ لیکن ایسی کتابیں سچائی کے دانے کے ساتھ ہی لکھی جاتی ہیں۔ جو بھی ہے، اگر وہ اس کتاب کو لے کر کئی دن میڈیا پہ انٹرویوز دیتی رہی تو بہت سے لوگ ہرٹ ہوں گے۔"
"ڈونٹ وری۔ وہ اس کتاب کو نہیں چھاپے گی۔" اس نے درد کرتی آنکھیں مسلتے ہوئے فون

رکھ دیا۔" تالیہ نے کتاب اس کے ہاتھوں سے چرا لی ہے۔ اس کو اس کے دماغ سے کیسے چراتا ہے' یہ تالیہ کو معلوم ہے۔"

اسے یقین تھا کہ وہ سیاہ رات اب ختم ہونے کو تھی۔ بالآخر وہ اپنی آزادی حاصل کرنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

منروا کروز کا سفر ابھی رواں دواں تھا۔ آج صبح وہ ایک دوسرے کھنڈر پہ رکی تھی اور مسافر اتر کے اس کھنڈر کی سیاحت میں مصروف ہو گئے تھے۔ ایسے میں تالیہ چپ چاپ اپنی جیکٹ کی ہڈ سر پہ گرائے' بیک کندھے پہ ڈالے' گردن جھکائے اس مجمعے کے درمیان سے راستہ بناتی سڑک کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اس کا کام کروز میں مکمل ہو چکا تھا۔

پانچ دن بعد اس نے کوئی سڑک دیکھی تھی۔ گاڑیاں' موٹر بائیکس اور تیز چلتی بسیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ کل تک لگتا تھا کہ ساری دنیا پانی میں ڈوب چکی ہے۔ جب وہ قدیم ملاکہ میں چار ماہ گزار کے آئی تھی' تب بھی ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

شاید ہمارے اردگرد ہر چیز ہمیں تب تک عجیب لگتی ہے جب تک اس کی عادت نہ پڑ جائے۔

برائیوں کی بھی۔

اچھائیوں کی بھی۔

اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھی۔ وہ واپس قاہرہ جا رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ہڈ کے ہالے میں اس کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ بہت عرصے بعد اس کے چہرے پہ نظر آئی تھی۔

یہ قدیم ملاکہ جانے سے قبل والی اسکامر تالیہ کی مسکراہٹ تھی۔

اب اسے صوفیہ کو کال کرنی تھی۔

"جب آپ نے مجھے ملاقات کا شرف بخشا تھا' یانگ دی برحرمت...." وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے موبائل کان سے لگائے اپنی زبان میں کہہ رہی تھی۔ صوفیہ دوسری جانب ہمہ تن گوش تھی۔ "تو آپ نے کہا تھا کہ آپ اس کتاب کو برداشت نہیں کر سکیں گی۔"

"کوئی بھی بیٹی نہیں کر سکتی۔ اب مجھے بتاؤ کہ......"

"پہلے آپ مجھے کچھ بتائیں۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔ "آپ کیوں چاہتی ہیں کہ اس کتاب کو چھاپنے کا خیال نیلوفر کے ذہن سے نکل جائے؟"

"کیا مجھے دوبارہ بتانے کی ضرورت ہے؟" صوفیہ کو یہ سوال ناگوار گزرا۔

"اس بساط پہ میں آپ کا واحد نائٹ ہوں' ملکہ عالیہ۔ آپ کو اس کتاب سے پیچھا چھڑانے کے لیے تالیہ کے سوالات کو برداشت کرنا پڑے گا۔"

صوفیہ نے کڑوی سی سانس اندر اتاری اور بظاہر تحمل سے بولی۔ "میں یہ اس لیے چاہتی ہوں تا کہ نیلوفر میرے بابا کو بدنام نہ کر سکے۔"

"اور آپ کے بابا کیسے بدنام ہوں گے؟"

"اس کی کتاب کی غلاظت لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ جائے گی۔ میرے ووٹرز کے دل میں میرے بابا کا امیج تباہ ہو جائے گا۔"

"تو یہ ہمارا سب سے بڑا خوف ہے' ہے نا؟ کہ داتو سری کو بدنام ہونے سے بچایا جائے۔"

"تم یہ آل ریڈی جانتی ہو' تالیہ۔" وہ ضبط سے بولی۔

"مزید اس کتاب کے شائع ہونے کا سوچ کے کیا بری باتیں آپ کے ذہن میں آتی ہیں؟"

صوفیہ نے چند لمحے کے لیے سوچا۔

"وہ عورت ہر بین الاقوامی چینل پہ بیٹھ کے انٹرویوز دے رہی ہو گی۔ مسالے دار چٹ پٹی باتیں بتا رہی ہو گی۔ عوام دم سادھے اس کو سن رہے ہوں گے۔ وہ ہر جگہ چھائی ہو گی۔"

"اگر ایسا ہوا بھی تو آپ کی پارٹی بھی جوابی انٹرویوز دے گی۔"

"ہاں اور اس صوفیہ بمقابلہ نیلوفر جنگ سے میری ساری کیمپین تباہ ہو جائے گی۔ میری پارٹی سب کام چھوڑ کے اس کو جواب دے رہی ہو گی فائح

کا مقابلہ کرنے کے بجائے۔ اور اگر ہم جواب نہیں دیتے تو نیلوفرون وومن شو کے طور پہ چھا جائے گی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔"
"اس کے علاوہ؟" اس کے سوال صوفیہ کو تاؤ دلا رہے تھے۔
"اس کے علاوہ یہ کہ وہ نا صرف میرے باپ کو بدنام کرے گی' بلکہ اپنی کتاب بیچ کے کئی ملین ڈالرز کما لے گی۔ وہ ایک بہت امیر عورت بننے والی ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ یہ کتاب نہ آئے۔ اگر یہ کسوٹی ختم ہو گئی ہے تو میں اپنے کام کر لوں؟"
"ایک آخری بات۔" تالیہ سوچتے ہوئے بولی۔ "آپ یہ چاہتی ہیں کہ داتو سری بدنام نہ ہوں' نیلوفر امیر نہ ہو اور وہ میڈیا پہ کسی ملکہ کی طرح بیٹھی انٹرویوز نہ دے رہی ہو۔ ہمارے یہ تین مقاصد پورے ہو گئے تو میری ڈیل پوری ہو گئی' ہے نا؟"
"ہاں اور یہ سب تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ اس کتاب کو شائع نہ کرے۔"
"یانگ دی برحرمت! (عزت مآب)" وہ مسکرا کے کھڑکی کے باہر گزرتی دکانوں کو دیکھ کے بولی۔ "میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ یہ تینوں کام ہو جائیں گے۔ میں کامیابی کے بہت قریب ہوں مگر آپ کو مجھے میرے طریقے سے کام کرنے دینا ہوگا۔"
"تمہارا طریقہ؟"
"آپ دیکھ لیں گی۔ یہ تالیہ کے پلانز ہیں۔ تالیہ کی مرضی!" اس نے مسکرا کے فون رکھ دیا۔
ٹیکسی اب قاہرہ کے ایک مصروف بازار کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف خوانچہ فروشوں کی ریڑھیاں اور رش نظر آتا تھا۔ شیشے بند ہونے کے باعث شور اندر نہیں آ رہا تھا۔ تالیہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکائے فون پہ ای میل لکھنے لگی۔
"ڈیئر الماس۔
کتاب کی نیٹل ریڈ مکمل ہو چکی ہے اور ترجمے کا آغاز ہو گیا ہے۔ یہ کتاب اتنی ایموشنل اور دل کو چھو لینے والی تھی کہ اس کو پڑھتے وقت کمرے میں ایک بھی آنکھ خشک نہیں تھی۔ میں اور میری ٹیم بے چینی سے آپ کا ترکی میں انتظار کر رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کروز پہ اپنا سفر مختصر کر کے پرسوں ہی ترکی آ جائیں۔ انڈین سب ایڈیٹر بھی یہاں ہوں گے اور آپ جلد ہمارے کام مکمل کر کے شادی کی تیاریوں میں میری فیملی کے ساتھ شامل ہو سکیں گی۔
زینب کامران!"
ٹیکسی ابھی ہوٹل کے راستے میں تھی جب اسے جوابی ای میل موصول ہوئی۔
"تھینک یو سو مچ زینب! میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ ہمیں آگے کینیڈا بھی جانا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم استنبول کے لیے پرسوں کی فلائٹ بک کر لیں۔ ایک ہفتہ ہم استنبول میں گزار کے کینیڈا چلے جائیں گے اور ہاں میری والدہ کا شادی کے لیے جوڑا بھی تیار ہے۔"
تالیہ نے مسکرا کے رسمی سا جواب دیا اور فون رکھ کے خود سے بولی۔
"اب دیکھتے ہیں بے الماس کہ کس کی عزت کس کے ہاتھ میں ہے۔"
ٹیکسی اب کھجور کے درختوں سے مزین ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نظر درختوں کے جھنڈ پہ ڈالی۔
وہ اس کے اندر کوئی خوف' کوئی ناسٹلجیا جگانے میں ناکام رہے تھے۔
شاید وہ ذہنی طور پہ تندرست ہو رہی تھی۔

☆☆☆

قاہرہ اور غزہ کو ملانے والے پل کے اوپر شام اتر رہی تھی۔ وہ ایک طویل پل تھا جس کے نیچے نیل بہہ رہا تھا۔ دریا کے اس کنارے بہت سے ریستوران بنے تھے جن کے لان پانی کے دہانے پہ ختم ہوتے تھے۔ وہاں اونچی ریلنگ بنی تھی۔
جس ریستوران میں اس وقت وہ موجود تھی' اس کی ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہو تو نیچے دریا اور سامنے پل

دکھائی دیتا تھا۔ یہاں کھڑے ہو کر پل بے حد قریب لگتا تھا۔ منروا کے سفر نے اسے نیل کا اتنا عادی بنا دیا تھا کہ وہ ایک پہر بھی دریا سے دور نہ رہ سکی تھی۔

"مرحبا۔" حسب معمول وہ بنا چاپ کے اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ البتہ اس کے بولنے پہ وہ نہیں چونکی۔ بس مسکرا کے گردن موڑی۔ آج اس نے سر پہ ہیٹ نہیں پہنا تھا۔ بلکہ سیاہ بالوں پہ ہیئر بینڈ لگا رکھا تھا اور لباس بھی ملائیشیا کا روایتی باجو کرنگ تھا۔ گلابی سا اسکرٹ اور اوپر سبز لمبی قمیص۔ کندھے پہ پھولدار اسٹول۔

"مرحبا' جہان بے۔ تم نے مجھے ڈھونڈ لیا۔"

جہان نے پتلیاں سکوڑ کے اچنبھے سے اس کے حلیے کو دیکھا۔

"تم نے کہا تھا تم کال کرو گی مگر تم نے نہیں کی۔ البتہ تم نے اپنے پرانے نمبر آن کر لیے اور اپنا حکومتی کریڈٹ کارڈ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور اب تمہیں دیکھ کے کوئی دور سے بھی بتا سکتا ہے کہ تم ملے ہو۔ مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ تم......"

"کہ میں چھپنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔" تالیہ نے کہتے ہوئے موبائل اسکرین اس کے سامنے لہرائی۔ جہان نے اسکرین کو دیکھ کے افسوس سے سر جھٹکا۔

"تم انسٹا اور ٹوئیٹر پہ چیک اِن بھی کر چکی ہو۔ سیلفی بھی ڈال چکی ہو۔ یعنی تم اپنے عوام کو بتانا چاہتی ہو کہ تم قاہرہ میں ہو۔ یہ پلان کا حصہ ہے؟"

پی کیپ والا آدمی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا وہ اس کی طرف سے مزید مشکوک نظر آ رہا تھا۔

"ظاہر ہے یہ پلان کا حصہ ہے۔" وہ چمکتی آنکھوں سے مسکرائی۔ "اور ہاں... میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔"

وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑی ہوئی اور بازو سینے پہ لپیٹ لیے۔ اس کی پشت پہ اب دریا بہہ رہا تھا جس میں دور دور تک کشتیاں تیرتی نظر آ رہی تھیں۔

"میرا شکریہ؟" اس نے تعجب سے ابرو اٹھایا۔

"ہاں۔ کیونکہ میں انسانی نفسیات کو تمہاری طرح باریک بینی سے نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے خود کو کسی کی جگہ رکھ کے سوچنا نہیں آتا تھا۔ تمہاری مدد کے بغیر میں واقعی نیلوفر کو کون نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے تمہارا شکریہ۔"

"تمہیں کوئی سر پہ چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی نا؟"

مگر تالیہ نے اس کا طنز نظر انداز کیا اور وہ گردن موڑ کے دریا کو دیکھنے لگی۔

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے صبر کرنا آ گیا ہے' لیکن بہت عرصے بعد مجھے وہی لطف محسوس ہوا ہے جو کسی کو اسکام کر کے محسوس ہوتا تھا۔ مگر تب ایک گلٹ بھی تھا جو دل کو سیاہ کر جاتا تھا۔ اس دفعہ وہ گلٹ نہیں ہے۔ میں خود کو کریڈٹ دینا چاہتی ہوں' اور واقعی......" چہرہ اس کی طرف واپس موڑا۔ "واقعی اپنی عزت کرنا چاہتی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کیا؟"

وہ جو کوئی اور چوٹ کرنے جا رہا تھا' اس بات پہ گہری سانس لی اور جوتے کی نوک سے گھاس کو مسلنے لگا۔ "تمہیں اپنے آپ پہ فخر ہونا بھی چاہیے۔ جو کام تمہاری وزیر اعظم کے وفادار سپاہی نہیں کر سکے وہ تم نے اکیلے کر دکھایا ہے۔"

"اکیلے کہاں؟ تم میرے ساتھ تھے۔"

"تمہیں واقعی سر پہ چوٹ لگی ہے۔ مگر خیر.... میں نے کچھ نہیں کیا۔ پلان تمہارا تھا۔ اداکاری تمہاری تھی۔ یہ تمہارا اپنا کمال تھا۔" وہ بے نیاز تھا۔ اسے کوئی کریڈٹ کوئی ستائش نہیں چاہیے تھی۔

"تم بھی میرے جیسے کام کرتے ہو۔ مگر تم مجھے گلٹی نہیں لگتے۔ کیوں؟"

"کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں کوئی اور کام نہیں کر سکتا تھا۔"

وہ گہری سانس لے کر اس کے ساتھ ریلنگ سے ٹیک لگائے آ کھڑا ہوا۔ اب دونوں کی پشت پہ دریا تھا۔ وہ سر جھکائے' جو گر سے گھاس کو رگڑتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ گردن موڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

"I Lie For a Living مجھے یہی کام

آتا ہے۔ لوگوں سے اپنا کام نکالنا' موقع پہ کور اسٹوریز گھڑنا.... چیزوں کو قابل یقین بنا کے پیش کرنا.... یہ میرا ٹیلنٹ ہے۔ یہی تمہارا ٹیلنٹ ہے۔ اور ٹیلنٹ اچھا برا نہیں ہوتا۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔"

"مگر اس طرح میرا ٹیلنٹ تو جھوٹ بولنا اور لوگوں کو دھوکا دینا ہوا۔"

"نہیں۔ تمہارا ٹیلنٹ لوگوں کی نفسیات کو سمجھ کے ان کے سامنے اپنی مرضی کی چیز کو قابل اعتبار بنا کے پیش کرنا ہے۔ جو لوگ اس کو اچھے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں' وہ جانتی ہو کیا بنتے ہیں؟ رائٹرز' اور موٹیویشنل اسپیکرز۔"

"رائٹرز اور اسپیکرز جھوٹے ہوتے ہیں کیا؟"

"نہیں مگر وہ "امید" کو قابل یقین بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ اچھے کاموں کی ترغیب دینے کے لیے لوگوں کے سامنے اچھائی کی فتح کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ کہانیوں کے ذریعے' تقریروں کے ذریعے۔ ان کو باتیں بنانا آتی ہیں تو وہ اچھائی کو پھیلانے کے لیے باتیں بناتے ہیں۔ اگر وہ لکھ اور بول نہ سکیں تو وہ برے لوگوں کے خلاف اپنے اسی ٹیلنٹ کو دوسرے طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے میں کرتا ہوں اور مجھے اس کا کوئی گلٹ نہیں ہے۔ میں نے خود کو قبول کرلیا ہے۔"

"مگر کچھ ماہ پہلے تک مجھے اپنا یہ ٹیلنٹ ایک بددعا لگتا تھا۔"

"نہیں۔ یہ تمہارا تحفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو کوئی نا کوئی تحفہ عطا کیا ہے۔ وہ تحفہ اس کا امتحان ہوتا ہے۔ ایسے کہ وہ اس کو ذلیل بھی کرواتا ہے' تکلیف بھی دیتا ہے اور انسان اپنی اس خوبی کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے اذیت بھی سہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے لگتا ہے کہ یہ نعمت نہیں تھی۔ یہ اس کے لیے ایک بددعا اور بوجھ تھی۔ وہ اس سے چھپنے لگتا ہے' اس سے بھاگتا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غلط اپروچ ہے۔"

"اور درست اپروچ کیا ہے؟"

"اللہ نے آپ کو جس کام میں اچھا بنایا ہے' وہ آپ کو مفت میں نہیں مل گیا کہ آپ جب چاہیں اس کو ترک کر دیں کہ مجھے اس سے دکھ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ آپ اس کے تحفے کی قدر دانی کرتے ہیں یا نہیں۔ ہر انسان کا اللہ کی دنیا میں ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ تمہارا وہ تحفہ تمہیں تمہارا مقصد تلاش کرنے کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ اس سے بھاگو نہیں۔" پھر توقف سے بولا۔ "اب اگر تم دوبارہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہو تو......"

"تھینکس بٹ نو تھینکس۔" اس نے گھڑی دیکھی۔ "اینی ویز.. وہ ماں بیٹی پرسوں ترکی جارہی ہیں جہاں ان کے خوابوں کا مقبرہ ان کا انتظار کر رہا ہے۔" اس کی آنکھیں مسکرائی تھیں۔

"تم نے طے کرلیا کہ اس کتاب کو اس کے ذہن سے کیسے چرانا ہے؟"

"ہاں...." وہ اس سوال کا جواب ڈھونڈ چکی تھی۔ "جانتے ہو ایک رائٹر کی کتاب کب اس کے ذہن میں تباہ ہوتی ہے؟ یعنی....اس کی قیمتی تخلیق اس سے شائع ہونے سے قبل کیسے چھینی جاتی ہے؟" وہ مسکرا کے کہہ رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں کیونکہ میں یہ پہلے کر چکی ہوں۔ میں نے ایک رائٹر کی کتاب شائع ہونے سے پہلے اس کے ذہن میں خراب کی تھی۔"

"وہ کیسے؟" وہ تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ایڈم جب اپنی کتاب لکھ رہا تھا تو وہ روز چند صفحات لکھ کے مجھے دیتا تھا۔ میں نے ان میں ایک ذرا سی تبدیلی کی تھی۔ ایک نام کی۔ اور ایڈم کا دل بجھ گیا تھا۔ کسی صاحب کتاب کے لیے سب سے ناقابل برداشت بات کیا ہوتی ہے؟"

"کہ اس کی کتاب میں ردو بدل کر دی جائے؟" اس نے کہتے ہوئے اوپر آسمان کو دیکھا۔

"ہاں۔ معمولی سا ردو بدل۔" اس نے دو انگلیوں کے بیچ ذرا سی ہوا کو مقید کر کے دکھایا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"پھر اتنا جان لو کہ... نیلوفر کتاب شائع نہیں کرے گی۔" وہ زور دے کر بولی۔
"تمہیں اتنا یقین کیسے ہے؟"
"کیوں کہ اس کتاب کو میں شائع کروں گی!" نیل کنارے کھڑی لڑکی کی مسکراہٹ شریر تھی۔

☆☆☆

اتاترک ایئر پورٹ استنبول پہ اس شام معمول کا رش تھا۔
اناؤنسمنٹ اور مسافروں کا شور آپس میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔
تمام ضروری کارروائیوں سے فارغ ہو کر نیلوفر اپنی ماں کے ہمراہ گردن اکڑائے چلتی ہوئی ایک بنچ کی طرف آ رہی تھی۔ یہ بنچ ایئر پورٹ کے خارجی دروازے کے قریب تھا۔ اس کے سامنے ہی ووڈا فون کاؤنٹر بنا تھا جہاں سے الماس اس وقت نیا سم کارڈ خرید رہی تھی۔
نیلوفر کی ماں اکتائی اکتائی سی بنچ پہ بیٹھی' البتہ نیلوفر نے بالوں کی لٹ انگلی سے ہٹاتے ہوئے پہلے ارد گرد کا جائزہ لیا' چند قریبی افراد کی جانب مسکراہٹ اچھالی' پھر ٹشو سے بنچ کو علامتی سا صاف کیا' اور ٹانگ پہ ٹانگ جما کے بیٹھی۔
الماس شولڈر بیگ کو کھنگالتی ان کے قریب آئی' دھپ سے بنچ پہ گری اور پوری توجہ سے نئی سم فون میں ڈالنے لگی۔
"زینب کے آنے میں کتنی دیر ہے؟" نیلوفر نے گھڑی دیکھی۔
"اس کی ای میل آئی تھی ابھی۔ وہ ایئر پورٹ کے راستے میں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ترکش نمبر لے کر اس کو میسج کر دوں۔ اس نے اپنا فون نمبر دیا ہے۔" سم سیٹ کر کے الماس نے الجھے بال کانوں کے پیچھے اڑسے اور زینب کو کال ملائی۔ چند گھنٹیاں گئیں مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔
اس نے گہری سانس لے کر بنچ سے ٹیک لگائی تو ساتھ ہی زینب کی ای میل موصول ہوئی۔
"میں دس منٹ تک ایئر پورٹ پہنچ جاؤں گی۔ آپ لوگ کہاں ہیں؟"
اپنی ترک میزبان کا پیغام پڑھ کے الماس مسکرا کے جواب لکھنے لگی۔
"ہم ایگزٹ کے قریب ووڈا فون کاؤنٹر کے سامنے بیٹھے آپ کے منتظر ہیں۔"
اس نے ای میل بند کر کے واٹس ایپ کھولا تو ابر دا کٹھے ہوئے۔ بہت سے دوستوں نے ایک لنک شیئر کر رکھا تھا۔
"ممی!" اس نے چونکنے انداز میں اسکرین کو دیکھتے ہوئے ماں کو پکارا۔ "وہ جو تالیہ مراد ہے نا.... اس نے اس روز مندر میں آپ کی گفتگو ریکارڈ کر لی تھی۔ دیکھیں اس نے ویڈیو پبلک کر دی ہے۔"
تالیہ نے اس ویڈیو کو ٹوئٹ کر دیا تھا اور الماس کو برا لگا تھا مگر نیلوفر گردن پیچھے کر کے ہنس دی۔
"ہاں تو اچھا ہے نا۔ وہ مجھے اور مشہور کر رہی ہے۔" پھر الماس کے کندھے پہ جھک کے اس کی اسکرین پہ جھانکا۔ "میرا خیال ہے مجھے ایک باب الگ سے تالیہ اور اس کے باس کے افیئر پہ بھی لکھ دینا چاہیے۔ (انگلیوں سے ہوا میں لکھنے کا اشارہ کیا۔) میرے قلم کی ذرا سی جنبش ان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔"
الماس مسکرا دی۔ "گڈ آئیڈیا۔" اور فون جیب میں ڈال دیا۔ اب ان کو تسلی سے زینب کا انتظار کرنا تھا۔
ایک قلی قریب آیا اور ٹیکسی کے بارے میں معلومات دینے لگا تو الماس نے ہاتھ جھلا دیا۔ "ہماری فرینڈ پک کرنے آ رہی ہے۔" وہ سر ہلا کے چلا گیا۔
لمحے یونہی پھسلتے رہے۔ وہ تینوں اپنے اپنے فون پہ لگی اپنا سوشل میڈیا دیکھ رہی تھیں۔ دفعتاً الماس نے گردن اٹھا کے دیکھا۔ آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا مگر زینب نہیں آئی تھی۔ اس نے فون پہ ای میل کھولی اور پیغام لکھا۔
"زینب.... میم نیلوفر تھکنے لگی ہیں۔ آپ کب

تک پہنچیں گی؟"

فون نیچے کیا ہی تھا کہ وہ تلی دوبارہ قریب منڈلانے لگا۔

"میں نے کہا ہے نا کہ میری فرینڈ ائیر پورٹ کے راستے میں ہے۔ تم ہٹو یہاں سے۔" اس نے سختی سے کہا تو تلی نے دانت نکالے۔

"وہ دوسرے ائیر پورٹ تو نہیں چلی گئی؟"

"وہ ترک ہے۔ اس کو راستے آتے ہوں گے۔ اس کی فکر نہ کرو۔" نیلوفر نے جمائی روکتے ہوئے ہاتھ جھلایا۔ مگر الماس کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی۔

"دوسرا ائیر پورٹ؟"

"جی میڈم۔ استنبول میں دو ائیر پورٹ ہیں۔ صبیحہ گوک چن اور اتاترک۔"

الماس نے ہاتھ سے اسے ہٹنے کا اشارہ کیا اور الجھ کے موبائل دوبارہ کھولا۔ زینب کی کل سے اب تک کی تمام ای میلز کو وہ سرسری سا پڑھنے لگی۔

"اس نے کہا وہ ائیر پورٹ پہنچ جائے گی۔ ائیر پورٹ اس کے گھر سے قریب ہے..... جو ہوٹل اس نے بک کروایا ہے وہ بھی ائیر پورٹ سے قریب ہے....." وہ تعجب سے میلز دیکھ رہی تھی۔ "مگر ممی..... میں نے تو اسے بتایا ہی نہیں کہ ہم نے کس ائیر پورٹ سے آنا ہے۔"

"اوہ۔ وہ دوسرے پہ چلی گئی ہوگی۔ اس کو کال کرو۔" نانی نے اکتا کے کہا مگر الماس سر جھکائے' فون ہاتھوں میں لیے سن سی بیٹھی تھی۔

"موبائل نمبر پہ تو کبھی میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ اسکائپ اور ای میل پہ ہوئی ہے۔" وہ ایک دم پریشانی سے اسکائپ پہ کال کرنے لگی۔ جواب ندارد۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ای میل لکھی۔

"آپ کہاں ہیں' زینب؟ ہم اس وقت اتاترک ائیر پورٹ پہ ہیں۔"

ساتھ ہی اس نے بے چینی سے اس کی ایجنسی کا ویب پیج کھولا۔ وہاں آفس نمبرز درج تھے۔ الماس سفید چہرہ لیے ایک ایک نمبر ڈائل کرنے لگی۔ گھنٹیاں جارہی تھیں لیکن رات کے اس پہر کسی نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔

نیلوفر نے فکرمندی سے پہلو بدلا۔ "الماس۔ پریشان نہ ہو.....وہ آرہی ہوگی۔ اس نے ہمیں شادی تک پہ انوائیٹ کیا ہے۔"

"شادی کا کارڈ کہاں ہے؟ شادی کا وینیو کیا ہے؟" الماس فون کان سے لگائے جواباً تیزی سے بولی تھی۔

گھنٹیاں جارہی تھیں مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

"ریلیکس۔ اس نے.... اس نے ہمارے ساتھ کانٹریکٹ سائن کیا ہے۔ اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو ہم اس کو sue کر سکتے ہیں۔"

"کس پیسے کے ساتھ' ماما؟" وہ دبا دبا سا چیخی اور فون نیچے کیا۔ ایک دم سارا ائیر پورٹ الماس جم کو گھومتا ہوا نظر آرہا تھا۔

"تم یہ کہہ رہی ہو کہ....." نانی کھنکھاری۔ "کہ تم لوگوں نے ایک عورت سے ملے بغیر' اس کا فون نمبر لیے بغیر اس سے کانٹریکٹ کر لیا ہے؟" نانی نے باری باری دونوں کے فق پڑتے چہرے دیکھے۔

"لیکن تم نے ابھی تک اسے کتاب تو نہیں دی نا؟" نانی کی آواز ہلکی ہوئی۔ "یا دے دی ہے؟" اس نے دل پہ ہاتھ رکھا۔ "ڈونٹ ٹیل می تم نے صرف ای میل پہ کسی کو کتاب دے دی ہے؟"

اور الماس کے دل پہ آرا سا چل گیا تھا۔ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ سر چکرا رہا تھا۔

تبھی ای میل ٹون بجی۔ زینب کی میل موصول ہوئی تھی۔

"ڈیئر الماس بخت اور ڈیئر نیلوفر بخت......

سوری! مگر ابھی دوسروں کی عزت اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں میں نہیں دی۔"

وہ بالکل ساکت سی اسکرین کو دیکھ رہی تھی' جب نانی کی لرزتی آواز سنائی دی......

"الماس...... نیلو..... تالیہ مراد کا فیس بک دیکھو....."

الماس میں سکت نہیں تھی مگر نیلوفر نے نانی سے

فون لیا اور اسکرین سامنے کی۔ وہاں تالیہ کا اسٹیٹس جگمگا رہا تھا۔

"میرے پاس نیلوفر بخت کی کتاب سے متعلق دلچسپ معلومات ہیں۔ میں چند منٹ میں فیس بک لائیو کے ذریعے ان کو منظرِ عام پہ لاؤں گی۔ ود لو' تالیہ۔"

ائیرپورٹ پہ ان کے گرد لوگ آ جا رہے تھے۔ اعلانات اسی طرح ہو رہے تھے۔ مگر وہ تین عورتیں سُن سی بیٹھی نانی کے فون کی اسکرین کو دیکھ رہی تھیں۔

دوسروں کی عزت اور ذلت کے فیصلے کرنے والے نیلوفر کے ہاتھ بے بسی سے گود میں دھرے' اپنی دو برس کی محنت کا جنازہ فیس بک لائیو پہ نکلتے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

تالیہ نے ہوٹل روم میں سیلفی اسٹک کے ساتھ کیمرہ یوں سیٹ کر رکھا تھا کہ وہ کرسی پہ بیٹھی نظر آ رہی تھی اور پیچھے کھلی کھڑکی سے کھجور کے درختوں کا جھنڈ نیلگوں شام میں ڈوبا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' بالوں کو چہرے کے دونوں اطراف میں گرائے' مسکرا کے موبائل دیکھ رہی تھی۔ ابھی اس نے ویڈیو کا بٹن آن نہیں کیا تھا۔ لائیو جانے میں چند منٹ تھے۔

"سلام ملائیشیا!" اس نے ساتھ رکھا پیالہ اٹھایا جس میں مالٹے کی پھانکیں بھری تھیں۔ سفید اور سیاہ روایتی باجو کرنگ پہنے' تالیہ مسکرا کے کیمرے میں کہہ رہی تھی۔ "میں ہوں تالیہ مراد۔ لائیو فرام قاہرہ اور میرے پاس ہے اپنے عوام کے لیے ایک بڑی خبر۔"

مالٹے کی پھانک منہ میں ڈالی اور مسکرا کے چباتے ہوئے وقفہ دیا۔ ویڈیو کے ویوز ہر لمحے کے ساتھ بڑھتے جا رہے تھے۔

"میں اسی کروز پہ سفر کر رہی تھی جس پہ نیلوفر بخت سفر کر رہی تھیں اور اس سفر کے دوران ان کی ایک ناراض ٹیم ممبر نے مجھ سے رابطہ کیا اور آپ جانتے ہیں انہوں نے مجھے کیا بھیجا؟" گود میں

مالٹے کی پھانکوں کا پیالہ رکھے' اس نے میز سے پرنٹڈ کاغذات کا دستہ اٹھایا اور اسکرین کے سامنے کیا۔

"نیلوفر کی کتاب کا اصل مسودہ۔ آپ اس کا انتساب اور چیپٹرز کی فہرست دیکھ سکتے ہیں۔" اس نے پہلے صفحات کیمرے میں دکھائے۔ پھر مسودہ نیچے رکھا اور مسکرا کے بات جاری رکھی۔ "میں نے چند گھنٹے ضائع کر کے اس مسودے کو پڑھا ہے اور مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ میرے ملک کی ایک عورت نے اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر ایسی واہیات کتاب لکھی ہے اور خود میرے بارے میں بھی ایک باب تحریر کیا ہے۔ خیر مجھ پہ جو الزامات انہوں نے لگانے تھے لگا دیے مگر داتو سری عبدالرحمن ...."

تالیہ نے افسوس سے سر جھٹکا۔ "میں اس آدمی کو پسند نہیں کرتی۔ میں بالکل بھی ان کے خاندان کی عزت نہیں کرتی مگر وہ آدمی مر چکا ہے' نیلوفر صاحبہ۔ اس کے بارے میں اتنے بڑے بڑے جھوٹ اور الزامات لگاتے ہوئے آپ کو خدا کا خوف نہیں آیا۔ دراصل میں آپ کو بتاتی ہوں کہ انہوں نے داتو سری پہ کیا الزام لگائے ہیں۔ بلکہ...." وہ رکی۔

"میں اپنے عوام کے مفاد میں یہ کتاب مفت میں آپ سے شیئر کرنے کے لیے تیار ہوں مگر کل.... واپس کے ایل جا کے.... اور ہاں.... اگر مجھے راستے میں کچھ ہو گیا تو اس کی ذمہ دار نیلوفر بخت ہوں گی۔ سو... کے ایل والو....! تیار رہو اس بک آف دی سنچری کے بارے میں جاننے کے لیے، جس پہ میری وجہ سے آپ کو دس ڈالرز نہیں خرچ کرنے پڑیں گے؟ کل ملتے ہیں۔ بائے۔" مسکرا کے آگے جھکی اور ویڈیو بند کی۔

اب وہ تسلی سے بیٹھی مالٹے کی پھانکیں منہ میں ڈال رہی تھی۔ ایک' دو' پانچ.... چھٹی پھانک پہ موبائل بجنے لگا۔ وہ جانتی تھی پہلی کال موحد کی آئے گی۔

"تالیہ.... کل آٹھ بجے.... پرائم ٹائم.... تم اور میں انٹرویو کر رہے ہیں۔ پہلا انٹرویو میں تمہارا کروں گا اور میں انکار نہیں سنوں گا۔" وہ اُچھل پھل

سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا۔ تالیہ نے مسکرا کے ساتویں پھانک منہ میں ڈالی۔

''وہ تو میں کروں گی' لیکن تمہیں مجھے میری من پسند قیمت بھی دینی ہو گی۔''

''میں تمہیں بہترین رائلٹی دوں گا۔''

چند منٹ کے بھاؤ تاؤ کے بعد فون بند ہوا تو دوسری کال آنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی۔

''شیور۔ کل دس بجے میں آپ کے شو میں آؤں گی' سلوا' لیکن مجھے جو رقم چاہیے.....''

''کل نہیں' پرسوں شام چھ بجے والا سلوٹ میں آپ کو دے سکتی ہوں' روی' اور جو رقم میں ٹیکسٹ کر رہی ہوں' وہ میرے اکاؤنٹ میں پہنچ جانی چاہیے۔ نہیں' اس سے نیچے ایک رنگٹ نہیں۔''

''میں آپ کے شو میں بک آف دی سنچری کو ڈسکس کرنے جا رہی ہوں۔ اتنے پیسے میرا حق ہیں۔''

درمیان میں دوسرا فون بجنے لگا تو تالیہ نے گہری سانس لی اور اینکر کی کال کاٹی۔ پھر وہ کال اٹھائی جس کا اسے انتظار تھا۔

''یا نگ دی پر حرمت..... کیسی ہیں آپ؟'' وہ چہکی تھی۔

''تالیہ..... تم کیا کر رہی ہو؟'' صوفیہ غصے سے کانپتی آواز میں غرائی تھی۔

''میں؟'' اس نے ایک پھانک منہ میں ڈالی اور چباتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی عزت کی حفاظت کر رہی ہوں۔''

''اس کتاب کو لیک کر کے؟ یا اللہ۔ میں نے تمہیں کتاب روکنے کا کہا تھا۔''

''نہیں۔'' پھانک چباتے ہوئے سر دائیں سے بائیں جھلایا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ نیلوفر کو اس کتاب سے پیسے نہیں بنانے چاہیے ہیں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ تالیہ مراد اس سے پیسے نہیں بنا سکتی۔''

''میں......''

''آپ نے کہا تھا کہ داتو سری بدنام نہ ہوں تو نہیں ہوں گے۔ میں نے کتاب کو ایڈٹ کر دیا ہے۔ خطرناک باتوں کو بدل دیا ہے۔''

صوفیہ ٹھیکی پڑی۔ ''تم نے..... ''ان''..... باتوں کو مٹا دیا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ ہنس دی۔ ''میں نے ان کو بڑھا دیا ہے۔ جہاں اس نے لکھا ہے داتو سری نے دو شادیاں اور بھی کی تھیں وہاں میں نے پانچ شادیاں لکھ دیا ہے۔ جہاں اس نے لکھا کہ وہ دو طرح کے ڈرگز استعمال کرتے تھے' وہاں میں نے ڈرگز کی تعداد آٹھ کر دی ہے۔ دو شادیوں پہ لوگ یقین کر سکتے ہیں۔ پانچ پہ کوئی نہیں کرے گا۔ نیلوفر مذاق بننے جا رہی ہے۔''

''آر یو کریزی؟ ابھی وہ انٹرویو دے گی اور بتائے گی کہ یہ باتیں تم نے تبدیل کی ہیں۔''

''میں بھی چاہتی ہوں کہ وہ بتائے کہ میں نے یہ باتیں تبدیل کی ہیں۔ تیسری بات جو آپ نہیں چاہتی تھیں وہ یہ تھی کہ نیلوفر کسی ملکہ کی طرح چینلو پہ بیٹھی آپ پہ کیچڑ اچھال رہی ہو۔ اب یہ نہیں ہو گا۔ نیلوفر ہر چینل پہ بیٹھی بتا رہی ہو گی کہ صفحہ نمبر چار سو دس پہ فلاں فقرہ درست ہے اور فلاں غلط ہے۔ وہ نہ کتاب کی تصدیق کر سکے گی' نہ تردید۔ وہ صفائیاں دے گی اور کوئی اس پہ یقین نہیں کرے گا۔ اس کی کریڈیبیلٹی ختم ہو جائے گی۔''

پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''ہم دونوں جانتے ہیں کہ نیلوفر کی لکھی بہت سی باتیں سچ ہیں۔ آپ اپنے والد کے اعمال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں صوفیہ۔ آپ صرف نقصان کو کم سے کم کر سکتی ہیں۔ میں وہی کر رہی ہوں۔ ڈیمج کنٹرول۔ میں اس کتاب کو اگلے ایک ہفتے تک میڈیا میں اتنا ڈسکس کرنے جا رہی ہوں کہ ایک ماہ بعد جب نیلوفر اس کو منظرِ عام پہ لائے گی تو کوئی اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہو گا۔ میں ملائیشیا کے لوگوں کو اس ٹاپک سے بور کرنے جا رہی ہوں۔ ڈونٹ ڈسٹرب پلیز!''

ٹھک سے فون رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اپنا سامان پیک کرنا تھا۔

☆☆☆

فجر ابھی طلوع نہیں ہوئی تھی اور اس کے ہوٹل کے پول کے سامنے کھجور کے درختوں پہ لگی بتیاں روشن تھیں۔ ملازم اس کا سامان کار میں رکھوا رہے تھے اور وہ درختوں کے قریب کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ ہیٹ سر پہ جما تھا اور متلاشی نظریں ادھر ادھر لپک رہی تھیں۔ شاید وہ اسے الوداع کہنے ایئر پورٹ پہ آئے اور......

"تم نے میری فیس نہیں ادا کی!"

آواز پہ وہ مسکرا کے پلٹی۔ ایک دفعہ پھر وہ اس کی آہٹ نہیں سن پائی تھی۔

نیلگوں اندھیرے میں درختوں کے بیچ وہ کھڑا تھا۔ پی کیپ سر پہ پہنے' جیبوں میں ہاتھ ڈالے' سویٹر کے آستین کہنیوں تک چڑھائے' وہ اتنی صبح منہ اندھیرے بھی بالکل تازہ دم لگتا تھا۔

"تم نے کہا تھا تمہیں پیسے نہیں چاہئیں۔ ورنہ میں نے تمہارے لیے ایک چیک کاٹ رکھا تھا۔ انی ویز---تشکر ایدرم غالب بے!"

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی۔ وہ کچھ کہنے لگا مگر ویلے تالیہ کا سامان اٹھانے آ رہا تھا۔

"تمہاری ویڈیو کافی مشہور ہوئی ہے۔" وہ آگے بڑھا اور اس کے بیگز باری باری اٹھا کے ویلے کو دینے لگا۔

"ہونی ہی تھی۔ البتہ نیلوفر نے فی الحال چپ سادھ لی ہے۔ وہ شاک میں ہے۔ اس کے کینیڈا اور میرے کے ایل پہنچنے تک ہم دونوں کے انٹرویوز کی میراتھن شروع ہونے والی ہے۔ گیم از آن!"

"اگر وہ تمہیں کتاب چوری کے لیے sue کرے تو؟"

"مگر میں نے کیا کیا ہے؟" اس نے معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔ "میں تو سوشل ایکٹویسٹ ہوں۔ سورس کا نام خفیہ رکھ کے کچھ بھی منظر عام پہ لا سکتی ہوں۔ جیسے سارے رپورٹرز کرتے ہیں۔"

"اور اگر اس نے تم پہ الزام لگایا کہ تم نے اسے زینب بن کے دھوکا دیا ہے تو؟"

"تو اسے لوگوں کے سامنے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس نے ای میل پہ نا صرف کسی کو پورا مسودہ دے دیا بلکہ شادی کا جوڑا بیگ میں لیے ترکی بھی پہنچ گئی۔ مجھے فراڈ ثابت کرنے کے لیے اسے خود کو بے وقوف ثابت کرنا پڑے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ کہے گی...تم نے مسودہ ہیک کروایا ہے۔"

"اور ہیک وہ ثابت نہیں کر سکتی۔ مجھے sue کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ نیلوفر کی سب سے بڑی طاقت وہ کتاب تھی اور وہ میں اس سے لے چکی ہوں۔"

"ویسے تم نے اسے ترکی کیوں بھیجا؟ تم اس کے مصر میں ہوتے ہوئے بھی یہ ویڈیو اپ لوڈ کر سکتی تھیں۔" وہ جیسے یہ سوال کب سے پوچھنا چاہتا تھا۔

"فاتح کے لیے۔ اس نے فاتح کو ان کے بچوں کے سامنے بے عزت کرنے کے لیے بہت ہتک آمیز الفاظ کتاب میں لکھے تھے۔ ایک دوسرے ملک کے ایئر پورٹ پہ اپنی بیٹی کے ساتھ خوف اور بے بسی کا مزہ اسے بھی چکھانا تھا۔ انتقام ویسے بھی جتنا ٹھنڈا ہو اتنا اچھا ہوتا ہے۔ تمہیں لگا میں نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ کر دیا؟"

"اوہ مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے۔ دوسروں کی عزت کو اپنے ہاتھ میں سمجھنے والوں کے ساتھ فائنل شو ڈاؤن کرنا مجھے ویسے ہی بہت پسند ہے۔" وہ کھلے دل سے مسکرایا تھا۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔

"تم نے مجھے تین اہرام والے ہیروں کا قصہ نہیں سنایا۔"

تالیہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"تم جاننا چاہتے تھے ناکہ میں نے وہ کیسے چرائے تھے۔"

ذرا توقف سے بولی۔ "مگر میں نے وہ چرائے ہی نہیں تھے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واردات

کس نے کی تھی۔"
اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ابرو استعجاب میں اٹھے۔ "مگر تم نے کہا تھا....."
"میں نے کہا تھا کہ اس بارے میں آخر میں بتاؤں گی۔ یہ نہیں کہا تھا کہ وہ میرا کام تھا۔ سوری۔" مسکراہٹ دبا کے کندھے پھر سے اچکائے۔
وہ چند لمحے ماتھے پہ بل ڈالے اسے دیکھتا رہا' پھر افسوس سے گہری سانس لی۔
"نو ادفینس! لیکن تم واقعی اتنی بڑی واردات کر بھی نہیں سکتی تھیں۔"
"کیوں نا میں تمہیں ایک اور کہانی سناؤں؟" پلکیں جھپکا کے معصومیت سے کہا۔ "تمہاری کمزوری میں نے ڈھونڈ لی ہے۔"
"اچھا؟" وہ طنز سے مسکرایا اور دونوں ابرو اٹھائے۔
"میں جان گئی ہوں کہ تم اپنی فیملی کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ کیونکہ تم مجھ پہ یا اپنے کسی ورک پارٹنر پہ کبھی بھی بھروسا نہیں کر سکتے۔ کب کون بک جائے' کسی کو نہیں معلوم۔ مگر میں نے سوچا کہ تم اپنی بیوی یا ماں باپ' بہن بھائی... ان سب کو اتنا مخفی کیوں رکھتے ہو؟ اور تب مجھے خیال آیا کہ تمہاری فیملی میں صرف یہی لوگ نہیں ہوں گے... بلکہ-----" وہ اس کے چہرے کو غور سے پڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"بلکہ کوئی ایسا بھی ہے جس کے لیے تم خوفزدہ رہتے ہو۔ اس طرح کے کاموں میں تمہیں سب سے زیادہ خطرہ صرف ایک وجود کے لیے رہتا ہے-----" نیم اندھیر درختوں میں اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تھی۔
"یو ہیو آ چائلڈ!" وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔
"بیٹا---- یا شاید بیٹی.... جو بہت معصوم اور کم عمر ہے.... اور اس کے لیے تم ڈرتے ہو۔ اسی لیے میں جا ہوں بھی تو تمہاری فیملی کا پتا نہیں لگا سکتی۔ ہے نا؟"
وہ بے تاثر چہرے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو تالیہ نے دیکھا' اس نے دانت سے نچلا لب کاٹا تھا۔ جب وہ بولا تو لہجہ سرد تھا۔
"تم فی الحال ان کیکس کی فکر کرو' تالیہ... جو کوئی تمہارے نام سے بھیجتا ہے۔ تمہارے خلاف' کوئی سازش کر رہا ہے اور ایسی سازشوں پہ ملک کے وزیراعظم بھی بچانے نہیں آیا کرتے۔" اس کے سرد اور روکھے انداز پہ وہ مسکرا کے کندھے جھٹکتی' بیگ لیے آگے بڑھی اور جاتے جاتے فقرہ اچھالا۔
"تمہیں کیسے پتا ان سازشوں کے بارے میں؟"
وہ چند قدم آگے بڑھ گئی تھی جب اس نے اندھیرے درختوں کے جھنڈ سے اس کی آواز سنی۔
"کیوں' چ تالیہ؟ تم کتابیں نہیں پڑھتیں کیا؟"
ان الفاظ پہ وہ پتھر کا بت بن گئی۔
قدم وہیں ثبت ہو گئے اور چند لمحے کے لیے دل دھڑکنا بھول گیا۔ پھر وہ تیزی سے گھومی۔
"تمہیں کیسے پتا یہ فقرہ جو----"
الفاظ لبوں پہ رہ گئے۔
درختوں کا جھنڈ ویران تھا۔
وہاں کوئی نہ تھا۔ سایہ تک نہیں۔
کسی خیال کے تحت اس نے اپنے ہینڈ بیگ کے کھلے دہانے میں ہاتھ ڈالا۔ پہلے خانے میں رکھا چیک بھی غائب تھا۔ وہ اپنی فیس اپنے طریقے سے لے چکا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے پیسے نہیں چاہئیں۔ مگر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ

"I lie for a living!"

وہ پول کے کنارے تنہا کھڑی تھی۔
جہان سکندر اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔
ایسے جیسے وہ کبھی اس کی کہانی میں آیا ہی نہ ہو۔
تالیہ نے ایک تھکی ہوئی گہری سانس اندر کھینچی اور آگے بڑھ گئی۔ اس کو ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔

☆☆☆

پردھانہ پترا ملائیشیا کے دارالحکومت پترا جایا کی ایک سبز گنبد والی پرشکوہ سی عمارت ہے جس کے اندر وزیراعظم کا آفس موجود ہے۔ آفس میں بھوری لکڑی کا کام نمایاں نظر آتا ہے۔

وہاں ایک بڑی ٹیبل کے پیچھے صوفیہ رحمٰن ٹیک لگائے براجمان تھی اور اس کی پشت پہ دیوار گیر بک شیلف بنے تھے جو گہری بھوری لکڑی کے تھے۔ اتنے کھلے کھلے سے آفس کو گہرے رنگوں نے تنگ سا بنا رکھا تھا۔

دیوار پہ نصب ٹی وی روشن تھا اور ٹیک لگا کے بیٹھی صوفیہ چینل پہ چینل بدل رہی تھی۔

ایک چینل پہ تالیہ مراد اسٹوڈیو میں بیٹھی نظر آتی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ مصنوعی غصے سے کہہ رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے میں صوفیہ رحمٰن کی مخالف ہوں مگر فوت ہو جانے والوں کا احترام انسانیت کے زمرے میں آتا ہے۔ صفحہ نمبر 312 پہ نیلوفر داتو سری کے بارے میں لکھتی ہیں کہ وہ نفسیاتی مریض بھی تھے اور یہ دوائیں استعمال کرتے تھے۔ مجھے بتائیں ایک آدمی نفسیاتی مریض ہونے کے ساتھ دو دفعہ ملک کا وزیرِاعظم کیسے رہ سکتا ہے؟'' وہ تعجب سے کہہ رہی تھی۔

''احمقانہ الزامات۔ انتہائی احمقانہ۔'' اینکر افسوس سے سر جھٹک رہا تھا۔

صوفیہ نے چینل بدلا۔ نیلوفر ایک دوسرے شو میں بیٹھی تھی۔ کرسی پہ آگے ہو کے دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کے وہ کہہ رہی تھی۔

''دیکھیں... میری کتاب میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ اس کو ہیک کیا گیا ہے۔''

''آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ یہ کتاب جھوٹ ہے جو تالیہ مراد منظرِ عام پہ لائی ہیں؟''

''میں یہ کہہ رہی ہوں کہ......''

''کہ داتو سری ڈرگ ایڈکٹڈ اور نفسیاتی مریض نہیں تھے؟'' اینکر جرح کر رہا تھا۔

''نہیں۔ ہاں۔ وہ تھے۔ مگر میں نے ڈرگز کے نام یہ نہیں لکھے تھے۔ دیکھیں جب اصل کتاب آئے گی تو......''

''اگر یہ سچ نہیں ہے تو آپ تالیہ مراد کو کورٹ لے جائیں یا اس کتاب کو مکمل طور پہ جھوٹا قرار دے دیں۔ آپ خود بھی کنفیوژڈ ہیں نیلوفر صاحبہ۔''

اینکر اس کو برہمی سے ٹوک رہا تھا۔ ''آپ نے کتاب میں فی میل اینکرز کے بارے میں انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کیا آپ کے پاس اس سب کا ثبوت ہے؟''

اور نیلوفر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کتاب میں خواتین اینکرز کے نام تالیہ نے بدل دیے تھے۔ اس سب کو ایسے نہیں ہونا تھا جیسے ہو رہا تھا۔

صوفیہ نے سرخ بٹن دبایا تو ٹی وی اسکرین بجھ گئی۔ وہ سوچتی نظروں سے دیوار کو دیکھنے لگی۔

تبھی سامنے بیٹھا دولت کھنکھارا۔ اس کی ناک پہ ابھی تک بینڈ ایج لگا تھا۔

''یانگ دی پرحرمت۔ تالیہ نے ڈیل پوری نہیں کی۔ اس نے کتاب روکنے کے بجائے شائع کر دی ہے۔''

''ہوں۔''

''اس لیے ہمیں ڈیل پوری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کی سابقہ چوریوں کی بنیاد پہ اس کو گرفتار کر سکتے ہیں۔'' وہ آگے کو ہوا کہہ رہا تھا۔

صوفیہ نے مسکارا لگی آنکھوں کا رخ اس کی طرف موڑا۔ سفید اسکارف کے ہالے میں اس کا چہرہ پُرسوچ نظر آتا تھا۔

''یعنی ہم اس کو عوام کے سامنے چور ثابت کریں۔ تاکہ نیلوفر کا دعویٰ سچ ہو جائے کہ تالیہ نے اس کی کتاب چرائی ہے۔''

''مگر......''

''اور اسے فراڈ ثابت کریں تاکہ وہ میرے باپ کے حق میں جو باتیں کہہ رہی ہے وہ معتبر نہ رہیں۔''

''لیکن وہ ان ساری حساس باتوں کو بڑھا چڑھا کے بیان کر رہی ہے۔''

''مگر کیا لوگ ان بچگانہ الزامات پہ یقین کر رہے ہیں دولت؟'' صوفیہ نے ابرو اٹھائی۔

''نہیں میم۔'' دولت کی آواز ہلکی ہوئی۔ ''لوگ نیلوفر کا مذاق اڑا رہے ہیں اور یقین نہیں کر رہے۔ وہ رسوا ہو کے رہ گئی ہے مگر تالیہ اس سب سے فائدہ اٹھا

رہی ہے۔ وہ انٹرویوز سے پیسے کما رہی ہے۔ وہ... وہ سارے میڈیا پہ چھائی ہوئی ہے۔ وہ ایک اسکامر ہے' میم۔ ہم اس کو یوں آزاد نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم ڈیپارٹمنٹ کے لیے کیا مثال سیٹ کر رہے ہیں؟''

''تمہیں یاد ہے، مجھے سب سے زیادہ ڈر کس بات کا تھا' دولت؟'' کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے صوفیہ نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کیں۔ ''کہ وہ عورت..... میرے باپ پہ کیچڑ اچھالے گی اور مجھے اس کو جواب دینا پڑے گا۔ میں نے آج تک پبلک میں اس کو جواب نہیں دیا۔ مجھے اپنے مقام سے اتر کے اس کی باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا پڑے گا۔ صوفیہ مقابل نیلوفر۔ یہ میرے لیے بھیانک خواب تھا۔'' اس نے آنکھیں کھولیں اور طمانیت سے مسکرائی۔

''مگر مجھے ایک لفظ نہیں کہنا پڑ رہا۔ میری پارٹی کو سوائے افسوس کے اظہار کے زبان نہیں ہلانی پڑی۔ ہمیں تو پتا ہی نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ پچھلے چار دن سے میڈیا پہ صرف تالیہ مقابل نیلوفر چل رہا ہے۔ اسے چلنے دو' دولت۔ یہ میرے حق میں جا رہا ہے۔''

پھر وہ سیدھی ہوئی اور قلم نکال کے ایک کاغذ پہ دستخط کیے۔ پھر وہ کاغذ دولت کی طرف بڑھایا۔

''یہ تالیہ مراد کا کانفیڈینشل سرکاری معافی نامہ ہے۔ وہ اپنے تمام جرائم سے آزاد ہے۔ تمہارا ڈیپارٹمنٹ اس کے خلاف تمام چارجز ڈراپ کر کے اس کو فل امیونٹی دینے کا پابند ہے۔''

''جو آپ کا حکم ہو' میم۔'' دولت نے ناخوشی سے کہتے معافی نامہ اٹھالیا۔ اس کے پاس اب اس کو سرکاری دستاویز میں بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

حالم کا بنگلہ بہت عرصے بعد آباد سا لگتا تھا۔ لاؤنج کے پردے ہٹے ہوئے تھے اور سرما کی دھوپ پوری آزادی سے اندر آ رہی تھی۔ بڑے صوفے پہ کسی شہزادی کی تمکنت سے گھر کی مالکن بیٹھی تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' گہرے نیلے اور سبز رنگ کے باجو کرنگ میں ملبوس' وہ مسکراتے ہوئے سامنے بیٹھے دولت کو دیکھ رہی تھی۔ دولت چند کاغذات اس کی میز پہ رکھ رہا تھا اور تالیہ نے اس امر کو یقینی بنایا تھا کہ وہ اس کی انگلی کی سرخ یاقوت والی انگوٹھی اور کانوں میں پہنے ہیرے بار بار دیکھے۔

''تو اب میں آزاد ہوں؟'' انگلی کان کے ٹاپس پہ پھیرتے ہوئے شہزادی نے پلکیں جھپکا کے پوچھا۔ سامنے بیٹھے دولت نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ وہ بھورے سوٹ میں ملبوس تھا اور آگے کو ہو کے بیٹھا تھا۔ چہرے کے تاثرات میں ضبط کا عنصر نمایاں تھا۔

''جی' بے تالیہ۔ آپ آزاد ہیں۔ گو کہ آپ کا طریقہ کافی غلط تھا مگر پردھان منتری نے آپ پہ رحم کھاتے ہوئے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔''

''ایک بات پوچھوں؟'' معصومیت سے استفسار کیا۔

''جی؟''

''آپ کی ناک کیسی ہے؟'' ہلکا سا مسکرائی۔

''آپ کی مالی حالت کی طرح ہر دن کے ساتھ بہتر ہو رہی ہے۔'' اس نے اطراف پہ طنزیہ نگاہ ڈالی۔

''آپ میری حلال کی کمائی سے رشک محسوس کر رہے ہیں' دولت صاحب؟'' اسی سادگی سے پلکیں جھپکائیں۔

''میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ سب عارضی ہے' بے تالیہ۔'' وہ پہلی دفعہ مسکرایا تھا۔ اس کی زیرک نگاہیں تالیہ کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔

''ایک بات یاد رکھیے گا۔ آپ کا معافی نامہ آج کی تاریخ سے پہلے تک کے تمام جرائم کو کور کرتا ہے۔ آج کے بعد آپ کے ہر عمل پہ میری نظر ہو گی۔ آپ ذرا سا پھسلنا بھی افورڈ نہیں کر سکتیں۔''

''آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں پھسلوں گی؟'' وہ کھڑکی سے آتی سنہری روشنی کے ہالے میں بیٹھی تھی۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور اسے دولت کو دیکھنے کے لیے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنانا پڑ رہا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ۔

وہ مدتوں کے بعد سرِ راہ مل گیا
ایسا لگا کہ جیسے کوئی زخم چھل گیا

اُس کے تو جیسے پاؤں زمیں نے پکڑ لیے
اور میں کسی شجر کی طرح جڑ سے ہل گیا

اس کے بھی لفظ جیسے مقفل سے ہو گئے
میرے بھی لب پہ جیسے کوئی حرف سِل گیا

اس کے بھی دل کے رنگ نگاہوں تک آ گئے
مجھ میں بھی قافلہ سا چلا، تا بہ دل گیا

لمحے کہ جیسے وقت میں گرہیں سی پڑ گئیں
منظر کہ جیسے آنکھ کے پردے پہ سِل گیا

پھولوں نے جیسے جھانک لیا تھا مرا وجود
دل کا ہر ایک رنگ درختوں پہ کھل گیا

دھندلی سی کچھ وداع کی تصویر ہے مسعود
منظر کشی کے وقت کوئی عکس ہل گیا

سعود عثمانی

اُداسی

بھلے ساون برستا ہو
یا پھر ابر گریزاں ہو!
ہوا میں ہو ذرا حدت
یا پھر سردی کی ہو شدت
کوئی رُت ہو کوئی موسم
اُداسی ساتھ ہے ہر دم
دلِ مضطر کے موسم کو
کوئی بھی نام کیونکر دیں
دسمبر کو اُداسی کا سدا
الزام کیوں کر دیں

فاطمہ نجیب